سب رنگ

پہیلی

ہم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ ہماری آنکھیں گواہ ہیں کہ آپ نے تنگ و تاریک کوٹھری میں جہاں روشنی بھی نہ ہوا، آپ اس حبس میں لوٹ پٹانگ کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کتنے پرٹے ڈال کے ہیڈ صاحب اپنے بچوں کے لیے کاپیاں اور پنسلیں خریدتے تھے، وہ ایک مصور جو تیسری گلی کے آخری شکستہ سے مکان میں رہتا ہے، شب و روز کینوس اور رنگوں کو مشقِ ستم بنا تا رہا ہے۔ ہماری گڑیا سی نسرین کی اتنی چھوٹی آنکھوں پر اتنی موٹی اور بڑی عینک ڈاکٹر نے چسپاں کر دی کہ ہم لگالیں تو ہنسی آجاتے۔ ہم نے مولوی تنزیل الرحمان کو میونسپلٹی کے کھمبوں کی روشنی میں کاغذ سیاہ کرتے دیکھا ہے ہمارے گڈو نے عمرانیات میں فرسٹ کلاس پر تمغہ حاصل کیا ہے، ہمارے محلے کا بڑے بالوں والا نوجوان ایسی ایسی کہانیاں لکھتا ہے، ایسے ایسے شعر کہتا ہے کہ سنو تو سینے میں ترازو ہو جائیں۔ ہماری گلی، ہمارے محلے میں ایک سے ایک کمال کا آدمی موجود ہے۔ مستری، مزدور، ڈاکٹر، وکیل، شاعر، ادیب، ہم نے اُن سب کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہے کچھ کو تو گودوں میں کھلایا ہے۔

ہمارے محلے کے لوگوں میں سب کچھ ہے، اچھے برے سبھی قسم کے لوگ رہتے ہیں مگر ہم نے یہاں ایک عجیب تماشا دیکھا۔ جمی دن بھر کرکٹ کھیلتا اور اُدھم مچاتا رہتا تھا مگر گڈو کے بجائے اُس نے کمال کر دیا، دیکھتے دیکھتے یہاں سے وہاں گیا، وہاں سے وہاں گیا، اب کبھی محلے میں آتا ہے تو لوگ اُس کے گرد گھیرا ڈال دیتے ہیں۔ اُسے بات کرنے کی مہلت نہیں ملتی۔ سنا ہے، ڈیفینس میں ایک بڑی کوٹھی بنوا رہا ہے، گڈو کی طرح یہی حال نسرین کا بھی ہوا۔ وہ نک چڑھی پرائمری تک میں ملازمت حاصل نہیں کر سکی اور سلمیٰ کو دیکھا ند کے کہاں سے کہاں جا پہنچی، ہمارا آرٹسٹ باجوا ایک اشتہاری کمپنی میں دواؤں کے اشتہار بنانے لگا، اور آپ نے ..... آپ نے بھی کیا کیا؟ گُھس ہو کے رہ گئے، شادی کرلی، بچے پیدا کیے اور القط۔

بہت ذہن پہ زور ڈالا کہ یہ کیا ماجرا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارے سامنے چمکتے ہوئے لوگوں کی چمک کیوں ماند پڑ گئی؟ جو پہلے مقابلے کی دوڑ میں اول آتے رہے، وہ آخر میں کیوں پیچھے رہ گئے؟ انھوں نے اپنے تماشائیوں کو کیوں مایوس کیا؟ صرف چند ہی شاذ و نادر، ہماری توقع پر پورے اُترے۔

محلے میں نسیم صاحب سے زیادہ باوقار سوجھ بوجھ کا آدمی کوئی نہیں ہے۔ وہ ایک بہت بڑے بنگلے میں بھی رہتے ہیں۔ افسر وزیر بھی اُن سے ملنے آتے ہیں، سب اُن کا ادب کرتے ہیں، ہم نے اُن سے پوچھا، نسیم صاحب! یہ اُلجھن درپیش ہے۔ تبسم فرمایا، تھوڑی دیر خاموش رہے، ہم نے سوچا کہ شاید ہم نے کوئی بہت بچکانہ سی بات کہہ دی ہے۔ بولے: "عزیزِ من! کچھ دن ہمارے ساتھ رہو سب سمجھ میں آجائے گا۔ ہم نے اُن کی بات مان لی۔

پھر ہم نے وہاں بیٹھنا بند کر دیا۔ وہ تو بڑی معمولی بات تھی مگر اس معمولی بات سے ہماری طرح ہمارے محلے کے بہت سے لوگ ناواقف تھے۔

آپ بتا سکتے ہیں وہ کیا رمز تھی؟ پہلے ناک نیچی کیجیے اور نگاہ جھکائیے — ہماری طرف مسکرا کے دیکھیے۔ اب جواب دیجیے؟



سب رنگ

مُدیر ــــ شکیل عادل زادہ

اِدارۂ تحریر:

حسن ہاشمی ــــ شاہد اسماعیل لون

نائب مُدیر ــــ انور شعور

اِشتہارات

صابر حسین ــــ یوسف میمن

طباعت ــــ معروف مفتی

اِشاعت ــــ محمد یوسف

قانونی مُشیر ــــ مبارک حسین صدیقی ایڈووکیٹ

پبلشر اینڈ پرنٹر: شکیل عادل زادہ نے حسین نجم ریکے اہتمام میں پاکستان ہیرالڈ پریس سے چھپوا کر ۵ سی ۱۱/۱ ناظم آباد سے شائع کیا۔ پتہ: ۲۷-۲۸ پریس چیمبرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ ذیلی دفتر: لطیف ہاؤس کرشن پورہ پشاور

شمارہ ۲ جلد ۷ فی پرچہ ۳ روپے زرِ سالانہ ۴۰ روپے فون نمبر ۲۱۱۹۴۴-۲۱۱۹۶۱ تار کا پتہ: سب رنگ سرورق: ایلیٹ پبلشرز کراچی رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

یقیناً آپ سوچ رہے ہوں گے کہ دیکھیں یہ داستاں طراز اس بار کیا گُل افشانیاں کرتا ہے۔ پچھلے مہینے کہتا تھا کہ سب رنگ کو ۲۵، ۲۶ روزہ ہی سمجھ لیجیے۔ وہ ۲۵، ۲۶ روز بھی گزر گئے۔ اب کون سا عذر تراشے گا؟ غالباً ذکر ہی سے صرفِ نظر کرے گا۔ بے شک میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی تھی کہ اس بار یہ صفحہ ہی سادہ چھوڑ دیا جائے، کچھ نہ کہا جائے کیونکہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے مگر پھر سوچا، چند سطور ندامت کی لکھ دینے میں کیا حرج ہے ورنہ خامشی کو نہ جانے کیا کیا معنی پہنائے جائیں، میری آنکھوں اور میرے کانوں پر بے شمار خطوط، بے حساب فون اور ان گنت دو بدو شکایتوں کا بوجھ ہے، خاموشی اس کا ازالہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کچھ غبار نکل ہی جائے۔

اور خاموشی کیوں؟ پشیمانی کیوں؟ سوچتا ہوں، کیا مجھے واقعی آپ کے سامنے شرمندہ ہونا چاہیے؟ مگر شرمندگی سے ان گزرے ہوئے دنوں کے اُدھار کا مداوا نہیں ہو جائے گا، اور کیا شرمندگی اس لیے کہ مجھ سے اپنے وقت کے اسراف کی لغزش ہوگئی ہے؟ میں نے کچھ وقت کے لیے متانت اور سنجیدگی میں غفلت برتی ہے؟ میں نے ایسا نہیں کیا، ندامت کا اظہار تو آپ کے سامنے انوار صدیقی کو کرنا چاہیے جو بہت مدت بعد ایک رات مجھے ایک فلم دکھانے لے گئے، عذر تو صابر صاحب کریں کہ انھوں نے جوش میں آکے ایک صبح اپنے گھر میں دیگ چڑھادی، یا خان آصف کریں جو مہینے میں دو بار آکے مجھ سے چند ساعتیں چھین کے لے گئے یا قاسم محمود کریں جو ایک رات میرے گھر دیر تک بیٹھے رہے یا پیارے صاحب مرحوم رسا چغتائی کریں جنھوں نے اُس رات اپنے زندہ و تابندہ شعر سُنانے شروع کر دیے تھے، عذر کرے تو وہ میری چھوٹی اُنگلی کرے جو آخری دن زخمی ہو کے رونے لگی۔ ان کے بعد جو وقت بچا، وہ میں نے اسی عشق پیشگی میں صرف کیا، میں نے تو کچھ اور نہیں کیا۔

میری خطا کیا ہے؟ میری خطا سب رنگ ہے کہ مجھ بے سروساماں نے اس طرح دار سے عشق کا ڈھونگ رچایا ہے۔ اس کی زلفیں ہیں کہ دراز ہوئی جاتی ہیں، اس کے رُخسار ہیں کہ روز ان کی آگ تیز ہوئی جاتی ہے، اس کا بدن ہے کہ روز اپنی ناز کی بڑھا لیتا ہے۔ میں کیا کروں، مجھے تو بہرحال رسم نباہنی ہے، چاہے جان جائے، چاہے جہان جائے۔

آپ کو بتاؤں کہ اس ہفت رنگ سب رنگ کی جلوہ نمائی کے کتنے لوگ منتظر رہتے ہیں، اس کے کتنے آشنا ہیں، تادمِ تحریر اس کی اشاعت ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے (لعنت اللہ علی الکاذبین) ڈیڑھ لاکھ کا یہ جریدہ اوسطاً دس اشخاص فی رسالہ کے حساب سے پندرہ لاکھ افراد پڑھتے ہیں۔ کتنے بہت سے لوگ میرا انتظار کرتے ہیں، میری فکر کرتے ہیں، مجھے پسند کرتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ تاخیر کی ندامت اتنی بڑی بات نہیں جتنی بڑی ذلت تہی دست ہونے میں ہوگی، بھیک مانگنے میں ہوگی، محض وقت پر آنا جانا دوستی کی دلیل نہیں، مجھے اصرار ہے کہ اس کی کسوٹی کچھ اور ہے۔

اور میری ایک یہی بساط ہے کہ میں خطائیں کرنے والوں سے مختلف نہیں ہوں، میری خطا میرا اختلاج ہے جو دیر سے قابو میں آتا ہے۔ مجھ سے کوئی کہے کہ مانگو کیا مانگتے ہو؟ میں نہ سمن بر کو مانگوں، نہ یاسمن کو طلب کروں، میں کہوں گا کہ اے بخشش کرنے والے، بس ایک قلم دے دے، جادو کا قلم، ایک تاثیر والا قلم دے دے جو چشمے کی طرح بہتا ہو، جو حسین چہرے تراشے اور انھیں حسین لفظوں کے گیت سُنایا کرے، ایک معجز نما قلم دے دے۔ بس اور کوئی خواہش نہیں۔ ایک یہی قرار دے دے۔

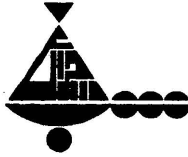
اس مرتبہ طے کیا تھا کہ اس شہرِ نامراد سے دُور ہو جائیں گے، کسی اور جگہ جاکے رنگوں کا یہ کھیل کھیلیں گے۔ شعورا اور میں پہلے لاہور پہنچے، وہاں سے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ لاہور بھی اب کے کراچی جیسا دغا باز نکلا۔ اب سوچا ہے، وہاں جائیں گے جہاں عمارتیں آسمان چھونے کی ضد نہ کرتی ہوں اور جہاں لوگ سڑکوں پر ریس کے گھوڑوں کی طرح نہ دوڑتے ہوں۔ جہاں شام ہوتی ہو تو شام ہوتی ہو، جہاں صبح ہوتی ہو تو صبح ہوتی ہو۔ اب کے ہم وہاں جاکے ڈیرا جمائیں گے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے ؏ واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں۔

لاہور میں ماڈل بک اسٹال پر ناصر زیدی نے شوخی کی، اُس نے ہماری موجودگی میں اسٹال کے صاحبِ موجود سے پوچھا، بھلا سب رنگ کا کیا حال ہے؟ اُس نے بے نیازی سے جواب دیا، ٹھیک ہے، پوچھا "تاخیر سے اثر تو خاصا پڑا ہوگا؟" اُسے کہا بڑھ گیا، اثر پڑتا تو تاخیر نہ ہوتی۔ میں وہاں سے دُور ہٹ گیا۔ بہت دیر تک سرگرانی رہی گویا تاخیر اس آسودگی کے سبب سے ہے کہ جو پیش کیا جائے گا، وہ قبول کیا جائے گا۔ نہیں، نہیں، یہ کبھی نہیں سوچا۔ اس طرح کی سوچ ہوتی تو اتنا آزار نہ ہوتا۔ پھر صرف سب رنگ نہیں ہوتا۔ یہ تاخیر تو اپنی بے قراری کے سبب سے ہے۔

ایک دوست نے لکھا ہے کہ مجھے اس اُمید میں اپنے گاؤں سے دس میل دُور قریبی بک اسٹال جانا پڑتا ہے کہ شاید سب رنگ مل جائے، روز جاتا ہوں اور واپس آجاتا ہوں، جانِ عزیز! انتظار کرو، میری خاطر انتظار کرلو، مجھے تمھاری اذیت کا احساس ہے لیکن وہ اذیت اس سے سوا ہوگی جب میری آنکھیں بدلی ہوئی ہوں گی۔ کچھ وقت کے لیے سمجھوتا کرلو۔ سب درست ہو جائے گا۔

تمام انکسار، تمام عجز کے ساتھ سب رنگ کا موجودہ شمارہ پیش ہے۔ سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ یہ میرے لفظوں کی کمر ہے، یہ میرا سر ہے، میرا اُٹھا ہوا سر۔ میری پیشانی کو بوسہ دو۔

شکیل عادل زادہ عفی عنہٗ



آلوز شعوز

قافلہ فرانس کے ساحل پر اترا تو اُسے وہیں روک لیا گیا۔ سرحدی حکام مسافروں کی جانچ پڑتال کے لیے آگے بڑھے۔ یہ قافلہ انگلستان سے آیا تھا۔ اس میں سوداگروں کی تعداد زیادہ تھی، انھیں ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے تجارتی سامان سمیت مشرقی سمت کی چوکی میں جائیں اور وہاں سے راہ داری کا پروانہ حاصل کریں۔ چند مُسافر ایسے تھے جن کے پاس معمولی کپڑوں اور بستروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ صرف ملازمت کی تلاش میں انگلستان سے فرانس آئے تھے۔ انھیں ایک قطار میں ضروری اندراجات کے کارکنوں کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اب صرف دو مسافر اور تھے۔ ایک شکیل و وجیہہ مرد اور ایک حسین و جمیل نوجوان لڑکی۔ وہ اپنا چھریرا، متناسب بدن، نیلے رنگ کی ایک ڈھیلی ڈھالی ریشمی عبا میں چھپائے ہوئے تھی۔ عبا کے نیلے رنگ نے اُس کے رخساروں کی گلابی رنگت اور زیادہ پُرکشش بنا دی تھی۔ وہ مرد سے چند قدم پیچھے پلکیں جھکائے کھڑی تھی ــــ مرد سر سے پاؤں تک راہبوں والا لباس پہنے ہوئے تھا اس لیے پورے قافلے میں سب سے منفرد نظر آ رہا تھا۔ راہب کے ساتھ ایک خوب صورت دوشیزہ کو دیکھ کے سرحدی حکام کے چہروں پر حیرت ہویدا ہوئی مگر انھوں نے کچھ کہے بغیر ادب سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ دوسرے مسافروں سے جو سوالات کیے گئے تھے، وہ اُس سے نہیں کیے گئے۔ ایک افسر نے آگے بڑھ کے اپنا سر قدرے جھکایا اور کہا "معزز راہب! آئیے، فرانس کی سرزمین آپ کو خوش آمدید کہتی ہے۔"

راہب کے ہونٹوں پر ایک ممنون مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ باوقار انداز میں افسر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ لڑکی کے قدموں نے بھی جھجکتے جھجکتے اُس کی تقلید کی۔ ایک افسر کے سوا دوسرے افسر وہیں رہ گئے تھے۔ راستے میں مسلح محافظوں نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ تعظیماً سر جھکا دیے۔ چند لمحوں بعد وہ تینوں شہر کی ایک کشادہ سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ سڑک کے دو رویہ دُور تک سجی سجائی دُکانوں کا ایک بازار پھیلا ہوا تھا۔ خوانچہ فروشوں، ٹھیلے والوں

اِس کہانی کے تاریخی پس منظر میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

تاریخ کے گم شدہ اوراق — نیاز فتح پوری
نیا اور پرانا عہد نامہ — کتابِ مقدس
انسائیکلو پیڈیا — برٹینکا
ہسٹری آف دی چرچ — ہوز فلپ

اور خریداروں نے بازار کی رونق دوچند کردی تھی۔ قریب سے گزرنے والے راہ گیر راہب کو جھک کے سلام کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ بعض لوگ قریب آ کے عقیدت سے اُس کا ہاتھ چومتے اور اُس کے پیچھے کھڑے ہوئے مجسّمے پر حیرت کی ایک نظر ڈال کے رہ جاتے۔ اُن کی حیرتوں پر راہب کا چہرہ کسی ردِّ عمل سے عاری رہا۔ دائیں طرف کرائے کی مختلف سواریاں مسافروں کی منتظر تھیں لیکن سرحدی افسر کے اشارے پر اُن کے بجائے دو گھوڑوں کی ایک مرصّع بگھی قریب آ کے رُکی۔ افسر نے راہب سے کہا۔ ”آئیے تشریف لے چلیے۔ یہ بگھی ہمیں راہبوں کے شاہی مہمان خانے پہنچا دے گی۔“

راہب کے چہرے پر کش مکش سی پیدا ہو گئی۔ اُس نے کچھ تذبذب سے کہا۔ ”اگر مجھے راہبوں کے ساتھ قیام کرنا ہوتا تو میں اُنھی کے کسی قافلے میں سفر کرتا۔ سرِدست آپ مجھے اور میری عزیزہ کو کسی سرائے میں پہنچوا دیجیے۔ پھر شہنشاہ شارلمین سے میری مُلاقات ہو گی تو میں کوئی الگ قیام گاہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

افسر کی نظر معاً لڑکی کی طرف گئی مگر دُوسرے ہی لمحے اُس نے خفت سے گردن موڑ کے کوچوان کو کسی سرائے کا نام بتایا اور راہب کو یہ پیش کش کی کہ وہ بھی ساتھ چلے گا تاکہ سرائے میں اُن کے قیام و طعام کا سرکاری طور پر بندوبست کرا دے لیکن راہب نے اُس کا شکریہ ادا کیا کہ اُسے اس وقت زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر بعد میں اُس کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ ضرور اُس کا تعاون حاصل کرے گا۔ راہب نے افسر سے پُرجوش مصافحہ کر کے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور پہلے اپنی ساتھی کو کمر سے تھام کے بگھی میں بٹھایا پھر خود بیٹھ گیا۔

انھیں شہر کی سب سے اچھی سرائے میں دو بستروں والا ایک کشادہ کمرہ مل گیا۔ کمرے میں دروازے کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی اور سڑک کی طرف کھلنے والا دریچہ بند تھا۔ دریچے پر ایک گہرا سبز پردہ پڑا ہوا تھا۔ تیزی سے پھیلتی ہوئی



سرمئی شام بھی اُن کی تنہائی میں مخل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ کمرے کے چاروں کونوں میں ہلکی ہلکی روشنیوں کے فانوس پہرا دے رہے تھے۔ راہب کا ماتھا دھاری دار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ پشت پر ہاتھ باندھے ہوئے آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اُس کی ساتھی ایک آرام دہ کرسی میں دھنسی ہوئی تھی لیکن اُس کی پتلیاں بے قراری سے راہب کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی تھیں۔ راہب ٹہلتے ٹہلتے یکایک رُک گیا۔ چند لمحوں تک وہ اپنی ساتھی کا چہرہ تکتا رہا پھر بولا۔ "دیکھو اب تم اپنے گھر، اپنے وطن سے بہت دور آچکی ہو۔ یہاں نہ تمھارے ماں باپ ہیں، نہ بہن بھائی، نہ دوسرے اعزا۔ اب تمھیں کس کا خوف ہے؟ اب ہم ایک بالکل نئی چھت کی پناہ میں ہیں اور پھر تمھاری سب سے بڑی پناہ تو میں ہوں۔"

"اِس سے مجھے کب انکار ہے۔" لڑکی نے آہستگی سے کہا۔ "میں یقیناً تمھاری پناہ میں ہوں مگر یہ سوچو تم خود کس کی پناہ میں ہو۔ مانا کہ مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا لیکن تمھیں تو سب جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ جان جائیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے اصرار کے باوجود رہبانیت کا لبادہ نہیں بدلا۔ اگر تم یہ لبادہ اتار دیتے تو ہمیں وطن ہی چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم عام لباس میں، عام آدمیوں کی طرح وہیں کسی شہر میں منہ چھپا سکتے تھے۔ چہرہ چھپانا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا لباس چھپانا مشکل ہوتا ہے۔" اُس نے لجاجت سے کہا۔ "میری مانو تو میں اب بھی یہی کہوں گی کہ میری خاطر راہبوں والا لباس اپنے جسم سے نوچ پھینکو۔ یہ لباس تو تمھیں چھپانے کے بجائے برہنہ کر دیتا ہے۔"

"درست ہے۔" راہب نے کہا۔ "لیکن اس لباس میں جو عزت ہے، جو دولت ہے، وہ کسی اور لباس میں نہیں ہے۔ نیز اب اِس لباس کا میں بے حد عادی ہو چکا ہوں۔ اب میں اس راستے پر اتنی دور نکل آیا ہوں کہ لوٹ نہیں سکتا۔ اب یہ میرا لباس نہیں رہا، میری کھال ہو گیا ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ کیا کھال کے بغیر آدمی زندہ رہ سکتا ہے؟ اور جو خود زندہ نہ رہ سکے کیا وہ دوسرے کو زندہ رکھ سکتا ہے؟" اُس نے ایک گہری سانس لی۔ "تم اپنا سب کچھ ٹھکرا کے میرے ساتھ آگئی ہو۔ اب میرا فرض ہے کہ میں تمھیں زندہ رکھوں، خوش رکھوں، اور یہ فرض میں صرف اسی لباس میں انجام دے سکتا ہوں۔ میں نے پوری زندگی اسی لباس میں گزاری ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا لباس پہنوں گا تو یقین کرو، وہ میرے جسم میں چبھے گا، اُس میں کوئی جیب نہیں ہوگی اور جیب کے بغیر زندگی کی کسی آسائش کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔"

"میری آسائش اپنی جیب سے مشروط نہ سمجھو۔" لڑکی نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "میری آسائش صرف تم ہو۔"

"یہ کہہ کے تم مجھے اور زیادہ ذمّے داری کا احساس دلا رہی ہو۔" راہب زیرِ لب مسکرایا۔

"مگر مجھے دنیا سے چھپانا بھی تو تمھاری ذمّے داری ہے جس لباس کو تم اپنی کھال سمجھ رہے ہو، اُس میں تم خود نہیں چھپ سکتے، مجھے کیا چھپاؤ گے۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھوں سے زمین میں گاڑ دو۔ تمھارے ہاتھوں مجھے یہ اعزاز بھی قبول ہے لیکن تم سے بچھڑنا ہرگز قبول نہیں ہے۔ میں اگر تم سے بچھڑ گئی تو میری زندگی میرے لیے محض ایک تہمت ہوگی۔ یہ زندگی تو صرف تمھارے نام پر سانس لیتی ہے۔" وہ کچھ رُک کے بولی۔ "کبھی کبھی مجھے بڑا ڈر لگتا ہے کہ تمھاری یہ کھال میرے اور تمھارے درمیان دیوار نہ بن جائے۔" اُس نے دونوں ہتھیلیوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

راہب گھٹنوں کے بل اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ اُس نے لڑکی کے نرم ہاتھ اُس کے چہرے سے الگ کر کے اپنے ہاتھوں میں بھر لیے۔ "سُنو، یہ اپنا وطن نہیں ہے، فرانس ہے۔ یہاں کوئی بھی ہمارے تعلّق سے واقف نہیں ہو سکتا اسی لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہاں ہمیں وہی سمجھا جائے جو ہم ہیں۔ تم میری پیرو بھی ہو سکتی ہو، بہن بھی ہو سکتی ہو اور۔۔۔۔۔"

لڑکی نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ "مگر یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہوگا۔"

راہب نے زور سے اُس کے ہاتھ کھینچ کے پھر اپنے ہاتھوں میں بھر لیے۔ "اب مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے ہمیں ایک دوسرے کا سب کچھ ہونا چاہیے۔ اگر غور کرو تو اب تم سے میرا ہر رشتہ ہے اور بظاہر کوئی بھی رشتہ نہیں ہے۔ رشتے دراصل مختلف پردوں اور دیواروں کے نام ہیں۔ میرے تمھارے درمیان کوئی پردہ، کوئی دیوار نہیں ہے۔" اُس نے دیوانگی سے لڑکی کے ہاتھ چوم لیے اور چند ثانیوں تک لڑکی کی منجمد آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اب تمھارے سوا مجھے سب کچھ جھوٹ معلوم ہوتا ہے۔" کچھ توقف کر کے اُس نے کہا۔ "رہبانیت بھی ایک جھوٹ ہے۔ افسوس کہ اس جھوٹ کا انکشاف مجھ پر اُس وقت ہوا جب تم مجھے ملیں۔ تم سے مل کے مجھے زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میں راہب کے علاوہ ایک آدمی بھی ہوں اور ایک آدمی کی حیثیت سے مجھے اپنے کسی عمل پر ندامت نہیں ہے۔ ایک بات اور یاد رکھو، یہاں کے باشندے اپنے بادشاہ شارلمین کی طرح بے حد مذہب پرست ہیں۔ یہ لوگ راہبوں پر عموماً کوئی شک نہیں کرتے۔ یہاں راہبوں کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ آسمانی حکم سمجھا جاتا ہے۔"

لڑکی ساکت پلکوں کے ساتھ چند لمحوں تک گُنگ رہی پھر نظریں جھکا کے بولی۔ "فرض کرو۔" اُس کی آواز لہرانے لگی۔ "فرض کرو، اگر وقتی طور پر ہم خود کو بہن بھائی باور کرا بھی دیں تو آخر چند مہینے بعد کیا ہوگا؟ جس خطرے نے ہمیں وطن چھوڑنے پر مجبور کیا ہے، وہ تو یہاں بھی پیش آئے گا۔"

راہب نے اُس کے شانوں پہ بازو پھیلا کے اُسے اپنی آغوش کے کلیسا میں قید کر لیا۔ "ایک راہب یقیناً کسی کا باپ نہیں ہو سکتا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اُس کی پیرو یا بہن بھی کسی کی ماں نہ ہو۔" دونوں کے پھڑپھڑاتے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے کا جزو بن گئے۔

دوسری صبح راہب نے اپنی محبوبہ کی پیشانی پر رخصتی ٹیکا ثبت کیا اور پورے راہبانہ لباس میں کمرے سے برآمد ہوا۔ سرائے کے خدام نے اُسے احترام سے بیرونی دروازے تک پہنچایا۔ وہاں ایک بگھی اُسے شاہی محل لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی کیونکہ سرائے والوں کو وہ اپنی آمد سے مطلع کر چکا تھا۔ تیز رفتار بگھی نے اُسے بہت جلد ایک وسیع و عریض، بلند و بالا اور پرشکوہ عمارت تک پہنچا دیا۔ عمارت کے ارد گرد باوردی محافظوں کے کئی دستے اسلحہ سجائے گشت کر رہے تھے۔ وہ ایک مؤدب محافظ کی معیت میں راہداریاں، صحن، باغات اور گل پوش روشیں طے کرتا ہوا ایک بڑے ایوان میں پہنچا۔ وہاں شہنشاہ شارلمین کے خصوصی معتمد نے دوسرے منتظر امرا اور سرداروں کو نظر انداز کر کے تپاک سے اُس کا خیر مقدم کیا۔

راہب نے بہت کم وقت میں شہنشاہ کے دربار تک رسائی حاصل کر لی۔ دربار میں شاہی تخت کی پشت پر تنو مند سیاہ فام غلام ننگی تلواریں تانے صف بستہ تھے۔ تخت کے دائیں بائیں دو حسین و جمیل کنیزیں زرق برق لباسوں میں کھڑی تھیں، وہ بادشاہ کو مور چھل جھل رہی تھیں۔ تخت سے ذرا ہٹ کے وزرا اور مصاحبین کی قطاریں دو رویہ کھڑی تھیں۔ بادشاہ نے تخت سے اُٹھ کے اُس کا استقبال کیا اور اُسے دائیں جانب تخت کے قریب رکھی ہوئی ایک زرنگار کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "مقدس راہب! خوش آمدید۔ ہمیں اُمید ہے کہ بیرونی راہبوں میں ایک اور مہمان کا اضافہ فرانس کی سرزمین کے لیے نیک فال ثابت ہوگا۔"

"شہنشاہِ معظم!" راہب سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا۔ "آپ اس سرزمین پر خدائے برتر کے نائب ہیں۔ میں دست بہ دعا ہوں کہ آپ کا اقبال مزید بلند ہو۔ آپ کا شہرہ اور دبدبہ فرانس کے علاوہ انگلستان پر بھی محیط ہے۔ اسی امر نے میرے دل میں انگلستان سے فرانس آنے کا شوق پیدا کیا اور خدا کے فضل سے مجھے حاضری کا موقع مل گیا۔ آپ نے خدا اور اُس کے فرزند کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے بے مثال جدوجہد کا آغاز کیا ہے۔ میں یہ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی جدوجہد میں شمولیت میرے لیے افتخار کا باعث ہوگی۔"

"بسر و چشم۔" شارلمین کے حکیمانہ لہجے میں عقیدت شامل ہو گئی۔ "شاہی چرچ کے زینے آپ کی قدم بوسی کریں گے۔"

"یقیناً۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز ہوگا۔" راہب نے سینے پر لٹکتی ہوئی صلیب کو بوسہ دیا۔ "لیکن والاجناب! شاہی چرچ میں مبلغوں کی کمی نہیں ہے لہٰذا یہ نووارد مسافر فرماں روائے فرانس سے عرض کرے گا کہ اسے کسی ایک مقام پر نصب نہ کیا جائے بلکہ کھلے آسمان کے نیچے گلی گلی اور گھر گھر پہنچنے کی خدمت سے نوازا جائے۔ مسافر کے لیے جمود نہیں، حرکت عین راحت ہے۔"

"ہمیں اتفاق ہے۔" شارلمین نے متبسم ہو کے کہا۔ "ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے مبلغین کا گشتی گروہ آپ کی رفاقت پر فخر محسوس کرے گا۔"

"شہنشاہِ عالی!" راہب نے سر جھکایا۔ "اس عاجز کو تعمیل سے انکار نہیں ہے لیکن میں اپنے تجربے کی بنا پر یہ عرض کروں گا کہ کسی مخصوص گروہ کی نسبت ایک ایسا آزاد اور تنہا آدمی رعایا میں زیادہ سرایت کر سکتا ہے جسے سرکاری کارندہ نہ سمجھا جائے۔ جو شخص اوپر سے مسلط کیا جاتا ہے، رعایا اُس سے مرعوب تو ہو سکتی ہے، متاثر نہیں ہو سکتی اور تبلیغ مرعوب کرنے کا نہیں، متاثر کرنے کا نام ہے۔"

شارلمین نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ کسی تحریک یا دعوت پر فرانس نہیں آئے ہیں بلکہ یہ زحمت آپ نے ذوق و شوق سے اپنے طور پر کی ہے۔ لہٰذا ہماری نگاہ میں آپ کی ذات اُن حضرات سے زیادہ افضل ہے جنھیں پیغامات بھیج کر یہاں بلوایا گیا ہے۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہماری جانب سے آپ آزاد ہیں۔ فرانس کا چپا چپا آپ اپنی جولاں گاہ تصور کیجیے اور جہاں جہاں ممکن ہو خدائے بزرگ کا نام قائم کیجیے۔ خدائے بزرگ نے اس سلطنت کو جو کچھ بخشا ہے اُس میں سے آپ کا حصہ آپ کی نذر ہوتا رہے گا۔"



وہ علاقہ کھپریل کی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے خوش نما مکانات پر مشتمل تھا۔ راہب کی محبوبہ نئے مکان میں منتقل ہو کے بہت خوش ہوئی، جیسے کسی زنداں سے چھوٹ کے برسوں بعد اپنے گھر آ گئی ہو۔ اُس کی سرشاری دیکھ کے راہب بھی بہت سرشار ہوتا اور اُس کی گردن میں بازو حمائل کر کے کہتا۔ "بے شک تم جنت سے چرایا ہوا کوئی پھول ہو۔" اس پھول کی خوش بو اُس کی سانسوں کا جزو بنتی تو راہب کی ساری تھکن دور ہو جاتی مگر یہ بات صرف چند روز رہی، پھر اُس کی راتیں بہت بے چین گزرنے لگیں۔ وہ اکثر لیٹے لیٹے چونک کے اُٹھ بیٹھتا اور اپنے پاس سوئی ہوئی حسین محبوبہ پر ایک اُداس نظر ڈالتا۔ اُس کی سانسوں کے ترنم میں راہب کو وہی خطرہ ہچکولے کھاتا نظر آتا، جس سے محفوظ رہنے کے لیے انھوں نے وطن چھوڑا تھا۔ وہ مسہری سے اُتر کے کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ اس لاینحل بے قراری سے بچنے کے لیے وہ علی الصباح گھر سے نکل جاتا اور شام کے جھٹ پٹے تک کوچے کوچے گھومتا ہوا خود کو تبلیغ و تلقین میں فراموش رکھنے کی کوشش کرتا لیکن اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کے لفظ کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ وعظ کے دوران میں سامعین کے تحسینی کلمات اور ستائشی نعرے بلند ہوتے تو اُس کی آواز نحیف ہو جاتی اور گردن جھک جاتی۔ اب وہ شام کو بہت ٹوٹا ہوا گھر پہنچتا اور اپنے کندھوں کا بوجھ اپنی محبوبہ کے زانو پہ ڈھیر کر دیتا۔ اُس کی محبوبہ اُسے اپنے ہاتھوں سے سرخ شراب کا ایک جرعہ پلاتی جیسے ایک ماں اپنے بیمار بچے کو دوا پلاتی ہے پھر کہتی "آؤ میں تمھیں اپنی پناہ میں لے لوں۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کی پناہ میں رہتے پھر بھی بے امانی محسوس کرتے۔ ایک روز راہب کی محبوبہ نیم جاں آواز میں اُس سے بولی۔ "یہاں مکانات تو فاصلے فاصلے پر بنے ہوئے ہیں مگر یہ فاصلے صرف نظر کا فریب ہیں اور محض مکانوں کے فاصلے ہیں، مکینوں کے نہیں۔ میری احتیاط کے باوجود

محلّے کی عورتیں یہاں آمد و رفت کرنے لگی ہیں۔ اُن کے آنے سے وقت ضرور کٹ جاتا ہے لیکن ۔"اُس کے رخسار دہکنے لگے۔" حالانکہ میں کتنے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتی ہوں، پھر بھی وہ مجھے آنے والے مہمان کی مبارک باد دیتی ہیں اور بار بار ہنس ہنس کے مجھ سے اُس کے باپ کا نام پوچھتی ہیں۔" راہب کی زبان گنگ تھی۔ عورت نے کچھ توقف کر کے کہا "نام تو بہت سے ہو سکتے ہیں، وکٹر، آئزک، نکسن، جیمس۔ کوئی بھی نام مگر یہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"

راہب کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے چند لمحوں تک وہ ایک بُت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر یکایک اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اُس نے جھنجلا کے سوچا کہ اُس کی صرف ایک بھرپور ضرب اُس کے گناہ کا داغ مٹا سکتی ہے مگر داغ مٹانے سے کہیں جرم مٹتا ہے؟ وہ دیوانگی کے عالم میں بڑبڑانے لگا "خداوندا! میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ ایک گناہ کے بعد دوسرا بڑا گناہ؟ خدایا! مجھے ہمت دے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے خود پر قابو پا کے آسمان کی طرف دیکھا اور گڑگڑا کے کہا "مجھے معاف کر دے مالک! مقدس ماں کے طفیل معاف کر دے۔ میں تیرا گناہ گار ہوں، تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہوں۔"

راہب شام کو گھر پہنچتا تو عموماً اندھیرا ہوتا تھا مگر قریبی مکانات کی بعض عورتیں اُس وقت بھی آ جاتی تھیں۔ اُن میں سے بعض اُس کی محبوبہ کی طرف رشک سے دیکھتیں اور کہتیں "مقدس راہب! ہمارے لیے بھی دعا کیجیے۔" یہ جملہ راہب کے سینے میں کانچ کی کرچی کی طرح چبھتا مگر وہ متانت کے ساتھ اُنگلی سے ہوا میں صلیب کا نشان بناتا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا دیتا۔ بعد میں اُسے اپنے آپ سے بہت شرم آتی۔ وہ آئینہ دیکھتا تو آئینے میں اُسے اپنے بجائے کوئی دوسرا آدمی نظر آتا، ایک بے لباس آدمی۔ اُس نے آئینہ ہی توڑ دیا۔

ایک رات وہ اور اُس کی رفیق آتش دان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت کی نظریں لپکتے ہوئے شعلوں پر تھیں مگر ذہن کہیں اور تھا۔ راہب کی مضطرب نظریں اُس کے تمتماتے ہوئے رخسار تک رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد عورت نے راہب کی طرف دیکھے بغیر اُداسی سے کہا "یہ مکان ہمیں راس نہیں آیا۔" راہب نے دل گرفتہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔ عورت خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی تھی "یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا کہ یہاں کے لوگ راہبوں پر شک نہیں کرتے۔ میں کہتی ہوں، راہب تو راہب، لوگ خدا پر بھی شک کرنے سے نہیں چوکتے۔ آج ایلزا آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ محلّے کی عورتیں میرے متعلق چہ میگوئیاں کرتی ہیں، عجیب عجیب باتیں بناتی ہیں جیسے میرے بطن میں آدمی کا بچہ نہ ہو سنپولیا ہو۔" آگے سسکنے کی آواز اُس کی ہچکیوں میں دب گئی۔ راہب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دیر تک گُم سُم بیٹھا رہا۔ پھر اُسے اپنے شانے پر ایک نرم ہاتھ محسوس ہوا۔ عورت رُندھی ہوئی آواز میں اُس سے پوچھ رہی تھی "کیا تم پر ندامت کا غلبہ ہونے لگا ہے؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔" راہب نے اُسے اپنے سامنے کھینچ لیا۔ "لیکن تمھیں دیکھتا ہوں تو ساری ندامت دُور ہو جاتی ہے۔"

عورت محبّت سے بولی۔ "بہتر ہے، اب ہمیں کوئی اور ٹھکانا تلاش کر لینا چاہیے۔"

انھوں نے اُسی رات وہ مکان چھوڑ دیا۔ پھر اُن کے قدم ایک جگہ نہ ٹک سکے۔ وہ ایک محلّے سے دوسرے محلّے میں اور ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوتے رہے۔ انسانوں کی لمبی لمبی لپکتی ہوئی زبانوں نے اُنھیں کہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ راہ چلتے لوگ مڑ مڑ کے راہب کی محبوبہ کا چہرہ دیکھتے تھے۔ اُن کی نظریں راہب کو زہر بُجھی تھیں مگر وہ اُنھیں تصور وار نہیں سمجھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا، یہ کون عورت ہے، یہ وہ عورت تھی جس کی بے پناہ دلکشی اور خوب صورتی نے اُس جیسے فولادی شخص کے قدموں میں لغزش پیدا کر دی تھی۔

تنگ آ کے ایک دن انھوں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا اور بے سروسامانی کے عالم میں شہروں شہروں بھٹکنے لگے۔ وقت قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ ایک چھت کی ضرورت شدّت سے بڑھتی جا رہی تھی لیکن چھت تھی کہاں، وہ کہاں رُکتے؟ آسمان کے نیچے؟ لہٰذا آبلہ پائی کے باوجود وہ چلتے رہے۔ آخر چلتے چلتے ایک ایسا مقام آ گیا جہاں سے آگے بڑھنا اُن کے لیے ممکن نہیں رہا۔ مجبوراً وہ ٹھیر گئے اور اسی غیر معروف مقام پر اُن کے دو نفری قافلے میں ایک ننھے مسافر کا اضافہ ہو گیا۔

ماں کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔ وہ دربہ دری کی دھول جھٹک کے اُس میں مگن ہو گئی۔ بچّی کا نام اُس نے جون رکھا۔ وہ فرانس کے ایک دور دراز گاؤں میں مقیم تھے۔ یہاں گاؤں والوں کی سادگی میں چند روز بہت سکون سے گزرے مگر جلد ہی ماں کی حسّاس نگاہ نے یہ محسوس کر لیا کہ جو عورتیں اُس کی بچّی کو لپک لپک کے گود میں لیتی تھیں اور گھنٹوں اُسے کھلاتی تھیں، وہ اب اُس سے کترانے لگی ہیں۔ اس صورتِ حال نے اُسے ایک بار پھر شدّت سے احساس دلایا کہ زمین کتنی تنگ ہے۔ وہ بستر سے لگ گئی اور چند روز علیل رہ کے اُس نے اپنی جگہ اپنی بچّی کے لیے خالی کر دی۔ راہب نے اُس کی لاش پر کھڑے ہو کے عبا سے آنسو خشک کیے اور روتی ہوئی بچّی کو آغوش میں بھر لیا "جون! میری جان! کاش تیرا نصیب تیری ماں کی طرح نہ ہو۔"

❖

اُجالا طلوع ہو رہا تھا۔ پرندوں کی نغمہ سرائی سے ننھی جون کی آنکھ کھل گئی۔ راہب کا چہرہ سامنے تھا۔ وہ ہُمکنے لگی۔ راہب نے اُسے سینے کے پالنے میں لٹا لیا اور اُنگلی سے شہد چٹایا۔ پھر اُس کے غلافی ریشمیں بالوں کو بوسہ دینے لگا۔ اس کے بعد اُس نے ننھی جون کو احتیاط سے اپنے زانوؤں پر دراز کیا اور کتابِ مقدس کی رحل کے سامنے مؤدبانہ بیٹھ گیا۔ اُس

نے جھک کے اپنی آنکھیں رحل سے مَس کیں اور جون کے کانوں میں خوش الحانی سے تلاوت کرنے لگا۔

"اگر کوئی اس طرح خطا کرے کہ وہ گواہ ہو اور اُسے قسم دی جائے کہ آیا اُس نے کچھ دیکھا ہے یا اُسے کچھ معلوم ہے اور وہ نہ بتائے تو خطا کا گناہ اُس کے سر لگے گا ○ اگر کوئی شخص کوئی ناپاک چیز چھولے، خواہ وہ ناپاک جانور ہو یا ناپاک چوپایہ ہو یا ناپاک رینگنے والے جاندار کی لاش ہو تو چاہے اُسے معلوم نہ ہو کہ وہ ناپاک ہو گیا ہے، تب بھی وہ مجرم ٹھہرے گا ○ یا اگر وہ انسان کی اُن نجاستوں میں سے کوئی نجاست چھولے جن سے وہ نجس ہوتا ہے اور اُسے معلوم نہ ہو تو وہ اُس وقت مجرم ٹھہرے گا جب اُسے معلوم ہو جائے گا ○ اور جب وہ اِن باتوں میں سے کسی میں مجرم ہو تو جس امر میں اُس سے خطا ہوئی ہے، وہ اُس کا اقرار کرے اور خداوند کے حضور اپنے جرم کی قربانی لائے ○"

پڑھتے پڑھتے راہب کے رخسار بھیگ گئے۔ اُسے روتے ہوئے دیکھ کے جون بھی بلکنے لگی۔ راہب نے اُسے تھپکتے ہوئے تلاوت جاری رکھی:۔

"جو خطا اُس سے ہوئی ہے، اُس کی پاداش میں ریوڑ سے ایک مادہ یعنی ایک بھیڑ یا ایک بکری خطا کی قربانی میں گزرانے اور اگر بھیڑ دینے کا مقدور نہ ہو تو خطا کی قربانی میں دو قمریاں یا کبوتر کے دو بچے خداوند کے حضور گزرانے۔ ایک خطا کی قربانی کے لیے اور دوسرا سوختنی قربانی کے لیے ○"

جون اور زیادہ بلکنے لگی۔ راہب نے کتاب بند کر کے بہت مشکل سے اُسے چپ کرایا۔ پھر سجدہ ریز ہو گیا اور گڑگڑانے لگا۔ "خداوندا! رحم۔ خداوندا! رحم۔" اُس کی زبان پر ایک ہی ورد تھا۔

راہب نے پہلے ایک بھیڑ کی قربانی دی۔ پھر کبوتر کے دو بچے بھی قربان کر دیے اور آخر میں اپنی بیٹی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔ "اے زمینوں اور آسمانوں کے مالک! میں اسے بھی تیری بے ہمتا ذات پر قربان کرتا ہوں۔ آج سے یہ تیری نذر ہے مقدس مسیح کی قسم! اب اس کی ہر سانس تیرے نام سے لبریز ہوگی۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ تیرے پیغام کی جلوہ کشائی کے لیے وقف ہوگا۔"

●

راہب کے ایک پہلو میں جون، دوسرے پہلو میں انجیل تھی۔ وہ گاؤں گاؤں گھوم کے جون کی پرورش اور انجیل کی ترویج کرنے لگا۔ جون اُس کی گود میں پورے فرانس کا سفر کرتی رہی اور مختلف مقامات پر مختلف عورتیں اپنے دودھ سے جون کا پودا سینچتی رہیں۔ راہب زیادہ دن تک کہیں نہیں رُکتا تھا۔ ایک منزل کے بعد دوسری منزل، دوسری کے بعد تیسری۔ جب بھی عورتیں جون سے مانوس ہونے لگتیں، راہب پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ وہ جون کو آغوش میں سمیٹ کے آگے بڑھ جاتا۔ اسی طرح بھٹکتے بھٹکتے وہ ایک روز فرانس کے شہر می امینس جا کے ٹھیرا۔ می امینس کی زمین نے اُس کے ہرجائی پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ شہر کے لوگوں نے عزت و احترام سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُس کے لیے لمبے لمبے دسترخوان چُنے گئے لیکن راہب تو جون کو دیکھ کے جیتا تھا۔ غذا سے اُسے ویسے بھی کم رغبت تھی۔ عقیدت مندوں کے اصرار پر وہ چند لقمے حلق سے اتار لیتا تھا۔ جون ایک سُرخ و سفید بچّی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک سحر تھا۔ وہ سحر لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا تھا۔ وہ ہر جگہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی مگر جب لوگ اُسے گود میں لے کے گدگداتے تو راہب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ وہ منہ پھیر لیتا کہ کوئی اُس کا چہرہ نہ دیکھ لے۔

ایک روز می امینس کی ایک بوڑھی عورت دُعا کرانے کے لیے راہب کو اپنے گھر لے گئی۔ عورت کا شوہر مر چکا تھا اور اُس کی جوان بیٹی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ ماں کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اُس کی بیٹی ضرور واپس آئے گی۔ وہ اس کے انتظار میں خود کو زندہ رکھنے کے لیے بستی کے مختلف گھروں میں کام کاج کرتی تھی۔ راہب نے اُس کی بپتا سُن کے ہمدردی اور تاسّف کا اظہار کیا اور کہا۔ "بے خبر عورت! آقا کی نظر میں سب یکساں ہیں۔ وہ تیری طرف بھی دیکھ رہا ہے اور میری طرف بھی۔ وہ بیک وقت زمینوں پر بھی ہے اور آسمانوں پر بھی۔ اُس کا جلوہ شش جہات میں ہے۔ پس تو اُسی پر توکّل کر۔ وہ تیرے لیے جو فیصلہ کرے گا، بہتر کرے گا اور یہ دیکھ، تیری بیٹی واپس آگئی ہے۔ لے اسے تو لے لے۔"

اُس نے جون کو عورت کے پھیلے ہوئے دامن میں ڈال دیا اور بولا۔ "جاننا چاہیے کہ خدا کی جو مخلوق شعور و تمیز سے بے بہرہ ہے اور جس کے سر پر صرف بدنصیبی کا پنجہ ہے، کسی کا ہاتھ نہیں ہے، وہ ہر اُس شخص کے لیے آسمانی باپ کی امانت ہے جو اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ سکے اور اُس کی سانسوں کی آبیاری کر سکے۔"

عورت کی آنکھوں پر حیرت کا سکوت چھا گیا۔ اُس نے بے اختیار جون کی پیشانی چوم لی اور اُسے اپنے سینے میں محصور کر لیا۔ پھر جب اُس کی حالت کسی قدر اعتدال پر آئی تو اُس نے راہب سے پوچھا۔ "یہ گڑیا کس کی بچی ہے اور آپ اس کے کون ہیں؟"

راہب اس سوال کے لیے آمادہ تھا۔ اُس نے چند لمحے توقف کیا پھر کہا۔ "کیا تیرے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ کس کی بیٹی ہے؟"

"نہیں۔" عورت نے جھجک کے کہا۔

"سُن، یہ ایک گناہ گار کی بیٹی ہے، ایک مجرم کی بیٹی ہے، اس کے باپ کو مُردہ سمجھ کیونکہ وہ اس سے دست بردار ہو گیا ہے۔ اُس کی

ماں مر چکی ہے، وہ مر گئی اور اپنی یہ امانت میرے سپرد کر گئی۔" عورت کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں آیا لیکن راہب کی بات اُس نے کسی چون وچرا کے بغیر تسلیم کر لی۔ راہب نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے "یہ خداوندا! اُس بے سہارا بچی کو زندگی دے اور اس غم زدہ عورت کو حوصلہ عطا کر۔" یہ کہہ کے راہب کلیسا چلا گیا مگر سرِشام لوٹ آیا۔

اُس نے عورت سے درخواست کی کہ وہ اُسے اپنے مکان کا کوئی مختصر حصّہ دے دے کیونکہ وہ ننھی جون کو ابتدا ہی سے آسمانی تعلیم سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ عورت کے لیے اِس سے زیادہ مسرّت کی بات کیا ہو سکتی تھی۔ اُس نے اپنے گھر کا سب سے اچھا کمرہ راہب کے لیے مخصوص کر دیا۔ راہب کو بڑھیا کی چھت ملی تو اُس نے سفر کی دھول جھٹک کے سکون کی سانس لی۔ پھر تمام اطراف سے منہ موڑ کے جون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ جون کی ابتدا تھی۔ کم سنی کے باوجود جب راہب اُس سے کچھ کہتا تو وہ نہایت متانت اور تن دہی سے اُس کی بات سنتی۔ پھر جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو راہب نے اس کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا۔ جون نے پڑھنے لکھنے میں غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا۔ اُس کی یہ اثر پذیری دیکھ کے راہب اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا۔

اُس نے دن رات ایک کر دیے اور صرف چند برسوں میں اپنی عمر بھر کی بینائی جون کی آنکھوں میں منتقل کر دی۔ ماضی کے بارے میں راہب نے جون سے یہ کہا تھا کہ وہ اس کے ایک عزیز دوست کی نشانی ہے اور اُس کا باپ انگلستان سے فرانس آیا تھا۔

ایک روز جون نے اُسے عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ اُس نے اشتیاق سے پوچھا "پاپا! میرے باپ کیسے تھے؟"

راہب کی پیشانی سُکڑ گئی "میری طرف دیکھو" اُس نے بے قراری سے کہا "وہ ہو بہو میری مثال تھا۔ ہماری قامتیں ایک، شباہتیں ایک اور عادتیں ایک تھیں۔ یہ سمجھ لو کہ وہ میرا ہم زاد تھا۔"

"اور پاپا! میری ماں کیسی تھیں؟"

"وہ ہو بہو تیری مثال تھی۔ تجھے اُس کی یاد آیا کرے تو آئینہ دیکھ لیا کر۔ مقدّس مریم کی قسم، اُس کا چہرہ نورانی تھا اور دل محبّت کے جذبات سے معمور تھا۔ اُسے خدا نے جیسے اپنے ہاتھوں سے تراشا تھا۔ وہ جہاں جاتی، تمام عورتوں میں ممتاز رہتی۔ جون! میری بچی! تُو بھی تو سب سے الگ نظر آئے گی۔ بتا حُسنِ صورت اور حسنِ سیرت میں سب سے ممتاز رہنے کی کوشش کرے گی؟ کرے گی نا؟"

"ہاں پاپا!" جون نے عزم سے وعدہ کیا۔ اُس نے اپنے وعدے پر پورا عمل کیا اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے مشاغل میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ حرفوں اور کاغذوں کے ساتھ دوستی کر لی۔ پھر اُس پر ایک ایسا دَور بھی آیا کہ اُسے دنیا کا ہوش نہیں رہا۔ وہ لباس بدلنے، کھانا کھانے اور آرام کرنے سے بے نیاز سی ہو گئی۔ اُس کا انہماک دیکھ کے راہب کی آنکھوں کی آگ ٹھنڈی پڑنے لگی اور اُس کے ماتھے کا افق دمکنے لگا۔

مگر ساتھ ہی راہب کی کمر جھکنے لگی اور اُس کے سر پہ برف جمنے لگی۔

اب وہ اپنا بیشتر وقت خلوت میں بسر کرتا اور اکثر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ منجمد پتلیوں سے کوئی دیوار گھورنے لگتا "جون کی ماں! دیکھ میں نے تجھے اب تک عزیز رکھا ہے۔ میرے پاس جو کچھ تھا، وہ میں نے تیری بچی کے حوالے کر دیا ہے۔ اب وہ میرے علم اور تیرے حسن سے پوری طرح آراستہ ہے۔ اُسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تُو نے مجھے آدھے راستے میں نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ اب تک میرے ساتھ چل رہی ہے، ایک بدلی ہوئی جون، جیسا کہ اُسے ہونا چاہیے تھا۔ شاید تلافی ہو گئی ہے مگر میری رفیق! اب بہت تھکن ہونے لگی ہے۔ اب مجھے اپنے قرض سے سبک دوش کر۔ اب جون زمین پر خود بڑے اعتماد سے کھڑی ہو سکتی ہے، اُسے میرے ستون اور میرے سائے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب مجھے اپنے ہی پاس بلا لے۔ بہتر ہو گا کہ اب میں کلیسا پہنچ کے پادری کے سامنے اپنے ماضی کا اعتراف کر لوں، میں جاتا ہوں۔"

رات کا وقت تھا۔ بارہ سالہ جون اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ شدید سردی کے باعث دریچے تمام بند تھے، صرف دروازہ کھلا ہوا تھا کیونکہ راہب ابھی گھر نہیں لوٹا تھا۔ جون کے سامنے مختلف نادر مخطوطات بکھرے ہوئے تھے مگر آج وہ خلافِ معمول اُن سے بے مروّتی برت رہی تھی۔ اُس کے قدم بار بار دروازے کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ اُسے بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔ راہب تھکے تھکے انداز میں رات گئے واپس آیا۔ جون دوڑ کے اُس کے گلے میں جھول گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے اُس سے علیحدہ ہونا پڑا کیوں کہ راہب کا جسم پھُنک رہا تھا۔ جون نے عجلت سے اُسے بستر پہ لٹایا اور گھر میں جتنی گرم چیزیں موجود تھیں، سب اُس پہ ڈال دیں۔ پھر اُس نے دوسرے کمرے میں جا کے بوڑھی عورت کو جگایا۔ اُسے وہ بوڑھی ماں کہتی تھی۔

بوڑھی ماں گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ اُس نے جون کے ساتھ جا کے راہب کا ماتھا چھُوا اور فوراً کسی طبیب کی تلاش میں روانہ ہو گئی۔ راہب کی آنکھیں بند تھیں۔ جون تشویش و اضطراب کے ساتھ اُس کی پٹی سے ٹک کے بیٹھ گئی۔ راہب کے خشک ہونٹ بدبدا رہے تھے۔ جون نے کان قریب کر کے اُس کے الفاظ سننے کی کوشش کی۔ راہب کہہ رہا تھا "میں اپنی تمام آلائشوں اور کثافتوں کے ساتھ خود کو اُس کے حوالے کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا اور جس نے مجھے رزق بہم پہنچایا اور جس کے قبضے میں میری جان ہے۔"

جون کی آہ و زاری اور چیخ پکار کا راہب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ طبیب پہنچتا، اُس کے ہر مرض کا علاج ہو چکا تھا۔ جون کے گرم آنسو ٹپ ٹپ اُس کے ساکت رخساروں پہ گرنے لگے۔



چند روز بعد سوگوار جون کلیسا کے ایک پادری کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ پادری کے چہرے سے مسرت و حیرت ہویدا تھی۔ اُس نے جون کو خندہ پیشانی سے کلیسا کے ستونوں میں قبول کیا اور شفیق لہجے میں کہا: "تمہارا انداز ہی خداوند سے تمہاری ارادت، شوق اور تپاک کا مظہر ہے۔ تمہارے مرحوم آتالیق کی روح خدا کی بارگاہ میں ضرور سُرخ رو ہوگی۔ مقدس مریم تمہیں اپنی پناہ میں رکھے۔ میں تمہارے لیے دعا گو ہوں اور تمہیں اجتماعات سے خطاب کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ تمہارا کلام، خداوند کا کلام ہوگا۔ وہ گم راہوں کی بینائی آسودہ کرے گا مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ گمراہوں کے درمیان شیطان موجود رہتا ہے، اُن میں تمہارا قیام ہمیشہ شیطان کی قربت کا سبب ہوگا۔ وہ ہر موقع پر تمہارے راستے میں شگاف ڈالے گا، تم اپنی آنکھیں اور کان بند کرلینا اور دیکھ لینا کہ تمہاری بے اعتنائی ہی اُس کی پشیمانی کا سبب بن جائے گی۔"

جون کے لیے یہ باتیں نئی نہیں تھیں، اُس کے باپ نے بھی اُسے بارہا اِس قسم کی ہدایتیں دی تھیں تاہم اُس نے پادری کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اُسے یقین دلایا کہ اُس کی زندگی کا مقصد کبھی متزلزل نہیں ہوگا۔ وہ مقدس مریم کی بارگاہ میں ایک ادنا کنیز کا درجہ حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھے گی۔

ہفتے کے روز می ہینس کے کوچوں اور بازاروں میں یہ خبر عام تھی کہ کل صبح ایک نوجوان راہبہ شہر کے بڑے کلیسا میں اُن سے خطاب کرنے والی ہے۔ جون کے خطاب سے پہلے ہی اُس کے تذکرے لوگوں تک پہنچ گئے تھے کہ اُس کی عمر بہت کم ہے مگر علم بڑا ہے۔ وہ اطالوی، جرمن اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتی ہے۔ اُس کے کلام میں تاثیر اور پیام میں سحر ہے۔

جلسے کے روز تیرہ سالہ جون اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ سبک خرامی سے جلسہ گاہ میں حاضر ہوئی۔ اجتماع میں یہاں سے وہاں تک بھِن بھناہٹ ہونے لگی۔ لوگوں نے کبھی اتنا کم عمر راہب کلیسا کے چبوترے پر نہیں دیکھا تھا۔ نوجوانوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں اور بوڑھے آنکھوں آنکھوں میں مسکرائے۔ جون نے یہ سب کچھ دیکھا مگر پُرسکون رہی۔ اُس کی سرپرست بوڑھی عورت کے حواس منتشر تھے۔ وہ بار بار انگلی سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہی تھی، اُس کے برعکس جون بے حد اعتماد اور وقار سے ہجوم کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے مجمع کی طرف ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ سامعین کی صفوں میں ایک اضطراب پیدا ہوا۔ جون آنکھیں بند کیے ہوئے چند لمحوں تک خاموش کھڑی رہی پھر اُس نے اپنے یاقوتی لب وا کیے۔ اُس کے ہونٹوں میں لرزش ہوئی۔ ایک تڑپتی اور مچلتی ہوئی آواز اُبھری: "سُننے والو!" اُس نے کہا: "میں اُس کلام کے ساتھ تمہارے سامنے حاضر ہوں جو کبھی پُرانا نہیں ہوتا اور جو کلام زمانے کی ہواؤں سے بوسیدہ نہیں ہوتا، وہی اصل کلام ہے۔" جون کی زبان سے ابھی چند ہی کلمے ادا ہوئے تھے کہ مجمع پر سناٹا طاری ہوگیا۔ سامعین کھسک کے آگے آنے لگے۔ جون نے خطاب جاری رکھا: "لوگو! تم نے کبھی غور کیا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے اور وہ جو آسمانوں میں فروکش ہے، کائنات کی تخلیق میں اُس کی کون سی رمز پنہاں ہے؟ تم نے کبھی سوچا کہ وہ اگر تمھیں پیدا نہ کرتا تو کیا ہوتا؟ میں آج اپنے اوّلین خطاب میں تم سے حیات، کائنات اور ذات کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ کیا تمہاری سماعت میری جانب نگراں ہے اور کیا تمہاری بصارت میری آواز دیکھ رہی ہے؟ تم میرے سامنے آئے ہو اور تمھیں کچھ سُننے کا اشتیاق ہے تو تمام کثافتیں کھُرچ کے پھینک دو۔ اس کے بعد ہی میرا کلام تم تک رسا ہوسکے گا۔ کیا میں چُپ ہو جاؤں؟"

جون چپ ہوگئی۔ خطابت کا یہ انداز بالکل نیا تھا۔ ہجوم میں کھلبلی سی مچ گئی۔ جب تک سُننے والے دوبارہ پُرسکون نہیں ہوگئے، جون چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر اُس کی زبان سے آبشار جاری ہوا، ایک آبشار جس کے میٹھے اور ٹھنڈے پانی نے سب کو بھگو دیا۔ بوڑھوں کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں۔ نوجوانوں نے گردنیں جھکا لیں اور عورتیں سسکیاں بھرنے لگیں۔

جون نے زیادہ طویل تقریر نہیں کی۔ اُس کا ہر لفظ ترشا ہوا، متوازن اور لسعزیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب وہ چبوترے سے اُتری تو بوڑھوں نے اُس کی سلامتی کی دعائیں مانگیں اور اُسے ایک جلوس کی شکل میں جلسہ گاہ سے رخصت کیا گیا۔

سب کا خیال تھا کہ شہر می ہینس میں جنّت سے کوئی حور اُتر آئی ہے۔ شہر میں جنگل کی آگ کی طرح جون کی فصاحت اور اُس کے حسن کی آگ پھیل گئی۔ گھر پہنچ کے بوڑھی ماں نے جون کو سینے سے لگا لیا اور اشک فشاں آنکھوں سے اُسے دیکھا: "مقدس راہب مجھ سے سچ کہتا تھا کہ خداوند نے تیری بیٹی کے بدلے ایک بیٹی بھیج دی ہے مگر سُن۔ آئندہ جلسے میں جانے سے پہلے پورے چہرے پر نقاب اوڑھ لینا، صرف آنکھیں کھلی رکھنا، باقی کچھ نہیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ میری بیٹی پھر نہ مجھ سے چھین جائے۔" جون کو ہنسی آگئی۔

پہلے خطاب کے بعد لوگ انتظار کرنے لگے کہ اب کلیسا کی طرف سے دوبارہ اعلان ہو اور وہ جون کی مترنم اور تابندہ آواز میں آسمانی کلام پھر سُنیں۔ اُن کی یہ خواہش جلد ہی پوری ہوگئی۔ جون کے دوسرے اجتماع میں سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ پھر ان جلسوں کی ایک روایت پڑ گئی۔ جس دن جون کو خطاب کرنا ہوتا، نوجوان مقررہ وقت سے پہلے پہنچتے اور آگے کی صفوں میں بیٹھ جاتے، اس قسم کے اجتماعات میں نوجوانوں کی اتنی کثیر تعداد پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ جیسے جیسے جون کی مقبولیت بڑھتی گئی، اُس کی آواز کے وقار اور اعتماد میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ اپنی ذمّے داری بھی زیادہ محسوس کرنے لگی۔ اُس نے مطالعے اور فکر و استغراق کے سِوا دُنیا کا ہر کام چھوڑ دیا۔ جس موضوع پر اُسے تقریر کرنی ہوتی، اُس کے متعلق وہ دلیلیں اور نکتے ڈھونڈتی رہتی۔ اُس نے اپنے علم میں وسعت کا ہر ذریعہ اختیار کیا۔ وہ فرانس کے گوشے گوشے سے کتابیں اور مخطوطات منگواتی اور اُن میں کھو جاتی۔ اِس کے علاوہ شہر کے ممتاز عالموں سے تبادلۂ خیال کرنا بھی اُس کا معمول تھا۔

اُس کے ارادت مندوں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہی۔ جب وہ ایک ہفتے کی خلوت کے بعد اجتماع میں نمودار ہوتی تو شہرِ می امینس کے کوچہ و بازار خالی ہو جاتے۔ وہ خطابت کے بعد فوراً اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ نوجوانوں کی خواہش تھی کہ انھیں رسمی خطابت کے علاوہ بھی اُس کی باتیں سننے کا موقع ملے لیکن جون اپنے خطاب کے بعد گویا اُن سے بالکل بیگانہ ہو جاتی تھی اور پھر کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کلیسا کی شہزادی کو اپنی جانب متوجہ کر سکے۔ ہر نگاہ ملتجی ہی رہتی تھی کیونکہ جون اُن نگاہوں سے بے نیاز تھی۔ اس کا دریچہ تماشا گاہ بنا رہا، تماشائی کی نگاہ نہ بن سکا۔ وہ اپنی سحر انگیز شخصیت کا سحر پھونکتی رہی اور می امینس کے نوجوان ایک دوسرے کو حسرت و یاس سے دیکھتے رہے۔ جس مکان میں جون رہتی تھی، اُس کے اِردگرد شہر کے نوجوان اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے منڈلاتے رہتے مگر جون گھر کے کسی نیم تاریک گوشے میں سب سے بے خبر علم کے سمندر سے موتی چنتی رہتی اور اپنی دولت بڑھاتی رہتی۔ وہ ہر ہفتے یہ دولت سامعین کے اجتماع پر نچھاور کر دیتی تھی مگر لوگ اُس کی دولت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ اُن کی تشنگی بڑھ جاتی اور نیا ہفتہ آتا تو وہ خشک لبوں اور خشک آنکھوں کے ساتھ پھر اُس کے سامنے بھکاریوں کی طرح گردن جھکا کے کھڑے ہو جاتے۔



جون اپنی کوٹھری میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ کوٹھری اُس کی مطالعہ گاہ بھی تھی، فکر گاہ بھی۔ یہاں بوڑھی ماں کے سوا کوئی شخص اجازت کے بغیر اندر نہیں آ سکتا تھا۔ بوڑھی ماں اچانک کوٹھری میں داخل ہوئی۔ جون کی محویت ٹوٹ گئی۔ اُس نے سر اُٹھا کے نرم نگاہی سے اُسے دیکھا۔ بوڑھی ماں کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

"جون! میری بیٹی! ذرا دیر کے لیے میری طرف توجہ کرو۔ میں تمھارے لیے ایک پُرلطف خبر لائی ہوں۔"

"وہ بشاشت سے بولی۔ جون نے کتاب بند کر دی۔ بوڑھی ماں مسکراتی ہوئی بولی۔ "میں ابھی باہر سے آ رہی ہوں۔ سنا ہے، آج کل یہاں فلاڈا شہر کا کوئی راہب آیا ہوا ہے اور وہ لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ لوگو! میں تمھارے شہر کی ایک دوشیزہ کے تذکرے سُن کے بہت لمبی مسافت طے کر کے یہاں آیا ہوں لیکن سنو، اُس سے زیادہ مجھے تم لوگوں کو دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسے لوگ ہیں جن کے شہر میں داناؤں، عالموں اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی کثرت ہے مگر وہ اُن سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے ایک نازک اندام دوشیزہ کی انگلی تھام کے سفر طے کر رہے ہیں۔ سُنا ہے، جب وہ یہ کہتا ہے تو لوگ اُس کی طرف تمسخر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں، مقدس راہب! تم ہمارے شہر میں نو وارد ہو۔ تم نے جو تذکرے سُنے ہیں، وہ غلط نہیں ہیں، ہمارے ساتھ آؤ اور اُس کا کلام سنو، پھر ہم سے بات کرنا۔ راہب کہتا ہے، کیوں نہیں، میں اُس حسین راہبہ کی دید کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، مجھے اپنی بصارت کی مشاقی اور سماعت کی پختگی کا یقین ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ میرے لیے ایک دلچسپ تجربہ ہو گا۔ لوگوں نے اُسے جواب دیا کہ ہاں ضرور تجربہ کرو، ہمارے شہر کی راہبہ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ تم اُسے دیکھو گے تو اِس صداقت کے قائل ہو جاؤ گے، اُس کی زبان سے جھرنا اور چہرے سے نور بہتا ہے۔"

جون بوڑھی ماں کی باتیں سُن کے اپنی نشست سے اُٹھ کے آہستہ آہستہ دریچے کی طرف چلی گئی۔ بوڑھی ماں کچھ دیر منتظر رہی کہ شاید وہ مڑ کے کچھ کہے مگر جون دریچے سے باہر کا نظارہ کرتی رہی۔ بوڑھی ماں نے اُسے تنہا چھوڑ دیا۔



اُس روز جون نے اپنے اجتماع میں ایک اجنبی چہرہ دیکھا۔ پہلی صف میں دائیں جانب ایک نوجوان، خوش وضع راہب بیٹھا ہوا تھا۔ جون بے نیازانہ اُس کے سامنے سے گزری اور چبوترے پر پہنچ کر خطابت میں گم ہو گئی۔ تقریر کرتے کرتے اُس کی نظر جب بھی اجنبی راہب پر پڑی، جون نے اُس کے چہرے پر اضطراب کی جِھلملاہٹ دیکھی۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ راہب کی آنکھوں میں حیرانی اور تجسس ضرور ہے مگر وہ خوف نہیں ہے جو دوسرے سامعین کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ وہ اُن سب سے علیحدہ ایک شخص معلوم ہوتا تھا۔ معاً اُسے بوڑھی ماں کی بات یاد آئی۔ کہیں یہ وہی راہب تو نہیں ہے جو اُس کی آزمائش کے لیے فلاڈا سے ایک لمبی مسافت طے کر کے می امینس آیا ہے؟ جون کی جبیں پر شکنیں پڑ گئیں۔ اُس نے چند ثانیوں کے لیے اپنی زبان اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجمع میں اُس کے اِس غیر متوقع سکوت سے انتشار سا پیدا ہوا مگر جلد ہی جون نے ایک جھرجھری لے کے آنکھیں کھول دیں۔ پھر اُس کے جمال نے جلال کی مہین نقاب اوڑھ لی اور اُس کی زبان سے چنگاریاں چھٹنے لگیں۔ اُسے خیال ہی نہیں رہا کہ سامعین پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

وہ تقریر ختم کر کے چبوترے سے اُتری تو لوگوں نے حسبِ معمول اُس کے گرد حلقہ کر لیا۔ کسی طرف سے ایک لرزیدہ آواز اُبھری "خداوند! می امینس کی راہبہ پر اپنا سایہ قائم رکھنا۔" جون ایک دل آویز تبسم کے ساتھ ہاتھ لہراتی اور اپنے جمال کی خوشبو بکھیرتی ہوئی سواری کی طرف بڑھ گئی۔ کوچوان نے گھوڑے کی راسیں ڈھیلی کر دیں۔ جون لمحوں میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پھر ایسا ہوا کہ فلاڈا کے نوجوان راہب نے می امینس میں اپنے قیام کی مدت بڑھا دی۔ وہ جون کے ہر جلسے میں آنے لگا۔ جون اُسے ہمیشہ پہلی صف میں کسمساتے ہوئے دیکھتی۔ اُن کا انداز وہی تھا۔ وہی اضطراب آمیز حیرت جو جون نے پہلے دن اُس کے چہرے پر محسوس کی تھی، اُسے دیکھ کے جون کے بیان میں شعلے لپکنے لگتے۔ راہب اُس کی تقریر کے خاتمے پر عموماً اپنی جگہ بیٹھا رہتا یا آہستہ آہستہ قدموں سے واپس جاتا ہوا نظر آتا۔ اُس نے دوسرے لوگوں کی طرح کبھی جون کے قریب آنے اور اُس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جون نے بھی اُس سے مخاطب ہونے کی ضرورت نہیں

بھی وہ دزدیدگی سے ایک نظر اُس کی جانب دیکھتی اور اُسے اپنی طرف متوجہ پاکے فوراً رُخ بدل لیتی۔ راہب بے چینی سے پہلو بدلنے لگتا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ جاری رہا۔ راہب اپنے شہر واپس نہیں گیا۔

ایک دن صبح کے وقت بوڑھی ماں جون کی خلوت میں مخل ہوئی۔ اُس نے اطلاع دی کہ فلڈا کا راہب اُس سے ملاقات کا متمنّی ہے۔ جون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگزیں ہو گئی۔ اُس نے جواب دینے میں توقف کیا۔ خاصی دیر ہو گئی جون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوڑھی ماں نے اپنی بات دہرائی۔ جون چونک سی گئی۔ اُس نے بوڑھی ماں سے اپنی بے خیالی کی معافی چاہی اور بولی "اُسے عزّت سے صحن میں بٹھا دو۔"

بوڑھی ماں چلی گئی۔ جون خاصی دیر تک خلوت میں محبوس رہی پھر وہ باہر نکلی۔ نوجوان راہب صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ جون کو دیکھتے ہی اُس نے کھڑے ہو کے سر کی خفیف جنبش سے جون کو سلام کیا "گرامی قدر راہبہ! صبح بخیر۔" اُس نے شائستگی سے کہا "معذرت خواہ ہوں کہ میں آپ کے نیک مشاغل میں حارج ہوا۔"

"صبح بخیر عزیز مہمان!" جون نے تمکنت سے جواب دیا "مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میری معذرت بھی قبول کیجیے۔ میں عالی مقام راہب کی آمد کا مقصد جاننے کی مشتاق ہوں۔"

"میں شہر فلڈا سے حاضر ہوا ہوں اور عزیز راہبہ کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔" راہب نے جزدان میں رکھی ہوئی ایک کتاب اُسے پیش کی۔

"میں ممنون ہوں۔" جون نے کتاب اُس کے ہاتھ سے لی اور احتیاط سے جزدان کھولا۔ یہ فلسفے اور علمِ کلام کے موضوع پر ایک نایاب مخطوطہ تھا۔ جون کی آنکھیں چمکنے لگیں "میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں کسی کتاب کی اس سے بڑی فضیلت کوئی نہیں ہوتی کہ اُسے اُس کا صحیح وارث مل جائے۔"

"یہ آپ کی عنایت ہے۔" جون نے انکسار سے کہا "میں عالی مرتبت راہب کا یہ تحفہ آنکھوں سے لگا کے رکھوں گی۔" راہب نے ممنونیت سے سر خم کیا۔ جون نے کتاب اپنی آغوش میں رکھ لی اور پُروقار لہجے میں بولی۔ "تمام بستیوں کو خداوند اپنی امان میں رکھے۔ شہر فلڈا میں مقدس یسوع کے لوگوں کا کیا حال ہے؟"

"وہ سب ایک پُرمسرت زندگی بسر کر رہے ہیں حالانکہ وہاں آپ جیسا فکر خیز اور شیریں بیاں عالم کوئی نہیں ہے۔ می امینس کے لوگ اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے درمیان آپ موجود ہیں۔"

جون کی پلکیں تھرتھرا کے دراز ہو گئیں۔ اُس نے فوراً موضوع بدل دیا اور پوچھا کہ "آپ کو می امینس پسند آیا؟ یہاں کے لوگ بہت سادہ اور خدا ترس ہیں۔"

"بے شک۔" راہب نے والہانہ انداز میں کہا "یہ شہر بہت خوبصورت ہے یہاں کے باغات پھلوں اور پھولوں سے مرصّع ہیں۔ یہاں کی ہوائیں ایک دل نواز مہک سے بسی ہوئی ہیں۔ یہاں کی زمین پر خداوند کی خاص رحمت برستی ہے۔ یہاں کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔"

اس اثنا میں بوڑھی ماں نوجوان راہب کے لیے مٹر کے نمک لگے ہوئے دانے اور پھلوں کا رس لے آئی۔ راہب نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ بوڑھی ماں نے انھیں تنہا چھوڑ دیا مگر وہ دونوں نظریں جھکائے ہوئے خاموش رہے۔ جون مٹر کے دانے اپنی ہتھیلی میں بھینچتی رہی اور راہب ایک ایک دانہ چن چن کے منہ میں ڈالتا رہا۔ "می امینس میں آپ کا قیام کب تک رہے گا؟" جون نے شاہانہ انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" راہب نے کسی قدر اُداسی سے جواب دیا۔ "ممکن ہے جلد چلا جاؤں۔ یہاں عالموں کا خزانہ بہت وسیع ہے سوچتا ہوں اپنا حصّہ حاصل کر کے ہی واپس جاؤں۔"

"ضرور ضرور۔" جون نے تپاک سے کہا "جو کچھ اس شہر میں موجود ہے اُس کے لیے شہریوں کی طرف سے مہمان کو کسی بخل کا شکوہ نہیں ہو گا۔"

"مجھے یقین ہے اور اسی یقین نے مجھ میں "قادر الکلام راہبہ کے دروازے پر دستک دینے کی جرأت پیدا کی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھے اپنے بیش بہا علم سے استفادے کے لیے گاہے گاہے یہاں آنے کی اجازت مرحمت کریں کیونکہ آپ کی طرح میرا مدعا بھی خداوند کے پیغام کی سرفرازی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ میں مالا مال ہو کے فلڈا واپس جاؤں گا۔"

جون نے کوئی جواب دینے سے پہلے راہب کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کا جواب سننے کے لیے مضطرب نظر آ رہا تھا۔ جون نے آہستگی سے کہا۔ "مگر میں تو خود ابھی سمجھنے اور سیکھنے کی منزل میں ہوں۔ راہب کو کسی اور دروازے پر دستک دینی چاہیے جہاں علم کا ذخیرہ وافر ہو۔ یہاں تو ... اس گھر کے مکین تو اپنی آسودگی کے لیے خود باہر کی طرف دیکھتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ایک عالی مرتبت راہب کا وقت کہیں خراب نہ ہو۔"

"یہ آپ کا حِلم ہے اور یہی آپ کے علم و فضل کی دلیل ہے۔ میں ایک فقیر ہوں سکندر نہیں ہوں کہ آبِ حیواں سے پیاسا لوٹ جاؤں۔ مجھے اس سعادت سے محروم نہ رکھیے۔ انکار نہ کیجیے۔"

جون پہلو بدلنے لگی۔ فلڈا کا نوجوان راہب اپنی نشست سے اُٹھ گیا۔ جون اتنے قریب بیٹھی تھی کہ اُس کی آنکھیں راہب کے درازیٔ قد کا احاطہ نہیں کر سکیں۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ راہب نے سر خم کیا۔ اُس کی پیشانی چمک رہی تھی۔ جون کی منتشر زلفیں اور منتشر ہو گئیں۔ راہب چلا گیا۔

دوسرے دن راہب جون کے اجتماع میں حسبِ معمول موجود تھا۔ اُس نے جون کو سلام کیا۔ جون نے سر کی ایک خفیف جنبش سے جواب دیا مگر چبوترے پر پہنچ کے وہ اُس کی موجودی سے غافل ہو گئی۔ پھر تقریر کے بعد سوزانہ کی طرح

جون کے قریب ہجوم جمع ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ راہب دُور ایک کونے میں کھڑا ہے۔ جون کی نگاہ اُس پر پڑی تو راہب نے سر جھکا لیا۔

چوتھے روز راہب نے پھر جون کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آج وہ اُس کے لیے سیب اور انگور سے کشید کیا ہوا ایک مشروب لایا تھا۔ جون نے خندہ پیشانی سے اُس کا تحفہ قبول کیا اور عجز سے کہا۔ "میں معزز راہب سے ملتجی ہوں کہ وہ آیندہ یہ زحمت نہ کیا کریں۔" راہب کا چہرہ ندامت سے سُرخ ہوگیا۔ اُس نے بھاری آواز میں کہا کہ اُس کے دل و دماغ شہرِ امنیس کی عالی قدر راہبہ کے لیے بے پناہ جذبات سے معمور ہیں اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح اُن کا اظہار کرے۔ جون نے کہا، اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ اُسے اپنے علم کا تحفہ پیش کیا کرے۔ ساتھ ہی جون نے اُس کے دیے ہوئے مخطوطے پر ایک بسیط تبصرہ کیا۔ راہب حیران کانوں سے اُس کا تبصرہ سنتا رہا۔ پھر اُس نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں چند سوال اُٹھائے۔ اُس کے سوالوں سے جون کو بہت جلد یہ اندازہ ہوگیا کہ نوجوان راہب کا عجز ایک عالم کا عجز ہے، اُس کی معلومات عام راہبوں سے کہیں کشادہ اور متنوع ہیں اور وہ دُنیوی علوم کے ایک بڑے ذخیرے کا بھی مالک ہے۔ اُس کی فکر گہری اور منفرد تھی۔ وہ عالمانہ پیرائے میں نہایت دل کش گفتگو کر رہا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان ایک ہلکا سا استدلالی اختلاف بھی ہوا مگر اُن کی خوش گفتاری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دونوں جوشیلے انداز میں آموختہ دُہرانے لگے۔ آج راہب خاصی دیر تک بیٹھا۔ رخصت ہوتے وقت اُس میں وہی انکسار عود کر آیا جو غالباً اُس کے مزاج کا خاصّہ تھا۔ دروازے پر رُک کے اُس نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ "عزیزۂ گرامی! مجھے آپ کے وقت کی قدر و قیمت کا علم ہے لیکن آج کی ملاقات نے میرا اشتیاق اور سوا کر دیا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ آج آپ کی فکر انگیز باتوں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔"

"آپ کی آمد بھی میرے لیے مسرت انگیز ثابت ہوئی۔" جون نے سیر چشمی سے اعتراف کیا۔ "آپ کا کلام میرے علم میں اضافے کا موجب ہوا ہے۔ آپ کا عرفان لائقِ ستائش اور باعثِ فخر ہے۔"

"آپ کے یہ الفاظ میرے لیے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔" راہب نے جوش سے کہا پھر یک بارگی اُس کا چہرہ یاسیت سے دھندلا گیا۔ "مگر محترم عزیزہ! اُس عرفان سے کیا حاصل جو ایک بے بس شخص کے دماغ کے تہہ خانے میں قید ہو۔ آدمی کا عرفان اُس کی قوتِ کار کا پابند ہے، خداوند عرفان و ادراک کے ساتھ ساتھ اُس کی سمائی اور اُس کی ترسیل کی قوت بھی اُتنی ہی دیا کرے تب عرفان کا فرض ادا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی بساط معلوم ہے، یہ کائنات بہت وسیع ہے مگر ہم صرف دو قدموں کے رقبے میں محدود رہتے ہیں، ہم کہیں بھی چلے جائیں، اِس سے زیادہ رقبہ ہمارے تصرف میں نہیں رہ سکتا۔"

"بے شک۔" جون نے خیال آفریں لہجے میں کہا۔ "انسان اپنے رقبے میں محدود ہے مگر یہ کیا کم ہے کہ کچھ لوگ کچھ جاننے کی دولت سے بہرہ ور ہیں۔ لوگوں میں سب سے بڑی کمی نہ جاننے کی ہوتی ہے لہٰذا جو شخص کچھ جانتا ہے، وہ اُن لوگوں پر فوقیت رکھتا ہے جو کچھ نہیں جانتے اور جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے ــــ وہ روشنی میں رہتے ہوئے بھی روشنی سے محروم ہیں، پس معزز راہب کو اتنا مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خداوند نے اُسے کچھ جاننے کی فضیلت سے ضرور نوازا ہے حالانکہ اُس نے اُس کا وزن عام آدمی کے وزن سے زیادہ نہیں رکھا۔"

راہب کے جانے کے بعد جون دیر تک اُس کے بارے میں سوچتی رہی۔ اُس نے مطالعے میں ڈوبنا چاہا مگر اس شغل میں آج اُس کا دل نہیں لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی آنکھوں کے سامنے بے شمار ذرات اُڑ رہے ہوں۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور اُسے کچھ تھکن کا احساس ہوا جیسے بدن ٹوٹ رہا ہو۔ اُس نے ایک انگڑائی لی اور دوبارہ مطالعے میں منہمک ہونا چاہا مگر طبیعت کا بوجھل پن دُور نہیں ہوا۔ اُس نے سیب اور انگور کے مشروب کی صراحی منہ سے لگا لی۔ یہ مشروب راہب کا تحفہ تھا۔ اُس کے اعصاب کچھ پُرسکون ہوگئے۔ اُس نے آئینے کے سامنے زندگی میں پہلی بار غور سے اپنا چہرہ دیکھا۔

فادر اکا راہب وقفوں وقفوں سے آتا رہا اور پھر اُس کا آنا معمول بن گیا اور اُن کی نشستیں طویل ہوتی گئیں۔ اُن کے پاس موضوعات اور مسئلوں کی کمی نہیں تھی۔ روز ایک نیا مسئلہ اُن کے سامنے ہوتا اور وہ اُس میں اُلجھ جاتے۔ اُن کے درمیان کبھی دھیمی، کبھی تیز، کبھی سرد، کبھی گرم بحث ہونے لگتی یہاں تک کہ دھوپ چپکے سے منڈیروں پر چڑھ جاتی اور شام دبے پاؤں صحن میں آکے ڈیرا جما دیتی اور چراغ کی لَویں تھرتھرانے لگتیں تب اُنھیں وقت گزرنے کا احساس ہوتا۔ "آہ۔" راہب حسرت سے کہتا۔ "کاش انسان وقت سے بے نیاز ہوا کرتا۔"

وہ تشنہ اور ناآسودہ اُٹھتے۔ راہب جاتے وقت عموماً معذرت کرتا تھا۔ "عزیز جون! مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے کہ آپ میری یاوہ گوئی خوش نفسی سے برداشت کرتی ہیں۔ واپس جانے کے بعد مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ کا مزاج نفیس اور نرم و نازک ہے، پھولوں جیسا ہے۔ اس لیے کہیں آپ کا شیشۂ ذہن میری باتوں سے متاثر نہ ہو جاتا ہو۔ آپ کی ذات ایک طلسم ہے، خدا نے آپ کو اپنی تمام فیاضیوں سے نوازا ہے۔ میں اپنی خلوت میں اکثر آپ کے متعلق سوچتا ہوں اور میرے ذہن میں بہت سی باتیں اُبھرتی ہیں مگر آپ کے پاس آتے ہی وہ سب خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ کوئی بات ہے جو رہ جاتی ہے اور واپس جانے کے بعد مجھے تنگ کرتی ہے مگر وہ کیا بات ہے، یہ شاید میں خود بھی نہیں جانتا۔"

"خدا آپ کو سکون دے۔" جون نے اُداسی سے کہا۔ "ایک عالِم کبھی سیر نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ بدحواس رہتا ہے۔ یہ خوش آیند علامت ہے۔ دُنیا میں ہر ہوس بُری ہے علم کی ہوس کے سوا۔ آپ کی یہ بے چینی اسی نیک ہوس کے سبب سے ہے۔ جو نکتے آپ کے ذہن میں آیا کریں، ازراہِ کرم انھیں لکھ لیا کیجیے۔"

موسمِ گرما میں مہمان نوازی کا آغاز نورس سے کیجئے



نورس
مشروبِ وقت

راہب خاموشی سے واپس چلا گیا۔ دوسرے دن وہ پھر آیا۔ آج اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ چہرہ بھی تھکا تھکا سا تھا تاہم اُس نے کل کی ادھوری بحث کا آغاز کر دیا مگر جون آج پوری طرح حاضر نہیں تھی۔ گفتگو کے دوران میں راہب نے کوئی سوال کیا تو وہ اس طرح چونکی جیسے اُسے گہری نیند سے بیدار کر دیا گیا ہو۔ وہ اپنی غائب دماغی پر پشیمان بھی ہوئی۔ راہب نے اضطراب سے کہا۔ ”کیا آج کی نشست ملتوی کر دی جائے؟ آپ کچھ فکر مند نظر آ رہی ہیں۔ آپ کی توجہ کس مسئلے نے تقسیم کر دی ہے؟ مجھے بتائیے۔“

”ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ جون نے شرمندگی سے کہا۔ ”میں آپ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اصل میں یہ سوال مجھے آپ سے کرنا چاہیے تھا۔ خدا رحم کرے۔ آج آپ کے چہرے سے کسی قدر ناطمانیت نمایاں ہے۔“

راہب بے قرار سا ہو گیا۔ ”ہاں معزز جون! مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ کچھ ایسا ہی ہے۔ میرا ذہن بے شمار مسائل سے گھر گیا ہے۔ یہ مسئلے خام اور نامکمل شکل میں ابھرتے ہیں اور میں شدید اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ ان کا اظہار بھی ایک قسم کی روحانی اذیت ہے۔ یقیناً آپ اس بارے میں استفسار کریں گی مگر میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے پاس ان مسائل کے اظہار کے لیے لفظوں کا کوئی قالب موجود نہیں ہے۔ میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں۔“

جون کی سانسیں اُلجھنے لگیں۔ اُس نے تذبذب سے راہب کو دیکھا۔ راہب کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے ابھی خون ٹپک پڑے گا یا شعلے نکل آئیں گے۔ اُس کا چہرہ بھی جیسے اچانک لہولہان ہو گیا تھا۔ ”خداوند آپ پر ....“ جون اپنی دعا مکمل نہ کر سکی۔

”میں سوچتا ہوں کہ مجھے فلڈا واپس چلا جانا چاہیے۔“ راہب نے ڈھلکی ہوئی آواز میں کہا۔ ”معزز جون! میں آپ کو بہت یاد رکھوں گا۔ آپ نے میرے قلب پر اپنی ذات کے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں لہٰذا اس سے پہلے کہ میرا قلب میرے دماغ کی اطاعت قبول کرے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ لیکن جون! جون!“ راہب نے وارفتگی سے کہا۔ ”آپ مجھے بہت یاد آئیں گی۔“

نوجوان راہب کا لہجہ اتنا شدید تھا کہ جون کا سارا بدن جھن جھنا اُٹھا۔ اُس نے اپنے احمریں ہونٹ مضبوطی سے پیوست کیے اور بند آنکھوں سے جواب دیا۔ ”می امینس کی یہ راہبہ بھی آپ کو یاد رکھے گی۔ خدا آپ کا سفر سہل کرے۔ آپ نے اس مکان میں علم و دانش کے جو تذکرے کیے ہیں، اُن سے میرے دل پر بھی گہرے نقش کندہ ہوئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کے منتشر خیالوں کے لیے یہ سفر مبارک ثابت ہو گا۔“

”میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔“ راہب کی آواز ڈوبنے لگی۔

اُن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر دیکھ نہیں سکے۔ جون نے جلد ہی ایک قدیم علمی مبحث چھیڑ دیا مگر راہب کے جوابات میں وہ طنطنہ اور غلغلہ نہیں تھا۔ وہ گفتگو میں شریک ضرور رہا لیکن نہ وہ جون کو مطمئن کر سکا، نہ خود مطمئن ہو سکا۔ پھر راہب نے خلافِ معمول شام ڈھلنے سے پہلے ہی جون سے جانے کی اجازت چاہی۔ جون نے اُسے روکا نہیں۔ راہب نے دروازے پر مڑ کے ایک نظر جون کو دیکھا اور دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ جون نے تھم پکڑ لیا اور وہیں کچے فرش پر بیٹھ کے سُرخ آسمان تکنے لگی۔

دوسرے دن راہب جون کے گھر نہیں آیا۔ پھر کئی دن گزر گئے اور اجتماع کا دن آ پہنچا۔ وہ اجتماع میں بھی موجود نہیں تھا۔ جون پہلی صف میں اُس کے چہرے کی عادی ہو گئی تھی۔ آج وہ صف اُسے خالی خالی نظر آئی۔ آج اُس کے خطاب میں سبھی نے ایک لرزش محسوس کی۔ تقریر کے خاتمے پر لوگوں نے اُس کی خیریت دریافت کی۔ اُس نے سچ کہہ دیا کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

آئندہ اجتماع میں اُس نے بہت کوشش کی کہ اپنے خطاب کی روانی اور زور برقرار رکھ سکے لیکن اُس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی بلکہ اب وہ خطاب کے دوران میں اٹکنے اور بہکنے بھی لگی۔ آخر اسی طرح کے دو تین خطابات کے بعد اُس نے عاجز آ کے فیصلہ کر لیا کہ وہ کچھ عرصے تک تقریروں کا سلسلہ بند کر دے گی۔ جون نے یہ اعلان کروا دیا۔ اس اعلان سے می امینس کے باشندوں پر اوس سی پڑ گئی۔ کلیسا کے دوسرے راہب اُس کا مزاج پوچھنے کے لیے اُس کے گھر آئے۔ شہر کے طبیبوں نے دماغ کی تازگی اور قلب کی فرحت کے لیے اپنی خاص دوائیں اُس کی نذر کیں لیکن جون کو کوئی بیماری نہیں تھی۔ جب سے راہب گیا تھا، اُسے بس ایک بے اطمینانی محسوس ہوتی تھی، ایک بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ اُس کے اعصاب کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔ اُس کی رفیق کتابیں بھی یہ کھنچاؤ اور بوجھ کم کرنے میں معاون نہیں ہوئیں۔ فلڈا کا راہب چلا گیا تھا مگر وہ اپنے متعلق جس ذہنی ابتلا کا ذکر کرتا تھا، جون بھی اسی سے دوچار ہو گئی۔ راہب کا انتشار ایک متعدی مرض کی طرح اُس کے دماغ سے چمٹ گیا تھا۔ صبح ہوتی تو غیر اختیاری طور پر اُس کی نگاہ دروازے پر چلی جاتی۔ وہ راہب کی دستک سے مانوس ہو گئی تھی۔ اُسے اُس کی چاپ بھی یاد تھی۔ جب تک وہ آتا رہا، جون نے اُس کی بابت کبھی اتنا نہیں سوچا لیکن وہ چلا گیا تو اُس کا خیال جون کے اعصاب پر مسلط ہو گیا۔ معلوم نہیں، راہب کس حال میں ہو! خدا اُسے سکون دے۔ خدا اُسے سکون دے۔

کئی ہفتے گزر گئے، جون گھر میں بند رہی۔ اُس نے لوگوں سے ملنا جلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا۔ ایک دن صبح سویرے وہ صحن میں گم سم بیٹھی تھی۔ اچانک اُسے وہی مانوس دستک پھر سنائی دی۔ اُس نے سوچا کہ یہ اُس کے کانوں کا وہم ہے۔ دستک جاری رہی۔ ایک لرزیدہ دستک۔ جون نے اپنے آپ کو دروازہ کھولنے سے سنبھالا۔ وہ ٹھٹکی کھڑی رہی۔ اُس نے ارادہ کیا، بوڑھی ماں سے کہہ دے کہ وہ گھر پر نہیں ہے یا وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتی لیکن وہ خود دروازے کے پاس کھڑی تھی اور اُسے خبر نہیں تھی کہ اُسے یہاں تک کون لے آیا ہے۔ آخر کچھ تامل سے اُس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے راہب کھڑا تھا، فلڈا کا نوجوان راہب مگر کیا یہ وہی ہے؟ جون نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کا دیدہ

سراپا دیکھا۔ عبا پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا، بالوں پر گرد جمی ہوئی، چہرہ سخت اور سیاہ، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ "معزز جون!" اُس نے کٹی پھٹی آواز میں کہا۔ "میں اپنے خیالوں کو شکست نہیں دے سکا۔ آپ کے پاس واپس آگیا ہوں۔ مجھے بتائیے جون! میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟" "جون! سنو، ذات اور کائنات کے کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جن پر ہم نے کبھی گفتگو نہیں کی ہے، وہ مسائل ہماری دُنیا سے اور ہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم انھیں درگزر نہیں کر سکتے۔ جون! بے شک آپ کُل کا ایک جزو ہیں مگر اپنے جزو میں بھی ایک کُل ہیں کیونکہ وہ جزوریت کے ذرّے کے مانند ہے جسے علیحدہ بھی کیا جا سکتا ہے اور جو کُل کے بغیر ادھورا بھی ہے۔ جون! جو مسئلہ مجھے پریشان کر رہا تھا، اب اُس نے اپنا پیکر تراش لیا ہے۔"

جون اُس کے آتش بیاں انداز سے سہم گئی۔ راہب اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا مگر خود جون کی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔ راہب کی اچانک واپسی سے اُس کا بدن لڑکھڑانے لگا تھا۔ اُس نے راہب کو عزت سے بٹھایا۔ اُس سے عبا اُتار دینے کی درخواست کی اور اُسے سفید چادر پیش کی۔ راہب نشست پہ بیٹھ کے ہانپنے لگا۔ اُس نے جون کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ جون نے بوڑھی ماں کو ہدایت کی کہ وہ اُس کے لیے جلد از جلد کوئی مفرح مشروب تیار کرے۔ کچھ دیر بعد راہب کی حالت اعتدال پر آگئی۔

"کیا آپ فلڈا سے واپس آگئے؟"

"میں فلڈا گیا کہاں۔ میں فلڈا نہیں جا سکا۔ بستیوں بستیوں گھومتا رہا مگر مجھے کہیں سکون نہیں ملا۔ میں نے ویرانوں میں بیٹھ کے طویل مراقبوں میں ڈوبنے کی کوشش کی مگر ہر جگہ۔ مجھے کہنے دیجیے معزز جون! میری عزیز جون! کہ میں کہیں بھی اپنا بچھڑا ہوا سویرا نہ پا سکا۔ میرے گرد کڑی دھوپ رہی یا رات کی سیاہی میرا نصیب بنی۔ میرے اندر ایک اندھیرا بس گیا ہے اور میں تمھارے پاس روشنی کے لیے آیا ہوں کیونکہ تمھاری ذات نور کا منبع ہے۔"

"معزز راہب! تحمل کیجیے۔" جون لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کا مقام بہت بلند ہے، آپ علم و فضل اور دانائی میں یکتا ہیں اور آپ نے جو راستہ اپنے لیے متعین کیا تھا، وہ زندگی کا سب سے ارفع راستہ ہے۔ لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ جو خود کو ترک کر دیتے ہیں وہی لوگوں کی رہبری کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو دوبارہ فلڈا واپس جانے کا مشورہ دوں گی۔"

"میں کوشش کر چکا ہوں۔" راہب آتشیں لہجے میں بولا۔ "میں نے کوئی دلیل نہیں چھوڑی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سزا دی لیکن میرا غبار بڑھتا گیا۔ جون! مجھے یہاں سے واپس مت کیجیے۔ میں کہیں اور نہیں جا سکتا۔"

"تو آپ مینس کو اپنا مسکن بنا لیجیے مگر معزز راہب کو معلوم ہونا چاہیے کہ خداوند نے اُسے جو کام تفویض کیا ہے، اُس کے لیے ذہن و دل کی یکسوئی ضروری ہے جو شاید معزز راہب کو اس شہر میں نہ ملے۔"

"جون!" راہب بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو میں یہاں واپس نہ آتا۔ جون! میں ایک سچ ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بھی سچ ہے۔ میرے سینے کو قرار نہیں ہے۔ جون! سچ کو تسلیم کیجیے۔ آپ ایک راہبہ ہیں۔"

"فلڈا کے راہب!" جون نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں تمھارا سچ دیکھ رہی ہوں لیکن اے معزز شخص! ہم اس سچ کے سزاوار نہیں ہیں کیونکہ ہم نے اپنے لیے اس سے بھی اعلا مسرت منتخب کی ہے۔ یہ زندگی تو بہت مختصر، بہت عارضی منظر ہے۔ ہم ایک ابدی حقیقت پر یقین رکھتے ہیں، یہاں کے بعد ایک دائمی اور ابدی زندگی ہماری منتظر ہے، جہاں ہمیں سارے دروازے کھلے ہوئے ملیں گے، ہمارے پاس باغ ہوں گے، سبک سیر ہوائیں ہوں گی۔ وہاں ہماری روحیں رقصاں رہیں گی۔ آہ وہ زندگی جسے خداوند کی قربت نصیب ہو، اُس سے بڑی سعادت، اُس سے بڑی لذت ممکن نہیں ہے۔"

"جون! بس کرو۔" راہب کرب سے بولا۔ "جو لفظ میرے سامنے دہرائے جا رہے ہیں، وہ مجھے بھی ازبر ہیں اور میں اُن پہ صدقِ دل سے ایمان رکھتا ہوں لیکن پھر یہ کیا ہے؟ یہ کیسی آگ ہے جو میرے دل میں فروزاں ہے؟ جون! خدارا مجھے کہیں جانے کے لیے مت کہو کیونکہ میں تمھارے اندر خدا کی صناعی کا جلوہ دیکھتا ہوں۔ مجھے اپنے قریب رکھو جون!" راہب کی آواز اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

جون ششدر تھی۔ راہب کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔ وہ شعلے جون کا سارا وجود خاکستر کیے دے رہے تھے۔ نوجوان راہب اپنے نفس کی چنگاریاں اُڑاتا رہا اور جون کے بال و پر پھڑپھڑاتے رہے، جون کی روح تڑپتی رہی۔ پھر جب اُس کی سماعت کا پیالہ لبریز ہو گیا تو وہ چھلک پڑی۔ اُس نے چیخ کے راہب سے چپ رہنے کی درخواست کی مگر راہب خاموش نہیں ہوا۔ آخر جون نے نڈھال ہو کے سر ایک طرف ڈال دیا۔ راہب بے تابانہ اُس کے قدموں میں جھک گیا۔ اُس نے جون کا مرمریں ہاتھ پکڑ کے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اُس پہ رکھ دیے۔ جون نے اُس کے ہونٹ اپنے سارے بدن پر محسوس کیے۔ وہ پتھر کی طرح منجمد ہو گئی۔

پھر راہب دن بھر جون کی مورت دیکھتا رہا اور جون اُس کا بت تکتی رہی اور جب وہ واپس جانے لگا تو جون نے اُسے روک لیا۔ راہب وہیں ٹھہر گیا۔



اُن کے پاس تخلیے کی کمی نہیں تھی۔ بوڑھی ماں اپنی عزیز بیٹی کے مشاغل میں پہلے بھی غیر ضروری دخل دینے سے گریز کرتی تھی، اب راہب کی موجودگی میں وہ اور محتاط ہو گئی تھی۔ جون کی چاندی راہب کی آنچ میں پگھلنے لگی۔ اُس نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو اطراف میں اُسے رنگ ہی رنگ نظر آئے۔ جو دیوار یں وہ روز دیکھتی تھی، اب وہ اُسے کچھ بدلی ہوئی نظر آتی تھیں اور خود جون؟ جون کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی آنکھیں، اُس کے ہونٹ اُس کے نہیں ہیں۔ وہ یہ بھی محسوس کرتی تھی گویا اُس کے بدن پر ہزاروں آنکھیں اُبھر آئی ہوں، وہ کبھی اِدھر دیکھتی، کبھی اُدھر۔ ہر سمت اُسے دُنیا کا ایک

نیا جلوہ نظر آتا تھا۔ یہ سب مناظر اُس کے لیے نئے تھے۔ وہ ان مناظر میں ایسی کھو گئی کہ اُسے نہ اپنی خبر رہی نہ اُس منصب کا خیال آیا جس پر وہ متمکن تھی۔ جون کا ریشم بدن ابھی تک کسی کے بازوؤں کے لمس سے ناآشنا تھا اور راہب نے بھی کسی عنبریں، مخملیں، سمن زار آغوش کی سیر نہیں کی تھی۔ می امینس کے لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ ہماری حسین راہبہ، ہماری ملکہ کب اپنی خلوت سے نمودار ہو رہی ہے؟ اب نصیب دشمناں اُس کی طبیعت کا کیا حال ہے؟ کیا کسی نے اُس نازنیں پری پیکر کی خبر لی کہ وہ کس حال میں ہے؟

پری پیکر اپنے حال سے بیگانہ تھی۔ فلڈا کے راہب کے بازوؤں میں وہ مدہوش ہو جاتی تھی۔ جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ اُن کی عشرت آرائیوں کے لیے یہ جگہ تنگ ہے۔ وہ کھلی فضا کی تلاش میں تھے۔ ساحلوں پر دُور افق سے ملتے ہوئے سبزہ زاروں پر مگر یہ شہرِ می امینس میں ممکن نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے طے کیا کہ وہ یہ شہر ہی چھوڑ دیں گے۔

ایک صبح جب بوڑھی ماں جاگی تو جون گھر میں موجود نہیں تھی، فلڈا کا نوجوان بھی غائب تھا۔ ضعیفہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس کی دوسری بیٹی بھی اُس سے چھن گئی تھی۔ وہ جون کی جدائی برداشت نہیں کر سکی اور اُس کے لیے اپنی بوڑھی ہڈیاں سمیٹنا مشکل ہو گیا۔ وہ آہ و بکا کرتی ہوئی فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

جون رات ہی رات میں مردانہ لباس پہن کے اپنے دوست کے ساتھ شہرِ می امینس کی حدود سے باہر نکل چکی تھی۔ اُس کا دوست اُس سے کہہ رہا تھا۔

”جون! جب لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تم اپنے شہر سے رُوٹھ گئی ہو تو صحرا آباد ہو جائیں گے۔ آج می امینس ویران ہو گیا۔“

جون کے ابرو کھنچ گئے۔ اُس نے زیرِ لب تبسم سے راہب کی طرف دیکھا۔ وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ شہر فلڈا میں داخل ہو گئے۔



جون کا لباس بدلا ہوا تھا۔ وہ ایک خوش جمال نوعمر لڑکے کے قالب میں فلڈا پہنچی تو لوگوں نے حیرت اور تجسس سے اُس کا استقبال کیا۔ راہب نے اُن کی حیرت اور سوا کر دی۔ اُس نے اُن سے کہا کہ وہ انگلستان سے اُن کے لیے ایک گوہرِ نایاب لایا ہے اور خداوند نے اس لڑکے پر خاص عنایت کی ہے۔ ”لوگو! تم نے ابھی اس کا ظاہری جمال دیکھا ہے۔ اس کے باطنی جمال کا اندازہ تمھیں اُس وقت ہو گا جب اِس کے آتشیں چہرے سے نور کے سوتے پھوٹیں گے۔“

ادھیڑ عمر کی ایک عورت آگے بڑھی۔ اُس نے جون کو سر سے پیر تک دیکھا اور والہانہ انداز میں کہا۔ ”بے شک۔ اے پاک راہب! ہم نے رنگ و نور کا ایسا ترشا ہوا پیکر پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

جون نے می امینس کی طرح ایک اونچے چبوترے پر پہنچ کے فلڈا کے لوگوں سے خطاب کیا۔ سننے والے گنگ رہ گئے کیونکہ اُن کی سماعت ایسے خوش الحان، سنسنی خیز اور دل نشیں بیان سے اب تک ناآشنا تھی۔ چند ہی روز میں فلڈا کے کوچوں اور بازاروں میں جون کے چرچے گونجنے لگے۔ لوگ دُور دُور سے اُسے دیکھنے کے لیے آتے اور فرمائش کرتے۔ ”ہم نئے راہب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے ارشاد سے نوازیں۔“

لباس کی طرح جون نے اپنی آواز بھی بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنا پُرجلال، پُرسوز اور ترنم ریز لہجہ نہیں بدل سکی۔ می امینس کے مانند وہ یہاں بھی عام لوگوں سے ملنے جلنے میں احتراز کرتی تھی۔ وہ اپنے پرفاتحانہ خطاب کے بعد راہب کی معیت میں سیدھی گھر آ کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتی۔ نوجوان راہب تھکی ہوئی جون کو اپنی آغوش میں بھر لیتا۔ جون کو ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ اُس کے خطاب کی محنت کا معاوضہ ہے یا اُس کے حُسنِ بیاں کا انعام ہے۔ راہب اُس کی گھنیری سیاہ زلفوں کے بند کھول دیتا اور اُن کے درمیان اُس کے رُخِ زیبا کا نظارہ کرتا رہتا۔ وہ آہستہ سے اُسے پکارتا۔ ”جون! میری جون! میری زندگی! تم آج کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

جون خواب آگیں لہجے میں جواب دیتی۔ ”ہر دن ایک نیا دن محسوس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم میرے لیے روز پیدا ہوتے ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں آسمانوں میں موجود ہوں اور بادلوں کی سواری میرا وجود اُٹھائے ہوئے ہے۔ تم نے میرے رگ و پے میں جیسے موسیقی سمو دی ہے اور جب میں ان بلندیوں سے زمین کی طرف دیکھتی ہوں تو.... تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ میری آنکھیں زمین پر ایک آتش فشاں کھولتا ہوا دیکھتی ہیں۔“

”ایسے وقت میں تم مجھے دیکھ لیا کرو کیونکہ میں یہاں زمین پر تمھارے بھیانک خوابوں کی دل کش تعبیر ہوں۔ میں زمین پر تمھارے لیے اپنے بازوؤں میں ایک گلستاں سجائے ہوئے ہوں، یہاں میٹھی آگ جلتی ہے۔ جون! ایسی باتیں مت کیا کرو۔“ راہب دل سوز لہجے میں کہتا۔

جون اُس کے گلستاں، اُس کے قفس میں آ کے بسی تو اُسے اپنی ذات کی معرفت ہوئی، اپنا ادراک ہوا۔ فلڈا میں ایک ڈیڑھ مہینے تک وہ ایک دوسرے میں ایسے رچے بسے رہے جیسے وہ ایک ہی درخت کی شاخیں ہوں اور ایک ہی شاخ کے دو پھول ہوں۔ جیسے جو زمانہ گزر گیا ہے وہ فرقت کا ایک طویل زمانہ تھا اور جیسے انھوں نے ایک طویل فرقت کے بعد ایک دوسرے کو دست یاب کر لیا ہو۔ راہب جون کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ کے نقاشِ ازل کے اِس کرشمے، اس شہپارے کا مطالعہ کرتا تو اُس کی آنکھوں سے شراب برسنے لگتی۔ جون کا عالم بھی اُس سے مختلف نہیں ہوتا تھا۔

وہ راہب کی ایما پر فلڈا کے لوگوں سے خطاب کرتی رہی اور فلڈا کے لوگ اس نووارد نوعمر لڑکے کو اپنی پلکوں پر بٹھاتے رہے مگر جون کے لیے یہ فضا سازگار ثابت نہیں ہوئی۔ اُس نے راہب سے اصرار کیا کہ وہ کہیں اور چلے چلیں کیونکہ اب یہ بہروپ اُس سے سنبھالا نہیں جاتا، سچ اپنی رونمائی پر مچلنے لگا ہے، وہ چھپنے کی کوشش میں اور اُمڈ رہی ہے۔ اُسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ یہاں کب تک اس حلیے میں رہ سکتی تھی لیکن راہب

اپنے لباس کا عادی ہو چکا تھا۔ اس لباس میں وہ ایک نوجوان، سرو قد، لالہ زار لڑکی کے ساتھ آزادانہ نہیں رہ سکتا تھا اور اُسے جون کو ایک عام لڑکی کے روپ میں دیکھنا گوارا بھی نہیں تھا کیونکہ وہ ایک بے مثال خطیبہ تھی۔ اُسے ایک عام لڑکی کی طرح رکھنا حق تلفی تھا۔ راہب اُس کا علم چار دیواری میں مقید کر لینے کی کوشش کیسے کرتا؟ یہ خود غرضی ہوتی۔ اُس کی خواہش تھی کہ جون اجتماعات سے خطاب کرتی رہے اور اپنے علم و فضل کے دریا بہاتی رہے۔ راہب چونکہ خود بھی ایک عالم شخص تھا، اُسے علم کی قدر و قیمت معلوم تھی۔ علم ہمیشہ اظہار سے جلا پاتا ہے اور ترویج ہی اُس کا مقصود ہے۔ جو علم کسی دماغ کے پنجرے میں بند رہے، وہ اُس پرندے کے مانند ہے جسے آہ و زاری کے سوا کچھ نہ آتا ہو۔ یہ صیاد کی خوش گمانی ہے کہ وہ اُس کی آہ و زاری، نغمہ سرائی پر محمول کرتا ہے۔

فلڈا کے راہب نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ایک نو عمر خوش قامت لڑکے کے ساتھ اُس کا یہ التفات شہر میں تجسس اور دلچسپی کی نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اُدھر جون اُس سے روزانہ اپنے حواس اور اعصاب کی دریدگی گزیدگی کا ذکر کرتی تھی۔ اُس کے رخساروں پر ابر سا چھا گیا تھا۔ وہ جاگتی رہتی تھی اور کبھی کبھی چونک کے بڑبڑا کے اُٹھ جاتی تھی۔ راہب اُس کا سر اپنے نہاں خانے میں چھپا لیتا اور فکر مندی سے کہتا "فکر نہ کرو جون! گھر مختصر ہے، شہر تنگ ہے مگر زمین بہت بڑی ہے۔"

می امینس کی طرح انھوں نے فلڈا کو بھی خیرباد کہہ دیا اور راتوں رات وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راہب کا خیال تھا کہ جگہ کی تبدیلی سے جون پر خوشگوار اثر مرتب ہو گا۔ وہ چھپتے چھپاتے اور پڑاؤ کرتے ہوئے ایتھنز پہنچ گئے۔ جون اب بھی ایک مرد راہب کے لباس میں تھی۔ ایتھنز نے اپنی تمام فکری اور علمی روایات کے ساتھ نو وارد راہبوں کا استقبال کیا اور انھیں اپنے قلب میں جگہ دی۔ انھوں نے خیر مقدم کرنے والوں سے بہ مشکل دامن چھڑایا اور ایک کلیسا سے ملحق سرائے میں ٹھہر گئے لیکن جون نے سفر کی گرد جھاڑتے ہی راہب سے کہا "کیا ہم اسی اعزاز کے لیے یہاں آئے تھے؟ یہ عزت اور پذیرائی می امینس اور فلڈا ہی میں کیا کم تھی۔ ہم نے فلڈا اور می امینس کی زمینیں کیوں ترک کی تھیں؟ میں یہ پسند نہیں کرتی کہ اس نئے شہر میں بھی اپنے مشاغل کا دوبارہ آغاز کروں کیونکہ موجودہ زندگی ہم نے ہوش و حواس کے ساتھ اختیار کی ہے اور ہماری ذہنی آسودگی کے لیے یہ مناسب بھی نہیں ہے کہ ہم وہی لباس پہننے پر اصرار کریں جو ہمارے جسموں کے لیے اب موزوں نہیں رہا۔ اب ایتھنز میں مجھے اعزاز کی نہیں، خلوت کی ضرورت ہے جہاں صرف تم ہو۔ مجھے شہرت کی نہیں، گمنامی کی تلاش ہے۔"

راہب نے مایوسی سے کہا "گمنامی کی نعمت مشک کے نصیب میں کہاں۔ تم جہاں جاؤ گی، اپنی خوشبو کے ساتھ جاؤ گی اور تمھاری خوشبو سے صرف مجھے مستفید ہونے کا حق نہیں ہے۔ میں نے بلاشبہ تمھاری ذات پر قبضہ کر لیا ہے جب کہ تمھارے علم و دانش سے استفادے کا سب کو حق ہے۔ ہم کچھ اور نہیں کر سکتے تو اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اُسے فراخ دلی سے تقسیم کریں اور کسی سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ لوگوں کو خداوند کے پیغام کی ضرورت ہے، ہماری نہیں۔ اس طرح تم میرے پاس بھی رہو گی، اور اپنے فرائض بھی ادا کرتی رہو گی۔ وہ فرائض جو تمھارے علم کی طرف سے تم پر عائد ہوتے ہیں۔"

"لیکن یہ ہماری اپنی تاویلات ہیں جو ہم نے جوازاً وضع کر لی ہیں۔ ہم خود کو اپنی ذات کے جزیرے میں رکھیں یا فرائض ادا کریں؟ اس طرح تو ہم دونوں میں سے کوئی ایک حق بھی مکمل طور پر ادا نہیں کر سکتے اور نہ ہمارا علم ہمیں اس کی آزادی دیتا ہے۔" جون نے بے بسی سے کہا۔

راہب کے پاس جون کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ایتھنز میں جون کو ایک مرد راہب کی حیثیت سے متعارف کرا چکا تھا اور جون نے چند ایک عالمانہ خطبات دے کے ایتھنز والوں کو اپنے کلام کا اسیر کر لیا تھا۔ راہب ہر وقت اُس کی دل جوئی میں لگا رہتا تھا۔ وہ گھر آتا تو جون کے لیے اُس کی شہرتوں کی خبریں ساتھ لاتا۔ جون یہ خبریں سن کے اداس ہو جاتی مگر اب وہ عموماً اداس ہی رہتی تھی اور راہب کو آمادہ کرتی رہتی تھی کہ وہ ایتھنز چھوڑ کے کہیں اور چلے۔ اُس کا اصرار تھا کہ آؤ ہم یہ لباس اُتار دیں اور ساحلوں پر گھومیں، باغیچوں کی سیر کریں۔ جون کی ان باتوں سے راہب کی پیشانی جھک جاتی تھی۔ ایتھنز میں انھوں نے چند ہفتے گزارے۔ پھر راہب نے جون سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی ایک نئے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ جون نے اس وعدے پر راہب کے رخساروں کو بے تحاشا بوسے دیے اور وارفتگی سے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ جون جانتی تھی کہ راہب کو اس وقت اُس کی شدید ضرورت ہے۔ وہ راہب کے چہرے پر فکروں کا غلبہ دیکھتی تھی۔ اتنے بڑے فیصلے کے بعد ایسا ہونا یقینی تھا۔ یہ راہب کا سچ تھا۔ اُس کا سچ جون کو بھلا لگا۔



دوسری صبح جون بیدار ہوئی تو راہب بستر پہ موجود نہیں تھا۔ اُس نے سوچا کہ ممکن ہے، وہ کسی کام سے باہر گیا ہو لیکن دوپہر ہو گئی اور وہ نہیں آیا۔ پھر شام ہو گئی اور وہ نہیں آیا۔ پھر ایک رات گزر گئی۔ اسی طرح ہوتے ہوتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ جون ایتھنز کے گلی کوچوں میں اُسے ڈھونڈتی رہی، مختلف راہبوں سے اُس کے بارے میں پوچھتی رہی مگر کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ راہب نے نہ کوئی تحریر چھوڑی تھی، نہ کوئی نشانی۔ جون تنہا رہ گئی۔ وہ اپنے کمرے کے در و بام تکتی رہتی تھی۔ "آہ تم اتنے عجیب نکلے۔" وہ بار بار اُسے پکارتی تھی مگر کسی سمت سے کوئی جواب نہیں آتا تھا۔ فلڈا کا راہب ایتھنز واپس نہیں آیا۔ جون کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اُس سے کچھ کہے بغیر اُسے ایک اجنبی مقام پر اس طرح تنہا چھوڑ کے کہیں جا سکتا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ وہ لوٹ کے ضرور آئے گا۔ وہ بڑی اُمید سے اُس کا انتظار کرتی رہی اور روزانہ ایتھنز آنے والے قافلوں کے پڑاؤ پر جانے لگی۔ وہ مسافروں سے اُس کا نام و نشان پوچھتی رہی لیکن کسی نے اُس خوش قد، خوش نگاہ اور سُرخ و سفید نوجوان راہب

کو نہیں دیکھا تھا۔ جون پھر بھی مایوس نہیں ہوئی۔ اُس نے اُس کی تلاش میں ایتھنز سے نکلنے کا ارادہ کیا اور نکل بھی گئی مگر ایک قافلے کے ساتھ ایک منزل تک جا کے جلد ہی واپس ایتھنز آ گئی۔ اپنی موجودہ وضع قطع کے ساتھ کسی قافلے میں سفر کرنے سے اُس کے لیے اور مشکلیں کھڑی ہونے کا اندیشہ تھا۔ وہ قافلے سے علیحدہ بھی نہیں جا سکتی تھی۔ راستے میں رہزنوں کا خطرہ تھا کہ کہیں وہ اُس کا پیرہن تار تار نہ کر دیں۔ اب اُسے اپنے بدن میں اِس لباس سے کانٹے چبھنے لگے تھے مگر ایتھنز والوں نے اُسے ایک مرد راہب کی حیثیت سے شناخت کیا تھا اس لیے اُسے اپنے راہب کے انتظار کی مدت تک اسی لباس میں رہنا تھا۔ راہب نہیں آیا۔ اُسے شاید واپس آنا ہی نہیں تھا۔ جون اپنے اندر تڑپا ہوتی رہی۔ اُس نے اپنا موجودہ لباس اتار کے کہیں اور نکل جانا چاہا مگر وہ تنہا کہاں جاتی؟ ایک حسین عورت کبھی تنہا سفر نہیں کرتی اس لیے اُسے اپنے موجودہ لباس ہی میں مرد بن کے بھی رہنا تھا اور راہب بن کے بھی تاکہ وہ حریص نگاہوں کی دست بُرد سے محفوظ رہ سکے۔

♥

کئی ماہ گزر گئے۔ جون نے پھر سفر کا عزم کیا۔ وہ تمام خدشوں کے باوجود ایک قافلے میں شامل ہو گئی۔ راہبانہ لباس کے باعث قافلے میں اُس کا عزت سے خیر مقدم کیا گیا۔ اُس کی خاموش طبعی نے لوگوں کو اُس کی طرف زیادہ رجوع ہونے سے باز رکھا۔ چند ایک مسافروں نے سفری معمول کے مطابق اُس سے کچھ سوالات کیے مگر جون کے اُکھڑے اُکھڑے سرسری جوابات نے اُنھیں خاموش کر دیا۔ اس طرح وہ قافلے کے ساتھ اطمینان سے سفر کرتی رہی اور ایک چھوٹی سی آبادی میں پہنچی۔ یہاں اُسے راہب کا سراغ لگانے کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی مگر راہب ملا نہیں۔ جون ایک رات قیام کر کے علی الصباح جانے والے دوسرے قافلے کے ساتھ ایک دوسرے شہر روانہ ہو گئی۔ دوسرے شہر میں بھی محرومی اُس کی منتظر تھی۔ جون نے اپنے شہر ایتھنز واپسی کا ارادہ کیا۔ اُسے یقین تھا کہ بوڑھی ماں کو اپنی پہلی بیٹی کی طرح دوسری بیٹی کی واپسی کا بھی یقین ہو گا اور اُس کے کان دروازے پر لگے رہتے ہوں گے۔ شہر والوں سے بھی جون کو یہ اُمید تھی کہ وہ اُس کے دوبارہ پہنچنے کی خوشی میں اُسے معاف کر دیں گے لیکن جون ایتھنز جا کے کیا کرتی جہاں راہب کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا اور راہب کے بغیر اُسے ساری دُنیا سُونی نظر آتی تھی۔

جون مختلف قافلوں کے ساتھ شہروں شہروں بھٹکتی رہی۔ قافلوں کو اُن کی منزلِ مقصود مل جاتی تھی لیکن جون کو اُس کا گوہرِ مقصود نہیں ملتا تھا۔ اُس نے اپنے تلوے گھس گھس کے لہولہان کر لیے۔ وہ دشت و بیاباں کی دھول میں چھپتی ہوئی ماری ماری پھرتی رہی۔ مختلف بستیوں کے چراغ اُس کی آنکھوں میں چبھتے رہے مگر اُس کے لیے ہر جگہ اندھیرا رہا۔ بس اُمید کی ایک کرن تھی، اُسی کے سہارے وہ آگے بڑھتی رہی۔ اسی طرح ہفتوں مہینوں بھٹکتی ہوئی وہ راہبوں کے شہر روم پہنچ گئی۔ اُس کی اُمید دم توڑ چکی تھی تاہم اُس نے یہاں بھی راہب کی تلاش جاری رکھی۔ روم اُس زمانے میں بھی عیسوی اقتدار کا مرکز تھا۔ روم پہنچتے ہی جون نے پھر خود کو راہ گیروں کے سامنے رسوا کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں سرگرداں رہی مگر کسی نے وہ جواب نہیں دیا جسے سننے کے لیے وہ بے قرار تھی۔ آخر ایک بوڑھے شخص کو اس نوجوان لڑکے کی حالتِ زار پر ترس آ گیا۔ وہ کتنی ہی بار اسے اپنی گلی سے گزرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ "اے پاک صورت راہب!" اُس نے جون سے شفیق لہجے میں کہا۔ "یہاں تُو کسے ڈھونڈ رہا ہے؟ یہ روم ہے، ایک جنگل، ایک سمندر اور جو حلیہ تُو بیان کرتا پھر رہا ہے وہ تو اِس شہر کا عام لباس ہے کیونکہ یہ زمین پاپائے اعظم کا آسمان کہلاتی ہے۔ بھلا تُو کہاں سے آیا ہے؟"

"انگلستان سے۔" جون نے تڑپ کے کہا۔

"اور وہ تیرا کون ہے جس کی تجھے تلاش ہے؟" بوڑھے نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ جون اُسے کیا بتاتی کہ وہ اُس کا کون ہے۔ اُس نے دل سوزی سے کہا کہ وہ اُس کا ہم سفر تھا جو راستے میں بچھڑ گیا۔ جون کی باتوں نے بوڑھے کو بہت متاثر کیا۔ وہ اُسے اپنے گھر لے آیا۔ یہاں وہ تنہا رہتا تھا۔ اُس نے اپنے مختصر گھر کا ایک حصّہ جون کو دے دیا اور کہا۔ "اب اگر تجھ میں ہمت ہے تو اُس کا انتظار کر مگر پیارے راہب! انتظار کرنے والوں کو بڑے تحمل، بڑی برداشت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اُن کی آنکھیں اگر پریشان ہو جائیں تو وہ کسی کو نہیں ڈھونڈ سکتیں۔" جون نے بوڑھے کی چھاؤں میں بہت دنوں بعد ایک نرم رات گزاری۔ دوسرے روز بوڑھا اُسے مختلف گرجاؤں اور کلیساؤں میں لے گیا لیکن جون کو کہیں وہ سر نظر نہیں آیا جو اپنے شانوں کا بوجھ بنا ہوا تھا۔ بوڑھا بھی جون کے کھوئے ہوئے دوست کی تلاش میں ایسی دلچسپی لے رہا تھا جیسے اُس کا اپنا کوئی عزیز کھو گیا ہو۔ ایک شام دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد جون اور بوڑھا تھکن سے چُور ہو کے گھر لوٹے۔ جون بہت دل برداشتہ تھی، اُس نے وحشت میں بوڑھے سے کہا۔ "بابا! تمھارا سکون بھی میری وجہ سے پامال ہوا، اس ضعیفی میں تمھیں کہاں کہاں بھٹکنا پڑا۔ اب مجھ میں تمھیں اور پریشان کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ مجھے جانے دو۔"

"کہاں؟" بوڑھے نے تعجب سے پوچھا۔

"کہیں بھی۔ اس شہر کے دروازے مختلف سمتوں میں کھلتے ہیں۔"

"کیا اس شہر سے اچھا بھی کوئی شہر ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"نہیں، یہ شہر بہت اچھا ہے۔ یہاں تم جیسے نیک لوگ رہتے ہیں مگر بابا! یہاں شور بہت ہے۔ یہ شور میرے کانوں میں جھنجھناہے اور یہاں بہت چمک دمک ہے۔ یہ چمک دمک میری آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے۔"

بوڑھے نے اُسے سمجھایا۔ "تم نے بہت خاک چھان لی۔ بہتر ہے کہ اب کچھ دنوں کے لیے سفر کی گرد جھاڑ کے آرام کرو۔ روم بڑا مہربان شہر ہے تم اس کی مہربانی سے فائدہ اُٹھاؤ۔ یہاں لوگ جانے کے لیے نہیں آتے۔ تم بھی یہ خیال دل سے نکال دو اور اپنا غم مصروفیت میں لپیٹنے کی کوشش کرو اور انتظار کرو۔ یہ روم ہے یہاں راہب اور مبلغ آتے ہی رہتے ہیں۔ ممکن ہے

کبھی وہ بھی آجائے۔ اُسے بھی تو تمھاری تلاش ہوگی۔ اگر تمھیں یہ توقع نہیں ہے تو بہتر ہے اُس کے خیال سے عاری ہو جاؤ اور اپنا منصب پہچانو۔"

جون اُس کے سامنے رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس کی سسکیاں اُس کے اندر گھٹ کے رہ گئیں۔ آدمی جھوٹے آنسو بہا سکتا ہے مگر سچے آنسوؤں میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ بوڑھے کی رفاقت میں بہت احتیاط رکھتی تھی کہ اُس کی تجربہ کار آنکھیں کہیں اُس کا بہروپ نہ پہچان لیں۔ چند روز تک وہ بوڑھے کے گھر میں خاموش زندگی گزارتی رہی پھر اُس کے مشورے پر اُس نے روم کی ایک مشہور درس گاہ میں جانا شروع کر دیا، یہاں اُس نے اپنی تعلیم کا از سرِ نو آغاز کیا لیکن تدریجی مراحل نئے سرے سے طے نہیں کیے۔ وہ اپنے ہم جماعتوں کے برعکس بہت تیزی سے انتہائی مختصر مدت میں علم کے زینے طے کرتی رہی۔ لوگوں کو سر اُٹھا اُٹھا کے اُس کی طرف دیکھنا پڑتا۔

وہ اگرچہ ایک نوعمر لڑکا سمجھی جاتی تھی لیکن اُس کے چہرے پہ ایک نسائی نرمی تھی۔ ایک صباحت، ایک معصومیت تھی۔ اُس کے ساتھی اور اساتذہ اُس کے جمال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نیز اُس نے اپنی ذہانت اور لیاقت سے بھی سبھی کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا مگر وہ خود سب سے کھنچی کھنچی، دُور دُور رہتی تھی۔ درس گاہ آنا اور سیدھے گھر واپس جانا اُس کا معمول تھا۔ اُس کے اس امتناع نے بھی لوگوں کے لیے اُس میں عجیب کشش پیدا کر دی تھی۔ ایک روز اُس کے کسی ساتھی نے اظہار کی جرأت کر ہی دی۔ اُس نے رشک سے کہا: "جون! سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھاری ذات میں وہ کیا رمز ہے جو سبھی کو تمھارا دل دادہ بنائے ہوئے ہے۔ لوگ بے اختیار تمھاری طرف لپکتے ہیں۔"

جون نے خاموشی سے اُس کی بات سُنی اور ایک بُجھی ہوئی مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکی اور جلدی جلدی اپنے ساتھی سے آگے نکل گئی۔ اُس کا ساتھی جون کی پلکوں کا چراغاں نہ دیکھ سکا۔

درس گاہ سے اُسے بہت مختصر عرصے میں امتیاز و اعزاز کے ساتھ فارغ التحصیل کر دیا گیا۔ پیچھے رہ جانے والے ساتھیوں کی نیک خواہشیں، اساتذہ کی دعائیں اور سفارشیں اُس کے ساتھ تھیں۔ اس زادِ سفر کے ساتھ وہ درس گاہ سے رخصت ہوئی۔ آبادی سے باہر روم کی ایک بہت بڑی خانقاہ تھی۔ اُس کا نام سینٹ مارٹن تھا۔ وہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں ادب، فنون اور مذہبی علوم کی اعلا تعلیم دی جاتی تھی۔ جون ایک راہب کی حیثیت سے سینٹ مارٹن میں داخل ہو گئی۔ یہاں تدریس و خطابت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا مگر وہی ہوا جس کا جون کو خوف تھا، جون کی ساحرانہ خطابت نے ایک بار پھر دُور دُور تک آگ لگا دی۔ لوگ دُور دُور سے اُسے سُننے اور دیکھنے کے لیے کشاں کشاں آنے لگے مگر وہ نہیں آیا جس کا جون کو انتظار تھا۔ جون کو ابھی تک اُس کا انتظار تھا۔ اب اُس کے کلام میں اور پختگی آگئی تھی۔ اُس کی آواز میں ایک سوختہ ارتعاش اور لہجے میں ایک جوشیلا عزم بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ خطابت کے لیے کھڑی ہوتی تو اُس کے کپکپاتے ہوئے لفظوں سے فضا گونج جاتی۔ اُس کی زبان سے جاری ہونے والے لفظوں میں موسیقی تو ہمیشہ سے رچی ہوئی تھی، اب اُس موسیقی میں ایک ایسا ملال بھی آگیا تھا جو سننے والے کا وجود لرزا دیتا تھا۔ روم کے شہری جوق در جوق اُس کی خطابت کا کرشمہ دیکھنے آتے تھے اور ڈگمگاتے ہوئے واپس جاتے تھے۔ روم کی گلیوں میں اُن دنوں بس ایک راہب کا تذکرہ تھا جس کی عمر کم تھی، چہرہ نور سے لبریز تھا، آواز ایک بجلی تھی اور جس کے ذہن سے علم کا چشمہ بہتا تھا۔

جون کا شہرہ پورے روم میں پھیل گیا۔ مسیحی اقتدار کے ایوان بھی اُس کی گونج سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پاپائے اعظم لیو چہارم کی خدمت میں اس نوعمر راہب کا تذکرہ نہایت اشتیاق سے کیا گیا۔ سینٹ مارٹن کے بعض راہب پاپائے اعظم کے دربار تک رسائی رکھتے تھے۔ اُن میں ایک راہب نارمن بھی تھا۔ نارمن اکثر کہتا تھا کہ جون جیسے عالم اور طباع راہب کو تو کلیسائے روم میں ہونا چاہیے۔ ایک شام وہ معمول کے مطابق پاپائے اعظم کے قصر سے لوٹا۔ اُس کا چہرہ مسرت سے کھلا جا رہا تھا۔ وہ سیدھا جون کے حجرے پہنچا۔ جون نے اُس کی دستک پر اپنا حلیہ ٹھیک کیا اور دروازہ کھول دیا۔ نارمن کسی تمہید کے بغیر جوش میں بولا: "عزیز برادر! مبارک ہو۔" جون حیرانی سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ نارمن نے صلیب کو بوسہ دیا: "جون! تم پر خداوند کا کرم رہے، تمھارے تذکروں نے پاپائے اعظم کے قصر کی فصیل عبور کر لی ہے۔ ایک راہب کو اُس کا اصل مقام ملنے والا ہے۔ مقدس پاپائے اعظم نے آج عبادت کے بعد اشارۃً تمھارا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے پوچھا، عزیزو! سُنا ہے، تمھاری خانقاہ میں انگلستان سے ایک نوجوان راہب آیا ہوا ہے، کہتے ہیں کہ اُس کی تقریر عالمانہ اور آواز دل نشیں ہے۔ ہم اُس سے ملاقات کے متمنی ہیں۔" نارمن نے جوش سے اُس کا ہاتھ دبایا: "جون! ایک بھائی! مقدس پاپا نے یہ ذکر نہایت اشتیاق اور محبت سے چھیڑا تھا اور یہ ہم سب کے لیے افتخار کی بات ہے مگر میں افسوس سے کہوں گا کہ ہمارے بعض رفقا نے پاپائے اعظم کے سامنے تمھارے ذکر میں بخل سے کام لیا۔ انھوں نے ایک ناروا سکوت اختیار کیا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا، میں نے ہاتھ اُٹھا کے کہا، میں گواہی دیتا ہوں کہ عالی مرتبت پاپا نے جو کچھ سُنا ہے اُس کی تردید کی گنجائش نہیں ہے۔ انگلستان کے اُس راہب کا نام جون ہے۔ اُس کے کلام میں بلاغت ہے اور اُس کا لہجہ فصیح ہے، یہ سن کے پاپائے اعظم نے کہا کہ ہم اُس سے ملاقات کرنا پسند کریں گے۔"

پاپائے اعظم کی عظمت اور عیسوی اقتدار کے سب سے بڑے مرکز پاپائے اعظم کے قصر کی شوکت جون کے لیے بھی زبردست کشش رکھتی تھی۔ وہاں کمال کے لوگ موجود تھے، زمانے کے منتخب، فکر کی بھٹی میں تپے ہوئے دانا۔ پاپائے اعظم کے قصر میں داخلہ کسی بھی راہب کے لیے ایک بہت بڑی فضیلت کا درجہ رکھتا تھا۔ جون نے اپنے ساتھی نارمن کی بات سنی اور آب دیدہ ہو کے کہا: "محترم برادر! آسمان آپ کو رحمتوں سے نوازے کہ آپ نے پاپائے اعظم کے حضور اس عاجز کو یاد رکھا۔ میں جو کچھ بھی ہوں وہ جمالِ ہم نشیں ہے

میں اپنے تمام عجز کے ساتھ پاپائے اعظم کے قصر میں جاؤں گا۔"

یہ ایوان جون کے خیالوں اور خوابوں سے زیادہ پُرشکوہ تھا مگر وہ ایک بڑا سفر کر کے یہاں تک پہنچی تھی اور پُورے التزام سے آئی تھی اس لیے اُس کے پیروں میں لرزیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ اُسے عزّت و احترام سے پاپائے اعظم کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا۔ وہ دو زانو ہوگئی۔ پاپائے اعظم نے اُسے دیکھا تو بے ساختہ مسکرا کے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا مگر جون نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی تو پاپائے اعظم کی آنکھوں میں حیرت اور مسرت کی چمک اُبھری۔ جون نے سر جھکا کے اپنی دل نشیں اور پُر وقار آواز میں اُسے ادب سے مخاطب کیا۔ "انگلستان کا راہب جون، مقدس پاپائے اعظم کو تعظیم پیش کرتا ہے، آج کا سورج اُس کی زندگی میں ایک عظیم سعادت لے کے طلوع ہوا ہے۔" پاپائے اعظم نے غور سے اُس کا جائزہ لیا۔ جون کی شکریں زبان اپنا تعارف پیش کرنے لگی۔

جون کا بیان ختم ہوا تو پاپائے اعظم کا چہرہ دمک رہا تھا۔ "عزیز راہب!" اُس کی باوقار آواز ایوان میں گونجی۔ "تمھیں دیکھ کے مسرّت ہوئی اور روم کی جوہر شناسی پر ہمارا اعتماد بحال رہا۔ خداوند تمھیں سُرخ رو رکھے۔ تمھیں تمھارا صحیح مقام ضرور دیا جائے گا۔" جون نے سر جھکا دیا۔

یہ ملاقات مختصر تھی مگر اس کے نتائج دیرپا ثابت ہوئے۔ اُسی روز پاپائے اعظم کے قصر سے ایک فرمان جاری کیا گیا کہ "سینٹ مارٹن کے نوجوان راہب جون کو پاپائے اعظم لیو چہارم کے مقربین میں شامل کیا جاتا ہے۔"

روم والوں کے لیے یہ ایک بڑی خبر تھی، ایک نوجوان راہب مسیحیت کے سب سے بڑے ایوان میں داخل کیا گیا تھا۔ سینٹ مارٹن کے راہبوں نے جون پر پھولوں کی بارش کی۔ راہب نارمن سب سے زیادہ خوش نظر آ رہا تھا۔ اُس نے رقّت زدہ آواز میں جون کو الوداع کہا۔ "ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے خوش بخت رفیق جون ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔" جون نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ خانقاہ کے رفیق اُسے پاپائے اعظم کے قصر تک پہنچانے گئے پھر جون اُن کی نظروں سے دُور ہوگئی۔

قصرِ پاپا میں جون کا داخلہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز سب سے بڑا ثمر تھا۔ وہ خود کو فراموش کر کے شب و روز کام کرنے لگی اور اُس کی کارکردگی نے صرف چند روز میں یہ ثابت کر دیا کہ اُس کا انتخاب غلط نہیں کیا گیا تھا۔ اُس نے اپنے مذہب اور روم میں عیسوی اقتدار کی سربلندی کے لیے غیر معمولی خدمات انجام دینی شروع کیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ لیو چہارم کے قریب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس کی خدمات کے اعتراف میں پاپائے اعظم اُسے بعض اہم اور محرمانہ فرائض بھی تفویض کرنے لگا۔ جون کی خوبیاں کلیسا کے ایوانوں میں اور زیادہ جولانی پر آگئیں، وہ جانتی تھی کہ آدمی وہی کچھ ہوتا ہے، جس کا وہ ثبوت پیش کرتا ہے، بے ثبوت آدمی کچھ نہیں ہوتا چنانچہ وہ ہر قدم پر رومی کلیسا کے بڑے عہدے داروں کے سامنے اپنی برتری کے ثبوت پیش کرتی رہی۔ اُس نے اپنے انتخاب کے جواز میں اپنی ذہانت اور قوّتِ کار کے حیرت انگیز مظاہرے کیے۔ اُس نے لیو چہارم کو مایوس نہیں کیا۔ جو حسن اُس کے چہرے پر تھا، اُسی کا جلوہ اُس کی خدمات میں بھی نظر آتا تھا۔ لیو چہارم مستعدی اور ذہانت کے لیے برملا جون کی مثالیں دینے لگا۔ پاپائے اعظم کی زبان میں بڑی تاثیر تھی۔ نوجوان جون کی شہرت سارے روم پر چھا گئی۔

مگر جون! خود جون جب تھکی ہاری اپنی خلوت کے ایوان میں آتی تو اپنے آپ کو ڈسنے لگتی اُس کا لباس اُس کی ہنسی اُڑاتا۔ یہ احساس اُسے سوگوار کر دیتا کہ وہ عظمت و شہرت کے ایک بڑے درجے پر فائز ہے۔ وہ سسکیاں بھرنے لگتی اور کوئی ایسا نہ ہوتا جو اُس کے آنسو خشک کرتا اور اُسے اپنا گداز سونپتا۔ جون گداز آشنا تھی۔ جون نے ایک دُنیا کا نہیں، دونوں دنیاؤں کا جلوہ دیکھا تھا۔ وہ نہیں آیا جس کے لیے اُس نے یہ بہروپ بھرا تھا۔

قصر میں اُسے بہت زیادہ محتاط رہنا پڑتا تھا، اپنے حلیے، اپنی چال اور اپنی رفتار میں محتاط۔ گو جون اب ان احتیاطوں کی عادی ہوگئی تھی مگر وہ بہت جلد نڈھال ہو جاتی تھی اور اُس کے ذہن سے یہ کرب ناک احساس بھی چمٹا رہتا تھا کہ اُس کی بابت پاپائے اعظم لیو چہارم کے فیصلے قصر کے بعض عہدے دار ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ جون نے انھیں اُن کے مرتبے کے مطابق ہمیشہ تعظیم پیش کی تھی مگر وہ اُس کے درپے تھے۔ جون کو معاصرین کے درمیان رہنے کا تجربہ حاصل تھا اور اُسے معلوم تھا کہ اُس کے چہرے کی زیبائی اور اُس کی عمر ہی اُس کی دشمن ہے۔ جون کے معاملے میں پاپائے اعظم کے رویّے سے بہت سوں کو اختلاف تھا۔ اس اختلاف میں کارڈنل اناسٹس سب سے آگے تھا۔ جون نے ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کے کام کرنے کا وتیرہ اختیار کر لیا تھا لیکن اُس کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں پڑ جاتی تھیں۔ وہ اپنے جھوٹ سے پہلے ہی دل برداشتہ تھی، اب اختلاف کی شدت نے اُس کا حوصلہ اور پست کر دیا۔ آخر تنگ آ کے جون نے قصر سے کہیں دُور ہو جانے کا عزم کر لیا لیکن اتفاق سے اُنھی دنوں اطلاع آئی کہ روم پر دشمن نے یلغار کر دی ہے اور دشمن تیزی سے پاپائے اعظم کا اقتدار چھین لینے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ اُس وقت پاپائے روم کا قصر ہی روم کی تمام طاقت کا منبع اور سیاسی و سماجی امور کا مرکز تھا۔ حملے کی خبر سے قصر کے در و بام پر اضطراب اور تشویش کے بادل چھا گئے، پاپائے اعظم نے اپنے خاص مقربین سے مشورت کرنے کے لیے انھیں طلب کر لیا۔ اُن میں جون بھی شامل تھی۔ وہ خاموشی سے تمام روداد سنتی رہی اور کوائف و نتائج کا جائزہ لیتی رہی پھر اُس وقت سب حیران رہ گئے جب اُس نے اپنی نشست سے اُٹھ کے پاپائے اعظم سے مودّبانہ یہ درخواست کی کہ وہ رومی فوجوں کی کمان اُسے سونپ دیں۔ یہ درخواست اتنی حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھی کہ پاپائے اعظم پر چند لمحوں کے لیے سکوت طاری ہو گیا مگر جون کے لہجے سے عزم نمایاں تھا۔ اس نازک وقت میں کسی روزن سے ذرا سی کرن بھی آجاتی، وہ روم کے عیسوی اقتدار پر چھپٹا ہوا اندھیرا دُور کرنے کے لیے بڑی وقعت رکھتی تھی۔ پاپائے اعظم نے جواز

پر تشویش نگاہ ڈالی۔ اختلاف کرنے والے اس موقع پر بھی اپنے شعار سے باز نہ آئے۔ کارڈنل اناسٹس نے پاپائے اعظم کے فیصلے سے پہلے ہی جون کی تجویز مسترد کر دی۔ اُس نے کہا کہ "برادرم جون ابھی نوجوان ہیں اور انھیں جنگی معاملات کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔ روم ایک ناآموز اور ناپختہ نوجوان کے شوقِ معرکہ آرائی کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ ہم ایک سنگین صورتِ حال سے دوچار ہیں۔" اُس کے لہجے میں کسی قدر برہمی تھی۔

قصر کے بعض دوسرے عہدے دار بھی کارڈنل کی تائید میں تھے۔ پاپائے اعظم نے تمام تجاویز اور آرا غور سے سُنیں مگر اپنا فیصلہ سُنا کے سب کو دنگ کر دیا۔ اُس نے جون کو رومی فوجوں کی کمان سونپنے کا اعلان کیا اور بلند آواز سے کہا "روم بچ گیا، روم بچ گیا۔" پاپائے اعظم کے فیصلے سے اختلاف کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔

جون پر ایک بھاری ذمے داری آپڑی۔ روم کے کلیسا کا اقتدار قائم رکھنے کی ذمے داری اور پاپائے اعظم کے سامنے سُرخ رُوئی کا خیال۔ جون سپہ سالار سمیت تمام افواج کی قائد مقرر کر دی گئی تھی لیکن جنگ کے موقع پر اُس نے اپنا گھوڑا سپہ سالار کے گھوڑے سے آگے نہیں کیا اور جب میدان میں صف بندی سے قبل سپہ سالار نے جُھک کے جون کو اپنی تلوار پیش کی تو جون نے تلوار اُسے واپس کر دی "میرے برادر! یہ آپ کا زیور ہے آپ ہی پر سجتا ہے۔" جون نے فوج کے اجتماع کے بعد جنگ کے میدان میں اپنی زندگی کی سب سے بلیغ، سب سے فصیح اور سب سے ولولہ انگیز تقریر کی اور اپنے خیمے میں واپس چلی آئی۔ جب جنگ شروع ہوئی تو ساری بساط جون کے سامنے تھی اور وہ اپنے خیمے سے احکام جاری کر رہی تھی۔

پھر ابھی جون واپس روم کی حدود میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ شہریوں کا ہجوم دیوانہ وار اُس کے خیر مقدم کے لیے اُمڈ پڑا۔ پاپائے اعظم کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی تھی کہ روم بچ گیا۔ دشمن کے چمکتے ہوئے ہتھیار جون کی تابناک ذہانت سے شکست کھا گئے تھے۔ دشمن کا ایک بھی گھوڑا شہر کی فصیل عبور نہیں کر سکا تھا۔

اِس طرح پاپائے اعظم نے قصر نے جون کے پیروں میں پھر زنجیر ڈال دی۔ اس عظیم الشان کارنامے کے باعث روم کے ہر شہری کی زبان پر جون کا نام تھا۔ یہ مشہور ہو گیا تھا کہ جون کو خداوند نے روم کے لیے خاص طور پر مرحمت فرمایا ہے۔ فتح کے صلے میں پاپائے اعظم نے اُسے ایک اعلا منصب سے نوازا۔ وہ ریاست کی معتمد بنا دی گئی۔ قصر میں اُس کے پیر اور مضبوطی سے جم گئے۔ اُس سے اختلاف رکھنے والوں میں بیشتر اُس کے ہم نوا بن گئے لیکن کارڈنل اناسٹس نے قصر میں اُس کے گہرے ہوتے ہوئے رسوخ سے مفاہمت نہیں کی حالانکہ جون کی ترقی پر عوام اور عمّال کی ایک بڑی تعداد نے مسرت کا اظہار کیا تھا۔ جون اپنے نئے عہدے پر تن دہی سے کام کرتی رہی مگر اُس کے خلاف اناسٹس کا بنایا ہوا محاذ بھی زور پکڑتا گیا۔ وہ روم کا کارڈنل تھا۔ پاپائے اعظم کے منصب کے بعد سب سے بڑا منصب کارڈنل کا ہوتا ہے۔ جون نے کارڈنل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی مگر کارڈنل کا رویہ نرم نہیں ہوا۔ وہ کھلے عام جون کی مخالفت کرنے لگا۔ ہوتے ہوتے اس نزاع نے اتنا طول کھینچا اور کارڈنل اناسٹس جون کے اقبال سے اتنا برافروختہ ہو گیا کہ اُس نے پاپائے اعظم کا بھی خیال نہیں کیا۔

مگر جون کی تیز بینی نے جلد ہی اُس کے عزائم کا اندازہ لگا لیا۔ اناسٹس کے مقربین نے جون کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور کر دی تھیں مگر جون کی مستعدی ان افواہوں کے لیے ڈھال ثابت ہو سکتی تھی چنانچہ جون نے اپنی محنت اور خدمت سے مخالفوں کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ اناسٹس کا علم اور تجربہ یقیناً جون سے زیادہ تھا مگر اُس میں تحمل اور تدبر کی خوبی نہیں تھی اور وہ باریک بین نگاہ نہیں تھی، جس کی جون مالک تھی۔ جون میں ایک اور خوبی بھی تھی، اپنی صنف کی خوبی۔ ایک عورت کی حیثیت سے اُس کی نظر چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی جاتی تھی۔ جون نے اپنی اس خوبی سے فائدہ اٹھایا۔ اُس نے اناسٹس کے علاوہ تمام امرا اور اکابر کا نہایت خوردبینی مشاہدہ کیا اور بہت کم مدت میں اُن معززین کے ایسے ایسے راز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جو اگر افشا ہو جاتے تو انھیں اپنے گلے اپنے ہاتھوں سے گھونٹنے پڑتے۔ اس جستجو میں جون کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ اُس کا تو صرف ظاہری حلیہ بدلا ہوا ہے مگر قصر میں ان گنت ایسے اکابر موجود ہیں جن کا لباس تو اُن کی صنف ہی کے مطابق ہے لیکن اُن کے اعمال اُن کی حیثیتوں سے قطعی مختلف ہیں۔

اناسٹس کی تلخیاں مسلسل بڑھتی رہیں یہاں تک کہ جون اور جون کے محسن پاپائے اعظم کو نقصان پہنچنے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس مرحلے پر ایک روز جون کی طرف سے روم کے شہریوں کے لیے اچانک ایک ناقابلِ یقین بیان جاری ہُوا۔ یہ بیان کارڈنل اناسٹس کی منصبی نااہلی اور قابلِ اعتراض نجی سرگرمیوں کی ایک مبسوط فہرست تھا۔ یہ ایک مدلّل فردِ جرم تھی۔ اتنی موثر اور اتنی مکمل کہ روم کے لوگوں کو اس پر یقین کرنا پڑا۔ جون نے اس کی تیاری میں اپنی تمام تر قابلیت صرف کر دی تھی۔ اس استغاثے میں جوابِ دعوا کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اسے جون نے ترتیب دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اناسٹس کو سرکشی، بغاوت اور بدکرداری کے الزامات عائد کر کے نہ صرف معزول بلکہ جلاوطن کر دیا گیا۔ اناسٹس کو روم سے نکلنا پڑا۔ جون کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کارڈنل کا منصب خالی ہو گیا تھا۔

پورا روم جانتا تھا کہ اگر کوئی شخصیت کارڈنل کا خالی منصب بھر سکتی ہے تو وہ صرف جون ہے۔ جون پاپائے روم کے حکم سے کارڈنل بنا دی گئی۔ اُس کے سراپا پر کارڈنل کا سرخ لباس سج گیا۔ لمبا سرخ چغہ اور پھندنے والی سُرخ ٹوپی۔ جون کے رخساروں اور لباس کی سرخیوں نے مل کے کلیسائے روم کی دل کشی اور عظمت بڑھا دی۔ اب جون روم کی دوسری بڑی شخصیت تھی۔ پاپائے اعظم سے اُس کی قربت اور بڑھ گئی۔

دوسری طرف اناسٹس کی جلاوطنی سے تلخیوں کا سرچشمہ ہمیشہ کے لیے خشک ہو گیا۔

کارڈنل کا عہدہ جون کے نازک شانوں پر ایک بہت بڑی ذمّے داری تھا۔ اُس کی مصروفیات بے پناہ بڑھ گئیں۔ اُسے اتنی مہلت بھی نہیں ملتی تھی کہ وہ کبھی کبھی اپنے جاہ و حشم سے لطف اندوز ہو سکے۔

پھر یہ عہدہ سنبھالے ہوئے ابھی اُسے زیادہ مدّت نہیں گزری تھی کہ پاپائے اعظم لیو چہارم کا اچانک انتقال ہو گیا۔ جون کو دیکھ کے اُس نے بہت اطمینان سے کوچ کیا ہوگا۔ اُس زمانے میں روم کے سماجی و سیاسی حالات بہت نازک اور پیچیدہ تھے اس لیے پاپائے اعظم کے منصب کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جس کی داخلی اور خارجی حکمتِ عملی کے بارے میں کوئی اشتباہ نہ ہو۔ کوئی راہب اس سے بڑا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ روم کو ہر اعتبار سے ایک آزمودہ اور غیر جانب دار شخصیت کی ضرورت تھی چنانچہ اژدہام کی نگاہ متفقہ طور پر جون کی طرف اٹھی۔ یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ جون کو کارڈنل ہونے کے باوجود یقین نہیں آتا تھا۔ مسیحی دنیا کا تخت جون کے قدموں میں آگیا اور وہ ۸۵۵ء میں پاپائے اعظم جون ہشتم کے نام سے رومی سلطنت کے سیاہ و سفید کی مالک ہو گئی۔

جون کے پیش رو لیو چہارم کے جنازے کا جلوس قصر سے برآمد ہوا تو جون اُس کے ساتھ تھی۔ عوام نے جون کے قدموں میں پھول نچھاور کیے نیز امرا نے اپنے زرکار اور بیش قیمت ملبوس آنکھوں کی طرح اُس کے راستے میں بچھا دیے۔

پوپ کے دفاتر اور محلات روم کے بیچوں بیچ کئی میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی جون کی مسند نشینی ہوئی۔ اس وسیع و عریض علاقے کی گھما گھمی اور سرگرمیوں کا انداز بدل گیا۔ اس علاقے کا سکّہ زمین کے علاوہ آسمان پر بھی چلتا تھا۔ یہاں ایک طرف تو ملک و قوم کے مسائل سلجھائے جاتے، بادشاہتیں تقسیم ہوتیں اور دوسری طرف بخشش کے بشارت نامے اور جنّت کے پروانے بٹتے۔ غریب ہو یا امیر محکوم ہو یا حاکم سبھی اپنے اپنے کشکول لیے جون کی بارگاہ میں آتے اور مرادیں حاصل کر کے لوٹتے۔ جون نے چونکہ نیچے سے اوپر کی طرف بتدریج ترقّی کی تھی اس لیے اُسے ہر طبقے کی مشکلات کا بخوبی علم تھا۔ اُس نے اپنے زیردستوں کی فلاح کے لیے شب و روز محنت کی اور سب سے پہلے ملک کے معاشی حالات کی طرف توجّہ دی۔ پھر پوپ کا وہ خزانہ دوبارہ دولت سے معمور کیا جسے عربوں نے لوٹ لیا تھا۔ اس کے علاوہ جون نے ایسی تمام رسوم ختم کرنے کی کوشش کی جو محض خرافات پر مشتمل اور گناہِ بے لذت کے مصداق تھیں۔ اُس نے کلیسا کے اندر اور باہر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

پاپائے اعظم کے ماتحتوں اور غلاموں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ اُس کے دروازے پر غلاموں کے پرے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ جون کو اُن کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے بیشتر کام خود کرتی تھی۔ ماتحت اور خدام اُس کی خدمت کی آرزو ہی میں رہتے تھے۔ جون ایک خلوت نشین پاپائے اعظم کے طور پر مشہور ہو گئی تھی۔ کہا جاتا تھا، مقدّس پاپائے اعظم جون ہشتم کام زیادہ کرتے ہیں اور ملاقاتیں کم۔ جون نے اپنے گرد بھیڑ کم سے کم رکھی تھی۔ تاہم اُس کا عہدہ خلوت نشینی کا نہیں تھا۔ اُسے سلطنت کے مختلف عمّال سے ملنا ہی پڑتا تھا۔ اِن امور سے وہ جیسے ہی فارغ ہوتی اپنے حصار میں آ جاتی کیونکہ اُس کے لیے تخلیے کی چھت اور تنہائی کی دیواروں سے زیادہ محفوظ کوئی قلعہ نہیں تھا۔ پاپائے اعظم کے جلیل منصب پر متمکن ہونے کے بعد اُس کے ذہن کا سیماب کہیں ایک مقام پر ٹھیر گیا تھا، اُس میں ایک ٹھما ٹھما پن آ گیا تھا۔ یہ ایوان، یہ خدام، یہ جاہ و حشمت، یہ تقدّس اور عظمت ان تمام نعمتوں کے باوجود جب کبھی جون کو آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے کا موقع ملتا، اُس کا بدن ٹوٹنے لگتا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جانے کا ارادہ کرتی مگر اُس کا یہ عزم شرمندۂ عمل نہ ہوتا۔ کبھی وہ ایک نرم و نازک شعلہ نفس اور شیریں گفتار لڑکی تھی، کبھی نہیں بلکہ اب بھی تھی۔ وہی اُس کا جمال تھا جس میں اقتدار کی آمیزش نے ایک اور رنگ بھر دیا تھا۔ دل کشی، وقار، تمکنت، طنطنے اور پاکیزگی کا ملا جلا رنگ۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اُسے اپنی یاد کچھ زیادہ ہی آنے لگی۔ فلڈا کا راہب ابھی تک نہیں آیا تھا، نہ اُس کے آنے کی امّید باقی رہی تھی لیکن جون کو اب بھی اُس کا انتظار تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ اس طرح پاپائے اعظم جون ہشتم کی شخصیت ایک حسین عورت جون پر غالب رہی۔

فلڈا کا راہب نہیں آیا۔ جون کبھی کبھی پیچھے مُڑ کے دیکھتی تو اُسے اُس کی صورت کے سوا کچھ نظر نہ آتا — اُس کی زندگی کے میزان میں ایک ہی فرق رہ جاتا تھا۔ رومی کلیسا کی حکومت، زرّیں قصر اور قصر کی ساری دولت میزان برابر کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی مگر سب بے سود، جون کو کبھی کبھی اس خسارے کا دُکھ شدّت سے محسوس ہوتا تھا۔

اُنھی دنوں قصر کے منصب نشینوں کی ایک روایتی اور خصوصی تقریب منعقد ہونے والی تھی۔ جون مقررہ وقت پر باوقار انداز میں اپنے خاص ایوان سے جلوہ فرما ہوئی۔ سامنے صف بستہ غلام ایک قطار میں پتّھر کے اصنام کی طرح کھڑے تھے، ایک دیوار کی طرح۔ جون نے حسبِ معمول اُن کی طرف نظر نہیں کی۔ وہ اس دیوار سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی مگر ایک زینہ عبور کرتے وقت عبا سے اُس کا پاؤں اُلجھ گیا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ اُس کی نظر غیر اختیاری طور پر غلاموں کی جانب اُٹھ گئی اور اُسے دفعتہً ٹھٹک کے رُکنا پڑا۔ اگر وہ فوراً منہ پھیر کے دریچے سے باہر نہ دیکھنے لگتی تو ممکن تھا کہ اُس کا ملمع اتر جاتا — غلاموں میں اچانک اُسے وہ چہرہ نظر آ گیا تھا جسے فراموش کرنے کے

یلے اُس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا، جس کی وجہ سے اُسے ہمسری اور بے سرو سامانی میں ایتھنز سے بھاگ کے یہاں تک پہنچنا را تھا اور جس کے نشے میں وہ اتنی دُور چلی آئی تھی۔

وہ دریچے سے ہٹی اور کسی طرف دیکھے بغیر عاجلانہ قدموں سے دوبارہ اپنے خصوصی ایوان میں داخل ہوگئی۔ چند لمحوں بعد اُس کا انتظار رنے والوں نے یہ اعلان سُنا کہ "مقدس پاپائے اعظم نے آج کی تمام مصروفیات ملتوی کر دی ہیں۔"

جون خصوصی ایوان میں بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی اور ماضی کا ایک ایک لمحہ زہر خند کے ساتھ گردن اکڑائے اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ چند لمحوں تک وہ اپنے گرد و پیش سے یک سر غافل رہی۔ پھر ن کا بدن لرزنے لگا۔ وہ خود سے نظریں چُرا کے نکل جانا چاہتی تھی مر ہر جگہ خود ہی کو اپنے سامنے پاتی تھی۔ گزشتہ یادوں کے ساتھ بے شمار اندیشوں نے بھی اُس پر یلغار کر دی۔ اُس نے اپنی پیشانی پھٹتی ہوئی محسوس کی۔

"کیا یہ وہی ہے! یا یہ اُس کی آنکھوں کا مذاق ہے؟ اگر یہ ہی ہے تو اس نے اُسے شناخت کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ اتنی بدل ئی ہے؟ مگر وہ تو روز خود کو دیکھتی ہے، خود کو سنبھال کے رکھتی ہے ونکہ اپنا بدن اُس کی امانت سمجھتی ہے۔

وہ صبح و شام، وہ گنتی کے شب و روز جو فلڈا کے راہب نے س کی زندگی سے چھین لیے تھے، اُسے اُن کی بازگشت پھر سنائی دینے لگی۔ جون نے اس بازگشت کی دھمک سے بچنے کے لیے آئینہ دیکھنا بند کر دیا اور خلوت میں بھی پاپائے اعظم کا لبادہ اتارنے سے اجتناب برتنے لگی۔

اُس شخص کا نام بولڈا تھا۔ وہ جون کے حفاظتی دستے میں شامل تھا۔ جون کو کئی وجوہ سے یقین ہو گیا تھا کہ بولڈا اُس کا بچھڑا ہوا بے وفا راہب نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے لیکن وہ وجاہت اور خوب روئی میں اُس سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا تھا۔

صرف چند روز میں جون نے اُسے اتنی بار طلب کیا اور اتنی بار دیکھا کہ وہ اُس کی عادت بن گیا اور موجود نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے سامنے رہنے لگا۔ تنہائی پسند جون اُس کی اس حاضر باشی سے بُری طرح بیزار ہوئی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اُسے برطرف کر دے یا اُس کا تبادلہ کر دے لیکن جب بھی وہ اس سلسلے میں کوئی حکم جاری کرنا چاہتی، اُس کی زبان اُس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی۔ اُس نے تحریری حکم بھی لکھنا چاہا مگر اُس کی انگلیاں کپکپانے لگیں۔ انتشار کے عالم میں جون نے کئی موقعوں پر اُس کی طرف آنکھوں کی چنگاریاں برسائیں، اُسے تلخی سے مخاطب کیا، یہاں تک کہ دھتکارا بھی لیکن بولڈا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جون کا خیال تھا کہ ان سختیوں سے گھبرا کے بولڈا خود اُس کی خدمت سے کنارہ کش ہو جائے گا مگر بولڈا نے اُسے سخت مایوس کیا۔ وہ ایسے موقعوں پر پہلے سے زیادہ لیشہ خطلی اور عاجز ہو کے اُس سے معذرتیں کرنے لگتا نیز اُس کی مستعدی مزید بڑھ جاتی۔ آخر جون کر اس نتیجے پر

پہنچا پڑا کہ وہ پاپائے اعظم کے جلیل منصب سے کنارہ کش ہوسکتی ہے لیکن بولڈا اُس کی غلامی سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ جون کا اجتناب تو اُس کے لیے مہمیز ثابت ہوتا تھا۔ وہ تیزی سے متحرک ہوجاتا اور اُس کی آنکھیں ہنسنے لگتیں۔ جون تھک گئی۔ اُسے بولڈا پر ترس آنے لگا اور اُس نے اُسے ترقی دے کے اپنا دربان مقرر کرلیا۔

بولڈا ایک انتہائی فرض شناس اور معتبر شخص نکلا۔ اُس نے ہر لحاظ سے خود کو جون کی قربت کا اہل ثابت کردیا۔ اب جون جہاں جاتی، بولڈا اُس کی جلو میں سب سے نمایاں رہتا۔ اُس کی راتیں جون کی خواب گاہ سے ملحق ایوان میں بسر ہوتیں۔ کام کے اوقات میں وہ دفتر کی دربانی کرتا چنانچہ ہر شخص کو جون تک پہنچنے کے لیے بولڈا کے زینے سے گزرنا پڑتا تھا۔ جون کے پاس بولڈا کی کسی بات سے ناخوش ہونے کا جواز نہیں تھا۔ بولڈا نے اُسے ناخوش ہونے کی مہلت ہی نہیں دی تھی پھر بھی جون اکثر شدید برہم ہوجاتی تھی کیونکہ اُس کی دانست میں بولڈا خود تو بہت آگے آگیا تھا لیکن جون کو اُس نے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ جون جب بولڈا پر نظر ڈالتی تو پاپائے اعظم کے تمام احساسِ جلال کے باوجود وہ اپنے باطن میں مچلتی ہوئی بغاوت فرو کرنے میں ناکام ہوجاتی۔ اُس کے سامنے بار بار ایک شکوہ بلب دوشیزہ آجاتی، وہ دوشیزہ جس نے سب کچھ ترک کرکے صرف ایک نوجوان کو اپنا شہر، اپنا خاندان اور اپنا گھر بنایا تھا۔

ایک دن پاپائے اعظم کے قصر سے ایک اور اعلان ہوا۔ پاپائے اعظم نے اپنے دربان بولڈا کو اپنا حاجب مقرر کرلیا تھا۔ مقدس پاپا کے اس حکم پر کسی میں خیال آرائی کی مجال نہیں تھی کیونکہ جون نے اناٹس کی سرکشی کے بعد تمام کلیدی عہدوں پر اپنے معتبر لوگ متعین کردیے تھے لیکن بولڈا کی تیز رفتار ترقی سے سب کو حیرت ہوئی۔ روحی کلیسا میں سب سے زیادہ اہمیت روایتوں کو حاصل تھی۔ جون نے کوئی روایت شکنی نہیں کی تھی تاہم جون کے تازہ حکم پر کلیسا کے عہدے داروں نے تذبذب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حاجب کی حیثیت سے بولڈا کو پاپائے اعظم سے اور قریب ہونے کا موقع ملا۔ جون نے امتحاناً اُسے بعض رازدارانہ امور سونپے۔ بولڈا نے ہر مرحلے پر خود کو ایک معتبر اور با اعتماد شخص ثابت کیا چنانچہ جون اُسے زیادہ تر اپنے سامنے رکھنے لگی۔ آخر وہ فلڈا کے راہب کا پرتو تھا، وہ اُس کے گزرے ہوئے دنوں کا خواب تھا۔ حاجب بولڈا کے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہوسکتی تھی کہ وہ پاپائے اعظم کی رفاقت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارے۔ اُس سے جون کا تخاطب بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ اُسے حکم دیتے وقت پاپائے اعظم کا پرشکوہ لہجہ اختیار نہیں کرتی تھی مگر بولڈا نے شب و روز کی قربت کے باوجود اُس کا احترام ترک نہیں کیا۔ جون کا نرم سلوک اُس نے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھا۔

پھر اُس وقت بولڈا پر حیرتیں ٹوٹ پڑیں جب جون نے بعض معاملات میں اُس کی رائے درخورِ اعتنا قرار دی۔ جون نے قصر سے باہر کے اور اندر کے حالات سننے کے لیے حاجب بولڈا کی سلی ہوئی زبان کے ٹانکے اُدھیڑے اور اُس کی ذات میں اعتماد کا تخم پھینکنے کی سعی کی پھر بھی بولڈا، فلڈا کا شعلہ نفس راہب نہیں بن سکا۔ جون کو احساس ہوا کہ وہ بہت دور ملی آئی ہے لیکن حاجب بولڈا اتنی رفاقت کے باوجود اُس سے بہت فاصلے پر کھڑا ہے۔ ایک دن بولڈا اُس کے پاس سر جھکائے ہوئے مودّب کھڑا تھا۔ جون نے اُسے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ حاجب کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جون نے اُسے اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی تھی۔

اسی طرح رفتہ رفتہ بولڈا اُس سے قریب ہوتا گیا۔ اس تدریج کر قصر میں جون کے مقرر کیے ہوئے اہم عہدے داروں کو جون سے تخلیے میں ملنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جون نے خاص اپنے بھی بعض فرائض ماتحتوں میں تقسیم کردیے تاکہ وہ اُس سے ملنے کی کم سے کم کوشش کریں اور حاجب بولڈا زیادہ سے زیادہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہ سکے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ حاجب بولڈا سے زیادہ پاپائے اعظم کا مقرب کوئی شخص نہ رہا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا لیکن اتنی تیزی سے نہیں گزر رہا تھا جتنا جون محسوس کررہی تھی۔



پاپائے اعظم کا قصر رات کے بارے میں ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے زمین کے کسی ویران خطے میں سنگِ سیاہ کا ہیبت ناک پہاڑ کھڑا ہو۔ قصر کی بیشتر آبادی رات کے سبزے پر محوِ خرام تھی اور اندرونی ایوانوں کے اندر، جہاں مسلح محافظوں کے سوا کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی، وہاں جون شمع کی طرح جل رہی تھی۔ وہ دیر تک اپنی وسیع خواب گاہ میں گشت کرتی رہی پھر اُس نے بے چین ہوکے دروازہ کھولا اور تیز تیز قدموں سے ایک دوسرے دروازے پر پہنچ گئی۔ اُسے خیال ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں آگئی ہے۔ بولڈا کی خواب گاہ اُس کی خواب گاہ سے دور نہیں تھی۔ محل کے اس حصے میں پہرے دار بھی نہیں آسکتے تھے۔ جون کو بولڈا کے دروازے پر دستک نہیں دینی پڑی۔ دستک کی آواز اُس کے دل کی دھڑکن سے بڑی نہیں ہوسکتی تھی اور دستک ہمیشہ بند دروازوں پر دی جاتی ہے۔ بولڈا کا دروازہ تو کھلا ہوا تھا اور کھلے دروازوں میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ جون کی طرح حاجب بولڈا بھی جاگ رہا تھا جیسے اُسے پہلے سے اندازہ ہو کہ پاپائے اعظم کی جانب سے کسی وقت بھی طلبی ہوسکتی ہے۔

پھر جون کو اُس وقت ہوش آیا جب وہ دوبارہ اپنی خواب گاہ میں تھی۔ ہوش آتے ہی اُس نے ہڑبڑا کے اٹھنا چاہا مگر وہ اپنے بستر پہ نہیں بلکہ بولڈا کے بازوؤں پر لیٹی ہوئی تھی اس لیے کوشش کے باوجود اٹھ نہیں سکی۔ اُس کے بدن میں لرزش پیدا ہوئی اور اُس نے خواب ناک آواز میں حکم دیا۔ "روشنی کی آنکھیں پھوڑ دو۔"

بولڈا نے اُسے احتیاط سے بستر پہ سجا دیا اور ایک ایک کرکے خواب گاہ کے تمام فانوس بجھا دیے۔ پھر جون اندھیرے کی سفارش سے

ستہ آہستہ بولڈا پر روشن ہونے لگی۔ اور بولڈا نے یہ روشنی اپنے
ہم پر بکھیر لی۔



جون اور بولڈا کو رات اور دن کی تقسیم کا راز معلوم ہوگیا تھا،
لوم ہوگیا تھا کہ سورج کیا پیغام لے کے طلوع ہوتا ہے اور چاند
ی طلائی روشنی کیا دعوت لے کے آتی ہے۔ جون دن بھر پاپائے اعظم
ہتی اور بولڈا اُس کا حاجب رہتا لیکن رات کو وہ دونوں صرف جون
ر بولڈا رہ جاتے۔

کتنی ہی راتیں گزر گئیں، کتنے ہی دن بیت گئے۔ انہیں کچھ
نہ چلا۔ اور جب پتہ چلا تو بہت سے دن گزر چکے تھے۔ جون کو مجبوراً
نے مشاغل سے کنارہ کش ہونا پڑا کیونکہ اُن کی راتوں کا فسانہ اب اُن
خلوت سے نکل کے قصر کے در و بام پر منکشف ہوا چاہتا تھا۔ جون
ی صورتِ حال سے دوچار ہوگئی تھی جس سے کسی زمانے میں اُس کی
ں دوچار ہو کے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئی تھی مگر اُس کی ماں ایک
دلی عورت تھی۔ جون آسانی سے اپنا وطن نہیں چھوڑ سکتی تھی' اُسے
بھی دنیا کی سب سے بڑی شخصیت پاپائے اعظم ہونے کا شرف حاصل
ا۔ وہ آسانی سے فرار بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

جون ایک بلند مرتبہ اور بلند حوصلہ عورت تھی۔ اُس نے اِس
کل وقت میں بھی اپنی ہمت پست نہیں ہونے دی مگر بولڈا صرف
غلام' ایک دربان اور ایک حاجب کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ گھبرانے لگا۔
ں نے جون سے اُس کی کیفیت سُنی تو لرزہ براندام ہوگیا۔ اُسے اندازہ
لہ اب کیا کچھ ہو سکتا ہے، کیسی قیامت ٹوٹ سکتی ہے۔ اُس کے
ور میں مشتعل لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اُبھرا جو اُس کی
ن بے تحاشا بڑھ رہا تھا۔ وہ تھرّا کے رہ گیا۔ اُس نے رسوائی اور
ت کی موت مرنے کے بجائے اپنے لیے ایک آسان موت تجویز کی
ایک رات جون کے سامنے دہشت زدہ لہجے میں خودکشی کا ارادہ ظاہر
۔ جون حیران رہ گئی۔ فلڈا کا راہب تو صرف ایتھنز میں اُسے تنہا چھوڑ
تھا مگر بولڈا تو دُنیا سے جانے کے لیے کمربستہ تھا۔ آدمی بچھڑ جائے
الیسی کی اُمید باقی رہتی ہے لیکن مر جائے تو؟ جون نے بولڈا کو
پنجے لگائے مگر وہ زندہ رہنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ نتیجتہً جون نے
ت دلیلیں دے کے اُسے اس ارادے سے باز رہنے کی ترغیب
اور اُسے یقین دلایا کہ "دیکھو ابھی اتنی عجلت مت کرو، ہم کوئی
ر سوچ سکتے ہیں۔"

مگر اُس کے خلاق ذہن میں کوئی تدبیر رسا نہیں ہوئی۔ وہ سوچتی
رہ گئی، وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ جون گوشہ نشین ہوگئی تھی۔
ی مکمل گوشہ نشینی کے متعلق قصر کے باہر یہ تاویلیں مشہور ہوگئی تھیں کہ
ں پاپائے اعظم جون ہشتم کسی خاص عبادت میں مصروف ہیں۔ نائبوں،

ضرورت مندوں اور معتقدوں نے اُس کے دربار کی حاضری التوا میں ڈال دی تھی۔ اگر کوئی شخص کسی بے حد ضروری سلسلے میں اُس سے ملنے کی کوشش بھی کرتا تو جون سرد مہری سے اُس کی درخواست رد کر دیتی۔ وہ اپنے تمام منصبی اُمور صرف تحریری طور پر انجام دیتی تھی اور وہ بھی محض بولڈا کے ذریعے۔ معزز سے معزز شخص کے لیے اُس سے رابطے کا ذریعہ محض بولڈا رہ گیا تھا۔ بولڈا اُسے بتاتا تھا کہ اُس کی اور جون کی قربت ناقابلِ بیان قیاس آرائیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ "جون! لوگ کہتے ہیں۔" وہ سراسیمگی سے بتاتا کہ "پاپائے اعظم پر ایک حاجب حاوی ہے، وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے، یقیناً وہ پاپائے اعظم کا کوئی قریبی عزیز ہے۔"

"بے شک۔" جون اداس نظروں سے اُسے دیکھتی۔ "لوگ غلط نہیں کہتے۔ تم سے زیادہ میرا قریبی عزیز کون ہو سکتا ہے۔"

"مگر جون! آپ نے سوچا کیا ہے؟" وہ وحشت سے پوچھتا۔

"یہ وقت جس طرح ہو سکے، گزار دو بولڈا!" جون اُسے حوصلہ دیتی "یہ وقت گزار دو، چونکہ رُوم کو میری ضرورت ہے اور مجھے اس کی اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج شناس ہو گئے ہیں۔ اس گوشہ نشینی سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے۔ اعلان کر دو کہ پاپائے اعظم اپنے منصب ہی کے سلسلے میں گوشہ نشین ہوئے ہیں۔"

جون بولڈا کا سکون برقرار رکھنے کے لیے مختلف اوقات میں مختلف تاویلیں پیش کرتی حالانکہ اپنی تاویلوں پر اُسے خود یقین نہیں تھا قصر سے باہر کی دُنیا کا وہ پہلے ہی نظارہ کر چکی تھی اور جانتی تھی کہ ان فصیلوں میں وہ نسبتہً محفوظ ہے۔

ایک صبح بولڈا نے اُسے بتایا "آج کل ایک راہب فلڈا سے آیا ہوا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ میں پاپائے اعظم جون ہشتم کے لیے انگلستان سے ایک خصوصی پیغام لایا ہوں۔ وہ جب سے آیا ہے، آپ سے ملاقات کے لیے مسلسل درخواستیں بھیج رہا ہے۔ کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ جب تک پاپائے اعظم سے ملاقات نہیں ہو جائے گی، میں قصر کے دروازے سے نہیں ہٹوں گا اور اگر اُن سے ملے بغیر مر گیا تو میری قبر یہیں بنے گی۔"

"فلڈا، راہب؟ انگلستان؟ قریب تھا کہ جون منہدم ہو کے فرش پر بکھر جاتی مگر حاجب نے اُسے سنبھال لیا۔ جون ایک دم بے قابو ہو کے اُس پر برس پڑی کہ "تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

جون کو یہ خیال بھی نہیں رہا کہ بولڈا سے ناراضی مول لینے کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ بولڈا کے سامنے وہ بہت دنوں بعد ایک نرم و نازک عورت کے بجائے پھر پاپائے اعظم جون ہشتم بن گئی۔ اُس نے پورے تحکم اور جلال سے حکم دیا۔ "فلڈا کے راہب کو فوراً حاضر کیا جائے۔" بولڈا سہم گیا۔ جون کے لہجے نے اُسے حیرت اور تذبذب کی مہلت بھی نہیں دی۔ وہ خاموشی سے چلا گیا۔

جون پاپائے اعظم کی اونچی مسند پر پورے تزک و احتشام سے فروکش ہوگئی مگر اُسے کسی پہلو سکون نہیں تھا۔ جون کی سانسیں قابو میں نہیں رہی تھیں حالانکہ اُس نے صبر و تحمل کی بہت کوشش کی تھی۔ پھر سب سے پہلے بولڈا نمودار ہوا، اُس کے عقب میں فلڈا کا راہب تھا۔ وہی.......
وہی اُس کا چہرہ، وہی اُس کی قامت، جون دُور ہی سے صرف ایک نظر میں اُسے پہچان گئی۔ اُس نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے بولڈا کو ایوان سے نکل جانے کا حکم دیا۔ آنے والے راہب نے جون کو تعظیم پیش نہیں کی۔ وہ ایوان میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر ساکت ہوگیا تھا جون نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اُس کی زبان پر فالج گر گیا اور اُس کی بینائی منجمد ہوگئی۔ فلڈا کا راہب پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جون کو اُن آنکھوں سے خوف آنے لگا۔ وہ سر تا پا لرزنے لگی۔

فلڈا کے راہب کا بھی یہی حال تھا۔ "تو یہ تم ہو؟" خاموشی کے ایک اذیت ناک عرصے کے بعد راہب کی مضطرب اور بیگانہ آواز اُبھری۔ جون سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ راہب کی آنکھیں قہر و غضب کے شعلے اگلنے لگیں۔ جون نے خواب جیسی مدہوشی میں اُس کی ملامتیں سُنیں۔

"آہ! آہ!" راہب اپنا سر پیٹنے لگا۔ "یہ تم ہو جون؟ تم انسانیت پر ایک بہتان ہو۔ خدا کا عذاب!" وہ وحشت میں لڑکھڑانے لگا۔ "تم اتنی دور نکل جاؤ گی، اتنا بڑا مذاق کرو گی۔ اوہ!" وہ کرب سے چیخنے لگا۔ "آہ، میں نے تمہیں ایتھنز میں اس لیے نہیں چھوڑا تھا کہ تم یہاں تک آجاؤ۔ خداوند گواہ ہے، میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میرے گناہوں کا کفارہ اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ میں تم سے دُور ہو جاؤں اور تم دوبارہ خداوند کے پیغام کی ترویج میں مصروف ہو جاؤ۔ مگر..... مگر!" وہ اپنا چہرہ کھسوٹنے اور پیر پٹخنے لگا۔ "خداوندا! مجھے معاف کر دے۔ میں بہت شرم سار ہوں مولا! کیا تُو نے اسی لیے میری بینائی برقرار رکھی تھی کہ میں اپنی آنکھوں سے اپنی سزا دیکھ سکوں۔"

جون کی سماعت زائل ہوگئی۔ وہ راہب کی جاتی ہوئی چاپیں بھی نہیں سن سکی اور اپنی مسند پر برقرار نہیں رہ سکی۔

پھر بولڈا نے اُسے فرش سے اٹھا کے اپنے سینے پر بٹھالیا۔

پاپائے اعظم کے قصر کے سامنے انسانوں کا جمِ غفیر شور مچا رہا تھا۔ مجمع کی صدائیں اور فریادیں قصر کے در و دیوار ہلا رہی تھیں لیکن جون اب اس لائق نہیں رہی تھی کہ کسی کا سامنا کر سکے۔ اُسی وقت بولڈا پاگلوں کی طرح اندر داخل ہوا اور اُس نے جون کو جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ "جون! جون! دریائے ٹائبر غضب ناک ہوگیا ہے۔ سیلاب نے ہزاروں خاندان برباد کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹڈیوں کی یلغار سے تمام فصلیں غارت ہوگئی ہیں۔ لوگ بہت بدحواس اور مضطرب ہیں۔ وہ پاپائے اعظم سے فریاد کرنے آئے ہیں، دُعا کے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ آجاؤ جون! چند لمحوں کے لیے آجاؤ۔ میری خاطر آجاؤ۔ ان فاقہ کش اور مصیبت زدہ انسانوں کو قرار آجائے گا۔ انہیں تمہارے حوصلے کی ضرورت ہے۔"

"مگر میں کیسے جا سکتی ہوں؟" جون نے زہر خند سے کہا۔ "بولڈا اُن سے کہہ دو کہ پاپائے اعظم کو اُن کا خیال ہے۔ پاپائے اعظم ہر بات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔"

"مگر جون! وہ صرف اعلان سے مطمئن نہیں ہوں گے، میں اپنی آنکھوں سے اُن کا اضطراب دیکھ کے آیا ہوں۔ وہ تمہاری زبان سے کچھ سنے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔

جون بولڈا کے شدید اصرار پر قصر کے ایک بلند جھروکے تک گئی اُس کی ایک جھلک دیکھ کے مجمع میں غلغلہ برپا ہوگیا۔ جون نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر دیے اور بلائیں دُور ہونے کی دعائیں مانگیں اور اُس کے ایک غیر اختیاری اشارے پر حاجب نے اعلان کر دیا کہ مقدس پاپائے اعظم کی قدیم روایت کے مطابق کل بلاکشوں کے ایک جلوس کے ساتھ بہ نفسِ نفیس باہر نکلیں گے اور خدا سے بلائیں دور ہونے کی دُعا کریں گے۔" یہ ۸۵ کی ایک گرم دوپہر کا ذکر ہے۔ جون کو پاپائے اعظم بنے ہوئے پچیسواں مہینہ

★

دوسرے دن سارے رُوم میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کلیساؤں کی گھنٹیاں گونج رہی تھیں۔ جنگ کے بعد رُوم ایک قدرتی آفت سے دوچار ہوا تھا سوا تھی کہ ایسے موقعوں پر پاپائے اعظم آفت زدہ انسانوں کے درمیان آ کے سب کے سامنے دعا کرتا تھا۔ جون کو آج نہیں تو کل قصر سے باہر نمودار ہونا ہی تھا۔ تمام اُمرا، قسیس اور راہب پاپائے اعظم کے قصر میں جمع تھے۔ اراد مندوں کی جھولیاں پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ راستے میں پاپائے اعظم کے لیے زرکار فرش بچھے ہوئے تھے۔ صلیبیں بلند تھیں۔

جون روایت کے خلاف ایک ڈھیلی ڈھالی عبا میں ملبوس اپنے حاجب کے ساتھ ایک پُرشکوہ جلوس کی معیت میں قصر سے برآمد ہوئی۔ اُسے دیکھتے ہی سارا روم خدا کی حمد و ثنا سے گونجنے لگا۔ بے شمار ہاتھ آسمانی برکتوں کے نزول کے لیے دراز ہو گئے۔ جون اپنی عبا میں بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی مگر جب وہ خچر پر سوار ہونے لگی تو اُسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا۔ وہ دفعتہً غش کھا کے گر پڑی۔ شور مچاتے ہوئے ہجوم پر یک لخت سناٹے کی بجلی گری۔

بے ہوش پاپائے اعظم کے قریب ایک نوزائیدہ بچہ بلک رہا تھا۔ بولڈا نے اپنے حواس و اعصاب پر بہت مشکل سے قابو پایا اور جون کی ہدایت کے مطابق اس سانحے کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کی لیکن بپھرے ہوئے اژدہام نے اُس کی کوئی دلیل تسلیم نہیں کی اور اُسے صرف چند لمحوں میں ایک آدمی کے بجائے گوشت خور پرندوں کی خوراک میں تقسیم کر دیا گیا۔

پاپائے اعظم جون ہشتم کا بے ہوش بدن اُس کے نوزائیدہ بچے کے ساتھ زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا۔

■

سب

اچھوت

ولیم بریتین ۔ زرینہ صابر

ایک اکلوتے آدمی کی سرگزشت

وہ کہانیاں جو صرف مغرب میں لکھی جاتی ہیں

دوسری جنگِ عظیم کی ایک اہم شخصیت کا واقعہ

ایک آدمی کی داستان جس کی گردن میں گھنٹی ڈال دی گئی تھی

ٹالمیج اسکوائر ایک بیس منزلہ عمارت تھی۔ پلومر اُس کی چھت پر کھڑا ہوا منڈیر سے نیچے دیکھ رہا تھا۔ عمارت کی شیشے اور فولاد سے بنی ہوئی بغلی دیوار صاف نظر آ رہی تھی۔ پلومر نے سوچا کہ چھت سے یہ دیوار کس قدر چھوٹی لگتی ہے۔ دیوار میں نہ کوئی رکاوٹ تھی نہ اُلٹی سیدھی نمائشی اشیا لگی ہوئی تھیں۔ جدید تعمیری طرز کی افادیت یہی ہے کہ کم سے کم لاگت میں زیادہ سے زیادہ دفتری سہولت مہیا کر دی جاتی ہے۔ پلومر ایک خاص مقصد سے اس عمارت کا جائزہ لے رہا تھا اور سب ٹنگ

اُس نے اس کی تعمیر میں ایک عجیب و غریب خصوصیت دریافت کر لی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اگر اُس کی دریافت صحیح ہے تو اُسے اپنے پہلے حساب میں تبدیلی کرنی ہو گی۔ یہ سوچ کے اُس نے دُہرے شیشوں کی عینک لگائی اور ٹیلی اسکوپ میں دیکھنے لگا۔ ٹیلی اسکوپ اُس نے خود لا کر چھت پہ لگایا تھا۔ اُس میں دیکھنے کے بعد اُس نے پیمانے پر حساب لگایا اور ایک کاغذ پر کچھ پیمائشیں درج کرنے لگا۔

غلطی کا سوال ہی نہیں تھا۔ عمارت کی بغلی دیواریں زمین سے زاویۂ

قائمہ پر اوپر اٹھنے کے بجائے جنوب کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ یہ جھکاؤ تین انچ کا تھا بلکہ اگر ٹھیک سے دیکھا جائے تو ⅛۲ انچ تھا۔ پلومر انچ کا ہزارواں حصہ بھی شمار کر لینا چاہتا تھا۔

اُس نے اپنی گھڑی دیکھی اور حیران رہ گیا کہ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اب چودھویں منزل کے لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کے گھر جا رہے ہوں گے۔ جب وہ چلے جائیں گے تو میرا کام شروع ہو گا۔ میں تمام دفتروں کی صفائی کروں گا اور ردّی کا غذات کے ڈھیر اُٹھا اُٹھا کوڑے میں پھینک آؤں گا تاکہ دفتروں میں غلاظت کے انبار اکٹھے نہ ہوں۔ اُسے صفائی کا یہ کام اگر ناپسند نہیں تھا تو پسند بھی نہیں تھا۔ گزشتہ ملازمت کے متعلق بھی اُس کی کیفیت یہی تھی۔ گزشتہ ملازمت میں اُسے برتن دھونے پر مامور کیا گیا تھا اور برتن دھونے سے پہلے وہ ایک شعبہ جاتی اسٹور کے اشتہار بانٹنے کا کام کرتا تھا۔ اشتہار بانٹنے کے لیے اُسے گھر گھر جانا پڑتا تھا۔ یہ تمام نوکریاں اُس نے صرف پیٹ بھرنے کی خاطر کی تھیں اور ان ازحد معمولی نوکریوں میں بھی اُسے جلدی یا دیر میں اپنا بوریا بستر سنبھال کے بھاگنا پڑا تھا کیونکہ وہ کسی بھی حالت میں رہتا یا کوئی بھی ہئیت اختیار کر لیتا، کوئی نہ کوئی اُسے ضرور پہچان لیتا تھا اور یہ بات عام ہونے میں دیر نہیں تھی۔ کہ یہ وہ شخص ہے جسے قانون نے تو بری کر دیا تھا مگر جو واقعی مجرم ہے۔ مجرم؟ پلومر نے بہت کوشش کی کہ وہ یہ ناپسندیدہ لفظ اپنے ذہن سے نوچ کے پھینک دے لیکن اُس کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ یہ سارا واقعہ سرکاری فائلوں میں محفوظ تھا۔ اب وہ فائلیں گرد میں پڑی پڑی زرد ہو چکی ہوں گی۔ یہ سوچ کے پلومر مسکرانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ چودھویں منزل پر کام کرنے والے لوگ اُس پر بہت مہربان تھے۔ اُس نے سوچا، اگر اُنھیں یہ معلوم ہو جائے تو کیا ہو گا کہ جو شخص روزانہ اُن کی میزیں پونچھتا ہے، ایش ٹرے کی راکھ جھاڑتا ہے اور مسکرا کے انھیں سلام کرتا ہے، وہ طبیعیات کا ایک مشہور ماہر ہے اور اس نے ۲۵ سال کی عمر میں پی، ایچ، ڈی کی سند حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۴۲ء کی خزاں اور ۱۹۴۳ء کی بہار میں دوسری عظیم جنگ فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس وقت پلومر اتحّادیوں کی نظر میں بمبار طیاروں کے ایک اسکواڈرن سے زیادہ اہمیّت رکھتا تھا۔ اور اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے تو ان کا ردِّ عمل کیا ہو گا کہ یہ سیدھا سادہ شخص وطن سے غدّاری کے الزام میں انصاف کے کٹہرے میں بھی کھڑا ہو چکا ہے۔

پلومر کے ساتھ پیش آنے والے سانحے میں کوئی سنسنی خیز بات نہیں تھی بلکہ شروع سے آخر تک سارا ہنگامہ چند غلطیوں کی بنا پر ہوا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں برطانوی طیارے جرمنی کے صنعتی مراکز پر بم برسا رہے تھے۔ پلومر اُن دنوں اپنی ایک ایجاد پر شب و روز کام کر رہا تھا۔ پلومر کی ایجاد بمب سائٹ بہتر بنانے کے لیے بہت کار آمد تھی۔ اُس زمانے میں ہر بمبار پائلٹ جانتا تھا کہ بمباری کا سب سے مشکل اور خطرناک مرحلہ وہ ہوتا ہے جسے بمبنگ ان یعنی نشانے تک پہنچنا کہتے ہیں۔ اس مرحلے پر جہاز تیس سیکنڈ کے لیے بالکل سیدھا اور متوازی رکھنا پڑتا تھا تاکہ بم پھینکنے والا شخص نشانے کا صحیح جائزہ لے سکے اور رفتار سمت اور بلندی کے اعتبار سے فاصلے کا صحیح تعیّن کر سکے پھر بم پھینک دے۔ تیس سیکنڈ کے اس وقفے میں جہاز بے حس و حرکت رہتا تھا لہٰذا اُسے دو اطراف سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ نیچے طیّارہ شکن توپیں ہوتی تھیں اور اوپر جرمن فضائیہ کے بہترین نشانے باز طیّارے منڈلاتے رہتے تھے۔ اتحادیوں کے جو ہوا باز بمباری کر کے واپس آتے تھے، اُن کا کہنا تھا کہ تیس سیکنڈ کا یہ مختصر وقفہ تیس سال کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ پلومر کی ایجاد اس وقفے میں پورے سات سیکنڈ کم کر سکتی تھی اور اتحادیوں کی فضائیہ اپنے بمباروں کے لیے یہ سات سیکنڈ حاصل کرنے کی خاطر سب کچھ دینے کو تیاّر تھی۔

لیکن جب پلومر نے اپنی ایجاد پر کام شروع کیا تو اُس سے فائدہ اٹھانے میں اُسے سخت دشواریاں پیش آئیں۔ مسئلوں کا ایک طومار بندھ گیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ تجربات کا جو مرحلہ آسان ترین معلوم ہوتا، وہ اتنا پیچیدہ ثابت ہوتا کہ پلومر اور اُس کا عملہ رات رات بھر جاگ کے جان لڑا دیتے مگر کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ ایسی صورت میں بسا اوقات پورے نظریے پر نظرِ ثانی کرنی پڑتی تھی۔

اُنھی دنوں پلومر کے چھوٹے سے فلیٹ میں ایک ملاقاتی وارد ہوا۔ اُس نے اپنا نام گانٹ بتایا۔ اُس نے پلومر کی ایجاد کے بارے میں کہیں کچھ سنا تھا اور نہایت اشتیاق سے اسی سلسلے میں گفتگو کرنے آیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے، ان معاملات میں رازداری ضروری ہوتی ہے لہٰذا پلومر کے لیے کسی بات چیت کا امکان ہی نہیں تھا۔ حکومت بھی ایجاد کی اہمّیت کے پیشِ نظر اسے خفیہ رکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور تحقیقی مرکز پر سخت پہرا لگا ہوا تھا۔ پلومر نے گانٹ کی باتوں کے گول مول جوابات دیے اور کوشش کی کہ وہ اس موضوع پر گفتگو نہ کرے لیکن گانٹ اسی موضوع پر بولتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ چند لوگ ایسے بھی ہیں جن کی خواہش ہے کہ اس ایجاد پر جلد عمل نہ ہو سکے اور جو مشکلات پلومر کا راستہ روکے ہوئے ہیں، وہ ایک سال یا اس سے زیادہ مدّت تک حل نہ ہو سکیں۔ گانٹ دراصل جرمنی کا جاسوس تھا اور پلومر کو خریدنے آیا تھا۔ اُس نے کام میں تاخیر کے لیے پلومر کو ایک بہت بڑی رقم کی پیش کش کر ڈالی۔ یہ پیش کش پلومر کی

ذمّے داری اور دیانت پر حملہ کرنے کے برابر تھی۔ وہ بِکنے والا آدمی نہیں تھا اس لیے اُس نے مشتعل ہو کے گانت کو اپنے گھر سے باہر نکال دیا اور بعد میں بدقسمتی سے وہ حکّام کے سامنے رشوت کی اِس پیش کش کا ذکر کرنا بھول گیا۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی اُس کی ایجاد پر جو کام ہو رہا تھا، وہ مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے بالکل رُک گیا۔ پہلے تو بصری نظام میں کچھ گڑبڑ ہوئی۔ پھر یونٹ نے ۰۰ افٹ سے زیادہ بلندی پر کام کرنا بند کر دیا کیونکہ مرطوب موسم میں فوکس کرنے والا آلہ تقریباً ناکارہ ثابت ہو رہا تھا۔

اپریل میں ایک مکان کا اچانک محاصرہ کر لیا گیا۔ شبہ یہ تھا کہ وہاں جرمن جاسوس چھپے ہوئے ہیں وہیں سے امریکن سراغ رسانوں نے گانت کو بھی گرفتار کیا۔ اُس کی فوراً شناخت بھی ہو گئی۔ وہ نازی کیمپ کا ایک محافظ تھا اور اُس کا اصل نام شیسل تھا۔ اُس نے اپنے بچپن کے کئی برس امریکہ میں گزارے تھے اس لیے اُس کے لہجے سے یہ قطعی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ امریکن نہیں ہے۔ وہ امریکہ کے رواجوں اور رسوم سے بھی خوب واقف تھا۔ اسی لیے جب پلومر کی ایجاد کا علم جرمنی کو ہوا تو وہاں سے شیسل کو بھیجا گیا۔ اُسے میکسیکو کے راستے امریکہ اسمگل کر دیا گیا تھا تاکہ وہ پلومر کا منصوبہ ناکام بنا دے اور شیسل نے یہ کام بہت آسانی سے کر دکھایا۔ اُس نے عدالت میں قسم کھا کے یہ کہا کہ سائنس داں پلومر نے اُس سے رشوت لے کے وعدہ کیا تھا کہ وہ کام کی رفتار سُست کر دے گا۔ پلومر کے کام کی اتفاقی سُست رفتاری کے باعث حکّام کو شیسل کی بات ماننی پڑی اور اُنھیں یقین ہو گیا کہ پلومر نے اپنی وفاداری فروخت کر دی ہے۔

مقدمے میں پلومر اپنا دفاع نہیں کر سکا۔ اُس سے جب یہ پوچھا گیا کہ اُس نے حکّام کو شیسل سے ملاقات کی اطّلاع کیوں نہیں دی تھی تو اُس نے جواب دیا کہ وہ شیسل کو غیر ملکی جاسوس نہیں سمجھتا تھا بلکہ جنگ کے مقامی مخالفوں کا نمایندہ سمجھتا تھا۔ یہ جواب سن کے سرکاری وکیل نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ پھر پلومر نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر اُس نے رشوت لی ہوتی تو اُس کے معیارِ زندگی میں کچھ تو تبدیلی آتی لیکن استغاثے نے یہ کہہ کے اُس کی دلیل رد کر دی کہ پلومر جیسا ذہین آدمی رشوت کی رقم فوراً خرچ کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے اُس نے وہ رقم خفیہ طور پر سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں رکھوا دی ہو۔ ویسے حکومت پلومر کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کر سکی تھی اس لیے ممکن تھا کہ پلومر عدالت کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا لیکن شیسل کی گواہی نے اُس کی اُمیدوں پہ پانی پھیر دیا۔ کلین شیو اور پستہ قد شیسل گواہی کے کٹہرے میں آیا تو اُس نے سب سے پہلے بیان دینے کی اجازت طلب کی اجازت فوراً مل گئی۔ ہر شخص کو توقع تھی کہ وہ چھوٹتے ہی حکومت کو گالیاں دے گا کیونکہ حکومت نے اُسے حراست میں لے رکھا تھا۔ سب نے تک

فاضل جج نے اپنا ہاتھ ہتھوڑے پر رکھ لیا تھا تاکہ شیسل جیسے ہی چلّانا شروع کرے، وہ ہتھوڑا بجا دے لیکن شیسل نے حکومت کو کوئی گالی نہیں دی۔ اِس کے برعکس اُس نے نہایت نرم لہجے میں عدالت کا اور اپنے قید کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "حراست کے دوران میں مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی گئی۔" اُس نے جج کی بھی تعریف کی کہ وہ ایک دشمن ملک کے ایجنٹ کو انصاف حاصل کرنے کا پورا موقع دے رہا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا، "مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں نے معزز جج کو سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں اُن کی یہ مجبوری سمجھتا ہوں کہ انھیں کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے سائنس داں پلومر کو بے گناہ قرار دینا پڑے گا۔ ثبوت نہ ہونے کے علاوہ سائنس داں پلومر کی ذہانت اتحادیوں کے لیے بہت سود مند بھی ہے لیکن میں فاضل جج سے اصرار کروں گا کہ محترم! آپ کو سائنس داں پلومر کی بے گناہی کے لیے ثبوت تلاش کرنا پڑے گا۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ قانون کو سرکار کی مصلحت کے سامنے جھکنا پڑے۔" اُس نے ڈرامائی انداز میں اپنا ہاتھ پلومر کی جانب اٹھایا۔ "بہرحال کچھ بھی ہو۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ شخص اپنی قوم کا غدّار ہے۔ اس نے مجھ سے اپنا کام سُست کرنے کے عوض رشوت میں ایک بہت بڑی رقم لی تھی۔"

ممکن ہے، جج یہ ثابت کرنے پر تل گیا ہو کہ اُس کی عدالت میں قانون ہی کی بالادستی ہے یا شیسل کے اعتراف اور سارا الزام اپنے سر لینے کی شعوری کوشش نے عدالت کے ضمیر میں کوئی چنگاری سلگا دی ہو۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ دشمن کے اس ایجنٹ کے بیان نے ایک عجیب تاثّر پیدا کر دیا۔ ایک اخباری نمایندے کو دوسرے اخباری نمایندے سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ "یہ جاسوس تو جج کو بری طرح متاثّر کر گیا ہے۔ اب وہ شیسل کو آزاد کر دے گا مگر پلومر کو ضرور مجرم قرار دے گا۔"

جج بے ثبوتی کی وجہ سے پلومر کو کوئی سزا تو نہیں دے سکا مگر اپنے فیصلے میں اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ پلومر کو انسانیت کے ذلیل ترین درجے پر بھی فائز کرنے کے لیے تیّار نہیں ہے۔ اُس نے یہ نوٹ بھی لکھا کہ اگر ملک کے کسی احمق نے پلومر کو اپنے ہاں ملازمت دینے کی کوشش کی تو وہ اس مقدمے کی فائل اپنی نگرانی میں اُس کے پاس بھجوائے گا۔ پلومر کو مجبوراً بے گناہ قرار دیتے وقت جج بُری طرح دانت پیس رہا تھا۔ البتّہ شیسل کو اُس نے تیرہ سال قید کی سزا سُنائی۔ اخباری نمایندے فیصلہ سنتے ہی تیزی سے اپنے اپنے دفتر بھاگے۔

عدالت نے تو پلومر کو بَری کر دیا تھا مگر عوام کی رائے قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ عوام اُسے غدّار ہی سمجھتے رہے۔ دفاعی معاہدوں اور خفیہ اطّلاعات کے مراکز میں پلومر کو گھسنے تک نہیں دیا جاتا تھا۔ یہاں

تک کہ اُس کی منگیتر نے منگنی کی انگوٹھی بھی کچھ کہے بغیر واپس بھجوا دی تھی۔ پلومر نے یہ تلخ حقیقت پہلی دفعہ محسوس کی کہ طبیعیات کے ایک ماہر پر تو لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹتے ہیں لیکن ایک مشتبہ غدار کے لیے اُن کے پاس نفرت اور گالیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ مسلسل دو برس تک بے روزگار رہا۔ دو برس کی بے کاری نے اُس کی بچی کھچی پونجی ختم کر دی اس لیے اُس نے مجبوراً چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرنا شروع کیا۔ اب وہ زندگی نہیں گزار رہا تھا بلکہ صرف موت کے انتظار میں وقت کاٹ رہا تھا۔

۱۹۵۶ء میں ایک صبح اُسے کسی باغ کی ایک بینچ پر ایک اخبار پڑا ہوا ملا۔ وہ اُسے اٹھا کر پھینکنے والا تھا مگر معاً اُس کی نظر اخبار میں چھپے ہوئے ایک جانے پہچانے نام پر پڑی۔ وہ شیسل کا نام تھا۔ شیسل تیرہ سال کی قید کے بعد رہا ہو گیا تھا۔ اخبار میں لکھا تھا کہ شیسل دوسری عظیم جنگ کے زمانے میں جرمنی کے لیے جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا، اب اُس کی سزا پوری ہو چکی ہے اس لیے اُسے آزاد کر دیا گیا ہے۔

پلومر نے اُسے قتل کرنے کا تہیہ کر لیا۔

وہ کئی برس تک شیسل کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ آزادی کے بعد شیسل کو جرمنی واپس بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں اُس نے تین جنگی مجرموں کو گرفتار کروانے میں مدد دی۔ ایک جنرل اُس کی ان خدمات سے بہت متاثر ہوا، اُس نے سیاسی حلقوں میں اُس کی سفارش کر کے اُسے دوبارہ امریکہ کا ویزا دلوا دیا۔ اس طرح شیسل دوبارہ امریکہ آ گیا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد امریکہ میں اُسے مستقل قیام کی اجازت مل گئی۔ اُس نے ٹائمیج اسکوائر کے قریب ایک چھوٹا سا کیفے کھول لیا۔ اُس کیفے کی لذیذ کافی اور مزے دار پیسٹریوں کی شہرت بہت جلد ٹائمیج اسکوائر کے لوگوں تک پہنچ گئی۔ چنانچہ وہاں سے شیسل کو صبح کا ہلکا ناشتہ پہنچانے کا آرڈر مل گیا۔ یہ دیکھ کے پلومر نے بھی صفائی کرنے والے کی حیثیت سے وہیں ملازمت کر لی ابھی پلومر نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ وہ شیسل کو قتل کرنے کے لیے کون سی تدبیر استعمال کرے گا۔ فی الحال یہی بہت تھا کہ اُس نے اُس شخص کو تلاش کر لیا ہے جو اُس کی بربادی کا ذمّے دار ہے۔

ملازمت کے پہلے ہی روز پلومر کو یہ معلوم ہو گیا کہ شیسل ناشتے کی چیزیں خود لے کر آتا ہے۔ ٹائمیج اسکوائر اُس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا اس لیے وہ یہاں سامان پہنچانے کا کام کسی کارندے پر نہیں چھوڑتا تھا، خود کرتا تھا۔

پہلے ہفتے میں کوشش کے باوجود پلومر اپنے شکار کو نہیں دیکھ سکا۔ وہ اکثر یہ سوچتا تھا کہ پچیس سال میں شیسل بہت تبدیل ہو گیا ہوگا۔

دوسرے ہفتے پلومر کو چھت کی صفائی پر لگایا گیا۔ پہلے روز اُس نے صفائی کی تو بُری طرح تھک گیا۔ کام ختم کر کے اُس نے چھت کی منڈیر سے ٹیک لگا لی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھانے لگا۔ اُسی لمحے اُس کی نظر نیچے گلی میں پڑی۔ گلی میں ایک گاڑی آ کے رکی۔ سفید ایپرن پہنے ہوئے ایک شخص باہر نکلا۔ وہ پلومر کو اتنی بلندی سے ایک سفید کیڑے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ شیسل نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ایک چھکڑا باہر نکالا پھر گاڑی سے ناشتے کا سامان نکال کے چھکڑے پر رکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ عمارت کے بیرونی دروازے کی طرف گھوم گیا بیرونی دروازے کے چوکیدار نے اُسے ادب سے سلام کیا اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے جھوٹ بول کے پلومر کی زندگی جہنّم بنا دی تھی اور اب بڑے اطمینان سے اپنا کام کر رہا تھا۔ پلومر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تیزی سے بھاگتا ہوا سیڑھیاں اترا۔ سیڑھیاں اتر کے وہ چودھویں منزل پر جانے کے لیے لفٹ کا بٹن دبانے والا تھا مگر اچانک رک گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شیسل کو ہلاک کرنے کی تدبیر اُس کے ذہن میں آ چکی تھی۔

چند روز بعد اپنی بچائی ہوئی رقم سے پلومر نے لوہے کا ایک چھوٹا مگر بے حد بھاری صندوق خریدا۔ کئی ہفتے تک دوپہر کے کھانے کا ناغہ کر کے اُس نے جو رقم بچائی تھی، اُس سے سروے کرنے کے آلات خریدے۔ یہ آلات اُس نے ایک کباڑی کی دکان سے خریدے تھے۔ اگلے سنیچر کو وہ سروے کے آلات ٹائمیج اسکوائر کے قریب لے گیا اور مختلف مقامات سے عمارت کے فاصلے کی پیمائش معلوم کی پھر اس نے اپنا حساب کتاب شروع کیا۔ جس شخص نے بمب سائٹ جیسی ایجاد پر کام کیا ہو اس کے لیے یہ حساب کتاب کیا چیز تھی۔ ٹائمیج اسکوائر کی عمارت ۲۴۲ فٹ اونچی تھی۔ پلومر کا اندازہ تھا کہ شیسل کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ ہوگا۔ عمارت کی کل اونچائی سے پانچ فٹ آٹھ انچ نکال دیے جائیں تو فاصلہ ۲۳۶ ½ فٹ رہ جائے گا۔ وزن ظاہر ہے، کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ البتہ کمیت کی اس لحاظ سے اہمیت تھی کہ وہ ہوا کا اثر روک سکتی تھی۔ ہوا کا اثر مدِّنظر رکھتے ہوئے پلومر کو کسی ایسے دن کا انتخاب کرنا تھا جب ہوا بند ہو۔ اگر کسی شے کے گرنے کی رفتار تقریباً ۳۲،۲ فٹ فی سیکنڈ ہو تو پہلے سیکنڈ میں تقریباً ۱۶ فٹ کا فاصلہ طے ہوگا لیکن نہیں، حساب بالکل صحیح ہونا چاہیے۔ اس میں تقریباً کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ پلومر قطعی درست حساب کرنے کا عادی تھا اور اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ اگر کوئی وزنی صندوق بالکل ٹھیک وقت پر ٹائمیج اسکوائر کی چھت سے گرایا جائے تو وہ توپ کے گولے کی رفتار سے شیسل کے سر پر گرے گا۔ اگر صندوق غلطی سے شیسل کے کندھوں پر یا پیٹھ پر جا لگے گا تب بھی اُس کی ہلاکت یقینی ہے۔

البتہ مسئلے کا ایک پہلو قابلِ غور تھا۔ وہ یہ کہ ظاہر ہے شیسل گلی میں ساکت کھڑا رہ کے اوپر سے صندوق گرنے کا انتظار نہیں کرے گا۔ وہ تو خود بھی متحرک ہوگا لیکن یہ پہلو پلومر کے لیے قطعی پریشان کن نہیں تھا۔ جنگ میں طیارے سے دشمن کی کسی فیکٹری پر بم گرانے میں بھی یہی حساب

لگایا جاتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ فیکٹری ساکت رہتی تھی اور یہاں نشانہ متحرک تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ نشانہ اور "بم" دونوں ایک خاص وقت پر ایک دوسرے سے کس طرح ٹکرا سکتے ہیں۔

چودھویں منزل پر کام کرنے والے ایک شخص سے پلومر نے اسٹاپ واچ ادھار مانگ لی۔ وہ ہر روز شیبل کی آمد سے پہلے چھت پر پہنچ جاتا اور شیبل کو گاڑی سے ناشتے کا سامان لے کے عمارت کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ گاڑی سے عمارت تک پہنچنے میں جو وقفہ صرف ہوتا تھا، اُس میں اگر کوئی فرق پڑتا تھا تو محض اس سبب سے کہ شیبل اپنی گاڑی روز ایک ہی جگہ کھڑی نہیں کر پاتا تھا۔ اس کا حل پلومر نے یہ نکالا کہ شیبل جیسے ہی چھکڑا لے کے عمارت کی پہلی کھڑکی تک پہنچتا، پلومر وہیں سے نوٹ کرنا شروع کر دیتا۔ اُس نے محسوس کیا کہ شیبل روزانہ ایک ہی رفتار سے چلتا ہے۔ اُس کی حرکت گھڑی کی حرکت کی طرح یکساں تھی۔ پلومر نے فیصلہ کیا کہ شیبل جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچے، صندوق گرا دیا جائے اُس وقت وہ عمارت کے بے حد نزدیک آ جاتا تھا۔

پھر ایک دن پلومر نے "غلطی" سے سفید پالش کا ڈبا نیچے گرا دیا۔ ڈبا گلی میں جہاں گرا تھا، وہاں ایک بڑا سا دھبّا بن گیا۔ یہ مخصوص جگہ پلومر نے کئی روز کے حساب کتاب کے بعد منتخب کی تھی تاکہ شیبل جیسے ہی دھبّے کے قریب پہنچے، اوپر سے صندوق گرا دیا جائے۔ شیبل چلتا رہے گا اور جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچے گا، صندوق اُس کے سر سے ٹکرا جائے گا۔

پھر ایک روز پلومر پر یہ انکشاف ہوا کہ ٹالمیج اسکوائر جنوب کی طرف ۲ ۱/۸ انچ جھکا ہوا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے سوچا کہ اپنے منصوبے میں ردّ و بدل کرے پھر اُس نے خود ہی سر ہلا کر اپنا ارادہ بدل دیا۔ منصوبے میں ردّ و بدل کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اب بھی صرف اتنا فرق پڑے گا کہ وہ صندوق منڈیر سے ذرا آگے رکھ کے گرائے گا۔ ہاں اگر صندوق سے بڑی کوئی چیز ہوتی تو سر سے غلطی کا امکان ہی نہ ہوتا مگر کوئی بڑی چیز چھت پر پہنچانا مشکل تھا۔ نہیں، صندوق ہی ٹھیک ہے۔ اور پھر صندوق کا ایک اور مصرف بھی تو تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ صندوق گرانے سے پہلے اُس میں جرمن جاسوس شیبل سے متعلّق اخبارات کے تمام تراشے رکھ دے گا تاکہ ساری دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اس شخص نے ایک بے گناہ کو کس طرح برباد کیا تھا۔

دوسرے روز بارش ہونے لگی۔ تیسرے روز بھی صبح سے تیز ہوا چلنے لگی پھر شام ہی سے کُہر چھا گیا اور اڑتالیس گھنٹے تک چھایا رہا۔ پلومر کچھ مایوس ہونے لگا تھا کہ اُسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں۔

جمعے کی صبح موسم خوش گوار تھا۔ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی اور ہوا بھی بند تھی۔ پلومر نے اپنے مختصر کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو

خوش ہو گیا۔ آج کا دن کسی لڑکی کے ساتھ ٹہلنے یا باغ کی سرسبز گھاس پر لیٹنے یا ساحل پر تفریح کرنے یا کسی کو قتل کرنے کے لیے کتنا موزوں ہے۔

منصوبے پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا، پلومر خود کو بہت پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ وہ شیو کرتے وقت آئینہ دیکھ دیکھ کے سیٹی بجاتا رہا۔ اُس نے ناشتہ کرنے کے بجائے اخبارات کے تراشوں کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ سب سے اوپر اپریل ۱۹۴۳ء کے ایک اخبار کا تراشا تھا۔ کاغذ خستہ ہو چکا تھا مگر اب بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ "سرکاری سائنس داں پلومر پر سائنسی ایجاد فروخت کرنے کا الزام۔"

تراشے لفافے میں بھر کے اُس نے لفافہ جیب میں ٹھونس لیا اور باہر نکل آیا۔ سڑک پر پہنچ کے معًا اُسے یاد آیا کہ وہ کمرے کا دروازہ مقفّل کرنا بھول گیا ہے لیکن خیر..... اُس کے پاس ایسی کون سی قیمتی چیز ہے جسے کوئی چرائے گا۔ آج وہ چھ منٹ لیٹ تھا۔ اُس نے ٹالمیج اسکوائر کے تہہ خانے میں جا کے اپنی نیلی یونی فارم پہنی۔ اُس کا دھیان صندوق میں الجھا ہوا تھا۔ صندوق چودھویں منزل کی جھاڑو رکھنے والی الماری میں رکھا تھا۔

نو بج کر چالیس منٹ پہ پلومر ایک سیڑھی پر چڑھا ہوا چودھویں منزل کے فانوس صاف کر رہا تھا۔ اب بیس منٹ اور باقی ہیں، اُس نے سوچا، دس بجے وہ سیڑھی اٹھا کے رکھ دے گا اور آہنی صندوق لے کے چھت پر پہنچ جائے گا۔ شیبل ٹھیک سوا دس بجے گاڑی کھڑی کرے گا مگر آج وہ عمارت کے اندر نہیں پہنچ سکے گا۔ پلومر نے اس لمحے کے انتظار میں کئی برس کاٹ دیے تھے مگر اب صرف چند منٹ باقی تھے۔

"پلومر؟" اُس نے اچانک کسی کی آواز سُنی اور مڑ کے دیکھا۔ پندرھویں منزل کا ملازم ایڈ اُسے پکار رہا تھا۔ پلومر نے سوچا کہ یہ یقیناً سیڑھی سے آیا ہو گا کیونکہ میں نے لفٹ سے کسی کو آتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایڈ نے کہا "مسٹر اینڈرسن تمھیں فوراً اپنے دفتر میں بلا رہے ہیں۔ انھوں نے تمھیں فون کرنے کی کوشش کی تھی مگر تم نہیں ملے۔" اینڈرسن صفائی کے محکمے کا نگراں تھا۔ پلومر کو یقین تھا کہ اُس نے اُسے دیر سے آنے پر ڈانٹنے کے لیے بلوایا ہو گا۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا کہ وہاں دیر ہی کتنی لگے گی۔ کوئی بات نہیں۔

پلومر نے لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچ کے اینڈرسن کے دروازے پر دستک دی۔ اینڈرسن کی آواز آئی "اندر آ جاؤ۔" پلومر نے دروازہ کھولا۔ اینڈرسن اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے دائیں طرف ایک اور شخص کھڑا ہوا تھا۔ وہ شخص پلومر کے لیے اجنبی تھا۔ اینڈرسن نے بھی اُس کا تعارف کروانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ پلومر نے معذرت کے انداز میں کہنا شروع کیا "مجھے افسوس ہے جناب کہ آج کچھ دیر ہو گئی تھی..."

"میں نے تمھیں اس لیے نہیں بلوایا ہے۔" اینڈرسن نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "تم کب سے یہاں ملازم ہو؟"

"چار ماہ سے۔"

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے؟"

"برتن مانجھنے کا کام کرتا تھا۔" پلومر نے جواب دیا۔ "یہ بات میری درخواست میں لکھی ہوئی تھی مگر۔۔۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں جناب؟"

اینڈرسن اُسے کوئی جواب دیے بغیر دوسرے آدمی سے مخاطب ہوا اور اپنے سامنے سے ایک کاغذ اٹھا کے بولا۔ "اس کی درخواست میں تو یہ لکھا ہے کہ اس نے ہائی اسکول تک کی شکل نہیں دیکھی۔ آپ کا کیا خیال ہے مسٹر راس؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" جواب ملا۔ "وقت کے ساتھ لوگ بھی بدل جاتے ہیں۔" پھر وہ شخص پلومر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے چمڑے کا ایک پرس نکالا اور پلومر سے بولا۔ "مسٹر پلومر! میرا نام راس ہے۔ میں سراغ رسانی کے محکمے سے آیا ہوں اور۔۔۔"

پلومر نے اُس کی بات دھیان سے نہیں سنی۔ وہ تو کاغذ کا وہ پرزہ دیکھ رہا تھا جو پرس نکالتے وقت راس کی جیب سے گر پڑا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا زرد کاغذ تھا۔ اُس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ پلومر نے بے اختیار اُسے اٹھا لیا۔ دفعتہً اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ چھپے ہوئے الفاظ اُس کا منہ چڑا رہے تھے۔ "سرکاری سائنس داں پلومر پر سائنسی ایجاد فروخت کرنے کا الزام۔" گویا انھیں بھی معلوم ہو چکا ہے کہ میں کون ہوں مگر یہ ناانصافی ہے۔ مجھے کم سے کم ایک دن کی مہلت تو مل جاتی۔ آج کے دن کے لیے تو میں نے برسوں منصوبہ بندی کی ہے۔ "نہیں۔۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔۔"

وہ چیخا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔۔۔ ہال میں لفٹ موجود تھی۔ اُس نے لفٹ میں گھس کے اوپری منزل کا بٹن دبا دیا۔۔۔ اس سے پہلے کہ لفٹ کا دروازہ بند ہوتا، اُس نے دیکھا کہ اینڈرسن اور راس دیوانہ وار بھاگتے ہوئے دفتر سے نکلے ہیں مگر وہ دونوں لفٹ روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

لفٹ بیسویں منزل کی طرف جا رہی تھی۔۔۔ پلومر راہ داری میں نکل آیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ راہ داری خالی پڑی تھی۔ اینڈرسن اور راس نیچے کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے کہ لفٹ کس منزل پر رکی ہے۔ اب پلومر کے پاس زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا اور وہ نیچے جانے لگی۔

پلومر زینے کی طرف لپکا اور نہایت تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چھت کا دروازہ کھول کے وہ اوپر آ گیا۔ اُس نے دروازے کے نیچے لکڑی کی چند کھپچیاں اڑا دیں تاکہ دروازہ آسانی سے نہ کھل سکے۔ کتنا وقت باقی ہے؟ ۔۔۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ شیسل کے آنے میں ابھی تین منٹ دس سیکنڈ باقی ہیں۔ کاش دروازہ اتنی دیر بند رہ سکے تاکہ میں آہنی صندوق۔۔۔۔ مگر وہ چونک پڑا۔ آہنی صندوق اٹھانا تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ صندوق اب بھی چودھویں منزل کی الماری میں رکھا ہوا تھا مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب مجھے کسی اور چیز کا انتظام کرنا پڑے گا۔ کوئی اینٹ؟ اُس نے ساری چھت چھان ماری مگر وہاں لکڑی کی کھپچیوں کے سوا کچھ نہیں تھا اور لکڑی ہوا کے ذرا سے اشارے پہ اڑ جاتی اور اگر وہ سیدھی جا گرتی تب بھی شیسل کو معمولی سی گزند پہنچنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ مجھے کوئی وزنی شے کی تلاش کرنی ہو گی۔

وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ چھت کا دروازہ پیٹا جا رہا تھا مگر پلومر نے کوئی توجہ نہیں دی۔ آہنی دروازہ بند ہی رہا۔ "پلومر! دروازہ کھولو۔" اینڈرسن نے چلا کے کہا۔

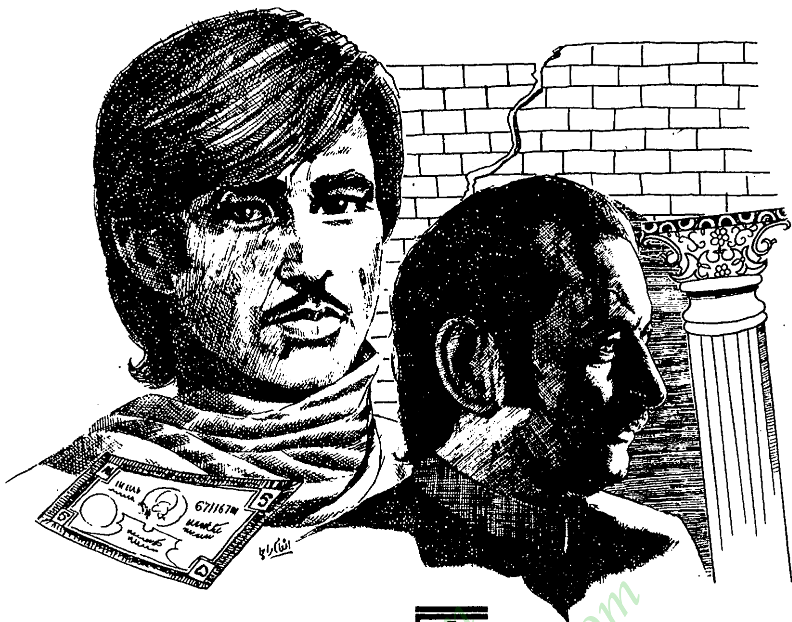
نیچے دھوپ میں ایک چلتی ہوئی گاڑی کی چھت چمک رہی تھی پھر وہ گاڑی رک گئی۔ ایک ننھی سی کیڑے جیسی مخلوق باہر نکلی۔ اُس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا، چھکڑا ابھرا اور عمارت کی طرف بڑھی۔ عین اُسی لمحے پلومر کو وہ ہتھیار مل گیا جس کی اُسے تلاش تھی۔ اس ہتھیار کے بارے میں تو اُسے آج سے بہت پہلے سوچ لینا چاہیے تھا۔ یہ تو آہنی صندوق سے بھی بہتر ہتھیار ہے۔ اُس نے تراشوں کا لفافہ جیب سے نکال کے ہاتھ میں لے لیا۔ اینڈرسن اور راس نے دروازہ بمشکل ایک انچ کھول لیا تھا مگر لکڑی کی کھپچیوں کی وجہ سے وہ اسے مزید نہیں کھول سکے تھے۔

"پلومر! سنو۔ پلومر! سنو۔" راس بُری طرح چیخ رہا تھا۔ "فوج کو وہ رپورٹ مل گئی ہے جو شیسل نے ۱۹۴۳ء میں اپنے آقاؤں کو بھیجی تھی۔ میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ مجھے یہ رپورٹ دو دن پہلے ملی ہے۔۔۔" مگر پلومر تو کچھ اور سوچ رہا تھا۔۔۔ اُس نے کچھ نہیں سنا۔ نیچے شیسل قدم بڑھا رہا تھا۔ ایک۔۔۔۔ دو۔۔۔۔ تین۔۔۔۔

"پلومر! دروازہ کھولو۔ حکومت پورا پورا ہرجانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ تم بے گناہ قرار دے دیے گئے ہو۔"

چھکڑے کے اگلے پہیے، سفید دھبے پر پہنچ گئے تھے پھر پچھلے پہیے بھی گزر گئے۔ اس کے بعد شیسل کا دایاں پیر سفید دھبے پر پڑا۔ پلومر شیسل کے سر سے ۲۳۶½ فٹ اوپر منڈیر پہ اپنے بھاری جوتے رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سینے پہ باندھ لیے پھر رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان مسکرا کے منڈیر سے چھلانگ لگا دی۔





شکر گزار

اُردو کے مایۂ ناز افسانہ نگار غلام عباس کی تحریر

ایک بنگلے کی کہانی جس میں ایک نواب رہتا تھا

گلابی جاڑوں کی ایک رات کو کوئی تین بجے کا عمل ہوگا کہ اچانک نواب صمصام الدّولہ کی آنکھ کھل گئی۔ انھیں ڈرائنگ روم میں، جو ان کے کمرے سے ملا ہوا تھا، کچھ کھٹکا سا سنائی دیا تھا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ تیز ہوا سے کوئی چیز گر پڑی ہوگی مگر پھر یاد آیا کہ ڈرائنگ روم کے سارے دروازے اور کھڑکیاں انھوں نے خود ہی تو بند کی تھیں۔ اِدھر گھر میں کوئی پالتو جانور بلی یا کتا بھی نہ تھا جس سے گمان ہوتا کہ اُس کے دوڑنے بھاگنے سے کوئی چیز گر پڑی ہوگی چنانچہ وہ کچھ فکر مند سے ہو کر بستر سے اُٹھ بیٹھے، شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہنا، پھر کمرے کے ایک کونے سے اپنی چاندی کی موٹھ والی چھڑی اٹھائی اور نواب بیگم کو جگائے بغیر، جو گہری نیند میں مدہوش ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھیں، وہ دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف چل دیے۔

نواب صمصام الدّولہ کی عمر کوئی پچاس پچپن برس کی ہوگی، تھے تو چھوٹے سے قد کے مگر ہاتھ پاؤں میں بڑا کَس بل تھا۔ سُرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کڑبڑی مونچھیں، کتابی چہرہ جس سے شکوہ، بُردباری اور حلم ٹپکتا تھا۔

نواب صاحب ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا رُکے اور پردے کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ جب انھیں کوئی آہٹ سنائی نہ دی اور نہ اندھیرے میں کوئی سایہ چلتا پھرتا دکھائی دیا تو انھوں نے کمرے میں داخل ہو کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔ بجلی کی روشنی میں انھوں نے دیکھا کہ کمرہ تو خالی پڑا ہے البتہ ایک چھوٹی سی تپائی گری پڑی ہے اور اُس پر پیتل کا جو خاکستر دان رکھا تھا، وہ فرش پر اوندھا پڑا ہے۔ نواب صاحب کو یقین ہو گیا کہ بنگلے میں ضرور کوئی چور آ گھسا ہے۔ وہ بڑی دلیری کے ساتھ چور کی تلاش میں بنگلے کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لینے لگے۔

اس بنگلے میں ڈرائنگ روم کے علاوہ چار بیڈ روم تھے۔ ان میں سے ایک کو تو نواب صاحب اور نواب بیگم خود اپنے تصرّف میں لاتے تھے اور باقی تین بند پڑے تھے کیونکہ اُن کا اکلوتا صاحب زادہ مدّت ہوئی کسی کاروبار کے سلسلے میں کسی دُور دراز کے ملک میں جا کر وہیں کا ہو

رہا تھا اور دونوں صاحب زادیاں شادی کے بعد اپنے اپنے شوہر کے گھر آباد ہو گئی تھیں۔ بنگلے میں اب فقط نواب صاحب اور نواب بیگم ہی رہتے تھے۔ کوئی مستقل ملازم بھی نہ تھا۔ بس ایک چھوکرا تھا جو دن بھر اِدھر اُدھر کے کام کر کے شام کو اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

نواب صاحب بڑی کفایت شعاری سے گزر بسر کرتے تھے، نہ موٹر تھی، نہ بگھی گھوڑا، پھر بھی اُن کا شمار معززینِ شہر میں ہوتا تھا اور انھیں اکثر شہری تقریبات میں شمولیت کے لیے دعوت نامے آیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ اُن کی اعلیٰ نسبی، خاندانی وجاہت اور ذاتی شرافت تھی۔ اُن کو فخر تھا کہ اُن کا شجرۂ نسب کئی واسطوں سے نادر شاہ افشار سے جا ملتا ہے۔ اِن دنوں وہ کچھ چُپ چُپ سی زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کے موجودہ مشاغل کیا تھے، اِس کا علم کسی کو نہ تھا اور نہ کوئی اُن کی آمدنی کا ٹھیک ٹھیک حال جانتا تھا۔ بعض کہتے تھے کہ انھیں اپنی زمینوں سے خاصی رقم مل جاتی ہے۔ بعض کہتے تھے کہ اُن کا صاحب زادہ دوسرے تیسرے مہینے ایک خطیر رقم انھیں بھیجتا رہتا ہے، وہ طبعاً کم آمیز اور تنہائی پسند تھے۔ نہ کسی سے ملنے جاتے اور نہ کوئی اُن سے ملنے آتا۔ بس اپنے بنگلے کی چار دیواری میں وہ اپنے خاندانی ناموں کو سینے سے لگائے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کیے جا رہے تھے۔

نواب صاحب نے تینوں بیڈ روم ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے مگر انھیں چور کہیں نظر نہ آیا۔ باورچی خانہ بھی خالی پڑا تھا۔ اب وہ توشے خانے کے پاس پہنچے۔ اُس کا دروازہ کھولنا چاہا تو اُسے اندر سے بند پایا، انھیں یقین ہو گیا کہ چور بس اِسی کے اندر ہے۔ انھوں نے چھڑی سے دروازہ ٹھوک کر تحکمانہ لہجے میں کہا: "اندر کون ہے؟" چند لمحے خاموشی رہی۔ انھوں نے دروازہ پھر ٹھوکا: "تم جو کوئی بھی ہو، فوراً دروازہ کھول کر باہر آ جاؤ۔" اندر سے اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر نواب صاحب نے اب کے بہت ڈانٹ کر کہا: "دیکھو! اگر تم ایک منٹ کے اندر باہر نہ نکل آئے تو میں باہر سے دروازہ بند کر کے پولیس کو خبر کر دوں گا۔"

اس پر اندر سے چٹخنی سرکنے کی آواز سنائی دی۔ نواب صاحب چھڑی تانے ہوئے تو تھے ہی پھر بھی احتیاطاً دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے کہ کہیں چور باہر نکلتے ہی وار نہ کر دے۔ مگر چور کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔ وہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا توشے خانے سے باہر نکل آیا۔ وہ کوئی پچیس چھبیس برس کا دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ پتلون اور سوئیٹر پہنے، گلے کے گرد مفلر بڑے والہانہ انداز سے لپیٹے، انگریزی فیشن کے بال، جو گُدّی کے قریب گچھے دار ہو گئے تھے، باریک باریک مونچھیں، لمبی لمبی قلمیں۔ "میاں صاحب زادے! شکل سے تو تم چور نہیں معلوم ہوتے، سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟"

نواب صاحب کے نرم لہجے سے چور کی ڈھارس بندھی اور اُس نے کہا: "بہتر ہے کہ آپ ڈرائنگ روم میں تشریف لے چلیے، میں وہیں عرض کر دوں گا۔"

چور نے یہ الفاظ ایسے مہذب اور پُراعتماد لہجے میں کہے کہ نواب صاحب کو مجبوراً کہنا پڑا: "اچھی بات ہے، تم آگے آگے چلو۔"

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر نواب صاحب نے تیز روشنی میں چور کا چہرہ غور سے دیکھا تو اُس پر انھیں کسی قسم کی درشتی یا بدکرداری کے آثار نظر نہ آئے، نہ خوف یا گھبراہٹ کا نشان تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور ہونٹوں پر خفیف سا تبسّم، وہ بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "آپ بھی تشریف رکھیے تو یہ ناچیز اپنا تعارف کرائے۔" نواب صاحب کچھ مبہوت سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

"اس خاکسار کو بشیر علی کہتے ہیں۔ اردو میں اچھی خاصی اور انگریزی میں معمولی شُدبُد رکھتا ہوں۔ افسوس کہ میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔۔۔۔"

"میاں صاحب زادے!" نواب صاحب نے اُس کی بات کاٹ کر کہا: "یہ باتیں تو بعد میں ہوں گی، پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئے کس لیے ہو؟"

چور نے بڑی بے باکی سے کہا: "آیا تو میں چوری کی نیّت ہی سے تھا مگر میں نے سخت دھوکا کھایا۔"

"دھوکا کھایا؟ ــــــ کیسا دھوکا؟"

"میں نے یہ بنگلا دوسرے بنگلوں سے الگ تھلگ اور دور اُفتادہ جگہ دیکھ کر چوری کے لیے تاکا تھا۔ پھر بنگلے کے باہر آپ کے نام کا جو بورڈ لگا تھا: 'نواب صمصام الدّولہ تہوّر یار جنگ بہادر' اس نے بھی میرے لیے بڑی کشش پیدا کر دی تھی۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہاں نہ تو کوئی چوکیدار ہے اور نہ نوکر چاکر، بس آپ اور آپ کی بیگم ہی رہتی ہیں۔ یہ بات بھی چوری کے لیے بڑی سازگار تھی۔ چنانچہ جب آدھی رات گزر گئی تو میں دل میں بڑی امیدیں لیے ہوئے دیوار پھاند کر آپ کے بنگلے میں داخل ہو گیا لیکن نواب صاحب! یقین جانیے یہاں قدم رکھنے کے دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی حماقت اور انتہائی ناتجربہ کاری کا احساس ہو گیا۔"

"وہ کیوں کر؟"

"وہ یوں، نواب صاحب بے تکلفی معاف کہ یہ بنگلا سراسر ایک فریب ہے، ایک دھوکا ہے۔ اس بنگلے میں ایک بھی چیز تو ایسی نہیں جو چرانے کے قابل ہو۔ ذرا اس ڈرائنگ روم ہی پر نظر ڈالیے۔ یہ دقیانوسی صوفہ سیٹ ہے، یہ پرانا قالین جس میں جگہ جگہ سوراخ ہیں، یہ پرانی گول میز یہ بے ڈھنگی تپائیاں، جن کا روغن اُتر چکا ہے، یہ دیوان پر میلا سا پلنگ پوش بچھا ہے، یہ پرانے مخملی گاؤ تکیے، یہ بوسیدہ پردے، بھلا کوئی چور انھیں چرانے

کی حماقت کر سکتا ہے اور اگر کر بھی لے تو ان کو اٹھا کر کہاں لے جائے گا؟
چوروں کو نواب صاحب! جس چیز سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ اوّل تو ہے
نقدی، اس کے بعد جواہرات اور زیورات کی باری آتی ہے اور ان کے بعد
نوادر، سونے چاندی کے ظروف، گھڑیاں خواہ جیبی ہوں یا کلائی کی، پھر
ریشمی پارچہ جات، بنارسی ساڑیاں، قیمتی گرم کپڑے کے عمدہ سلے ہوئے مردانہ
سُوٹ۔ پھر آتشیں اسلحہ جیسے بندوق یا پستول یا پھر تفریح یا دل
بہلانے کی چیزیں ریڈیو یا ٹرانزسٹر۔ سلائی کی مشین بھی بری نہیں گو
ذرا بھاری ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں سے تو معاف کیجیے گا نواب صاحب!
میرے ہاتھ عمدہ قسم کا ایک قلم تک نہیں لگا۔ مہربانی کر کے اپنے بنگلے
کے دروازے سے اپنے نام کا بورڈ اتروا لیجیے یا پھر اپنا نام بدل لیجیے
ورنہ مجھ ایسے نہ جانے کتنے احمق اور ناتجربہ کار چور یہاں آ کر ناحق
اپنا وقت ضائع کرتے رہیں گے۔"

"آپ کے تینوں بیڈروم جو خالی پڑے ہیں۔ ان میں ٹوٹے پھوٹے
نواڑی پلنگوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور پھر خود آپ کے اپنے بیڈ
روم میں ......"

"تو کیا تم میری خواب گاہ میں بھی داخل ہوئے تھے؟"

"داخل ہی نہیں ہوا، پورے دو گھنٹے آپ کی موانست میں
گزارے ہیں۔ اس دوران میں آپ برابر زور زور سے اور آپ کی بیگم صاحبہ
ہلکے ہلکے خرّاٹے لیتی رہیں۔ جب سب طرف سے مایوس ہو کر میں آپ کے
کمرے میں پہنچا اور میں نے تجوری دیکھی تو میری باچھیں کھل گئیں مجھے
یقین ہو گیا کہ میری محنت اکارت نہیں جائے گی، میں اس بنگلے سے خالی
ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ میں پورے دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد تجوری کھولنے
میں کامیاب ہو گیا لیکن نواب صاحب! آپ میری مایوسی کا اندازہ نہیں
کر سکتے جب اس تجوری سے چند کاغذات کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ لگا
اور یہ کاغذات کیا تھے؟ ایک تو تھا آپ کا خاندانی شجرہ اور دوسرے تھے
آپ کے اپنے اور صاحب زادیوں کے نکاح نامے۔ گھبرائیے نہیں نواب صاحب
میں نے احتیاط سے پھر انھیں تجوری میں بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں
آپ کے کپڑوں کی الماری کی طرف متوجہ ہوا مگر اس میں بھی مجھے دو تین
پرانی شیروانیوں اور بوسیدہ ساڑیوں کے سوا جن کا رنگ اُڑ چکا تھا،
کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے آپ کی شیروانیوں کی سبھی جیبیں ٹٹول ڈالیں مگر
قسم لے لیجیے جو کسی میں سے ایک چونی تک نکلی ہو۔

"میں بہت تھک کر اور مایوس ہو کر آپ کی خواب گاہ سے نکلا اور
دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچا کہ جانے سے پہلے ایک نظر اور ڈال لوں مگر
میری بے احتیاطی بلکہ لاپروائی نے مجھے تپائی سے ٹھوکر کھلوائی۔ کھٹ کا
سُن کر آپ جاگ اُٹھے اور مجھے توشے خانے میں پناہ لینی پڑی، تو نواب
صاحب! یہ ہے میری کہانی۔"

نواب صمصام الدولہ بڑے غور سے چور کی باتیں سنتے رہے، جب
وہ خاموش ہوا تو انھوں نے پوچھا۔ "کیا تمھیں یہ ڈر نہیں ہے کہ میں تمھیں
پولیس کے حوالے کر دوں گا؟"

"ہرگز نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ، معاف کیجیے گا، ایسی
حماقت کبھی نہیں کریں گے۔ جب تک میں نے اس بنگلے کا جائزہ نہیں
لیا تھا، مجھے یہ ڈر ضرور تھا مگر اب مطلق نہیں، شاید آپ مجھے چھ ماہ یا سال
بھر کی قید کی سزا دلوانے میں کامیاب ہو جائیں مگر اس کے ساتھ ہی آپ
کی ثروت، خاندانی وجاہت اور نام و ناموس کا پول بھی تو سارے شہر پر
کھل جائے گا کیونکہ پولیس کے افسر موقع واردات دیکھنے آئیں گے اور
پھر اخباروں میں میرا بیان چھپے گا کہ افسوس صد افسوس مجھے خواہ مخواہ یہ
ذلت اٹھانی پڑی کیونکہ نواب صمصام الدولہ نہور یار جنگ بہادر کے بنگلے
میں ایک بھی چیز تو ایسی نظر آئی جو چرانے کے قابل ہوتی۔ تو آپ اپنے
جلیسوں کو کیا منہ دکھانے کے قابل رہیں گے؟"

نواب صاحب سے اس کا کچھ جواب بن نہ پڑا۔ چند لمحے خاموشی رہی
چونکہ رات زیادہ گزر چکی تھی اس لیے نواب صاحب نے یہ قضیہ نمٹانے
کے لیے پوچھا۔ "اچھا تو میاں صاحب زادے! اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"بس مجھے تھوڑی سی نقدی دلوا دیجیے، یقین جانیے، نواب
صاحب! میں نے آج دن بھر کچھ نہیں کھایا۔"

نواب صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ "اچھا تم چپ
چاپ یہیں بیٹھے رہو، میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں گئے۔ نواب بیگم ابھی تک میٹھی نیند
سو رہی اور ہلکے ہلکے خرّاٹے لے رہی تھیں۔ نواب صاحب نے آہستہ
سے اُن کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ "نواب بیگم! نواب بیگم! ذرا اُٹھنا۔"

نواب بیگم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔ "کیا ہے نواب صاحب!"

"مجھے کچھ روپے چاہئیں۔"

"روپے؟ بھلا میرے پاس کہاں سے آتے؟"

"وہ جو صبح میں نے تمھیں پانچ کا نوٹ دیا تھا، وہ کیا ہوا؟"

"ارے بھول گئی۔ وہ تو ہے یہیں سرہانے کے نیچے۔"

"تو لاؤ جلدی سے نکال کر دے دو۔"

"کیا کیجیے گا اس نوٹ کو؟"

"بھئی ایک دوست کو دینا ہے۔ بے چارہ بڑی مصیبت میں
گرفتار ہے جبھی تو ایسے ناوقت میرے پاس آیا ہے۔ جلدی کرو نواب
بیگم! میں نہیں چاہتا کہ بے چارہ مایوس ہو کر میرے بنگلے سے خالی
ہاتھ چلا جائے۔"



دو لڑکیوں کا قصہ جن پر بہار آئی تھی

اس مہاہ کے لیے اردو کی دوسری منتخب کہانی

اردو کے سرمایۂ افتخار ادیب احمد ندیم قاسمی کی تحریر

اِدھر فیشن بدلتا، اُدھر حلیمہ کے وارے نیارے ہوجاتے۔ نجمہ پرانے فیشن کے سب کپڑے حلیمہ کو تھما دیتی اور کہتی۔ "لے بھئی حلیمہ! تیری قسمت سے فیشن بدل گیا ہے۔" یہی وجہ تھی کہ حلیمہ کے پاس بند گلے والے، کھلے گلے والے پوری آستینوں والے، آدھی آستینوں والے، بہت نیچے اور بہت اونچے جمپروں کے علاوہ کھلے اور تنگ پائنچوں والی گھیرے دار اور بے گھیر شلواروں کا ڈھیر سا لگ جاتا تھا۔ حلیمہ ہر مہینے کی چار تاریخ کو نجمہ کی امی سے تنخواہ لیتی تھی اور جب حلیمہ کی ماں ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو حلیمہ سے تنخواہ لینے آتی تھی تو شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جب وہ اپنے ساتھ کپڑوں کا ایک گٹھڑ اٹھا نہ لے گئی ہو۔ پھر وہ خوش ہو کے حلیمہ سے کہتی تھی۔ "ہائے ری چھوکری! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ جب دیکھو نئے کپڑے، جب دیکھو نئے کپڑے۔ یہ نجمہ بی بی نے تجھے نوکرانی رکھا ہے کہ سہیلی بنایا ہے؟"

پھر جب وہ دیکھتی کہ نجمہ مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے تو وہ دانت بھینچ کر اور حلیمہ کے سینے میں اپنے دوہتڑ چبھو چبھو کر کہتی "اری حرام کی اولاد! نجمہ بی بی جو تجھ پر اتنی صدقے قربان ہوتی ہے تو اس

سے پورا پورا فائدہ اٹھا۔ تجھے جو ڈھیر سے کپڑے ملتے ہیں، ان میں اچھے والے خود کیوں پہن لیتی ہے؟ تو نوکرانی ہے، اپنے آپ میں رہا کر، اپنا جہیز جمع کر، ریشمی کپڑے ملیں تو خود نہ پہن لیا کر، ان پر لوہا کر لیا کر اور میں آؤں تو مجھے دے دیا کر۔ اس صدی کا ایمان خراب ہو گیا ہے۔ اب صورت کو کوئی نہیں دیکھتا، سب جوڑے گنتے ہیں اور زیور تولتے ہیں۔" اور اگر اوپر سے نجمہ کی امی آ گئیں تو وہ ہنس ہنس کر کہتی۔ "یہ میری بیٹی سدا کی انوکھی ہے بی بی جی! تیرہ سال تک ہاتھ بھر کی رہی۔ اس کا باپ اسے پدی کہتا تھا۔ پھر جو ایکا ایکی بڑھنے لگی ہے تو بی بی جی! قسم لیجیے کہ سردیوں میں اس کے لیے جو شلوار سلائی، وہ گرمیوں میں اس کے گھٹنوں سے نیچے اترتی ہی نہیں تھی۔ یوں کڑوی بیل کی طرح بڑھی ہے کہ الٰہی توبہ! اس کا باپ ہنس ہنس کر کہتا تھا، اسے روکو، روکو، یہ کہاں جا رہی ہے، پہلے مجھ سے سر نکالا۔ پھر اپنے باپ کے بھی آس پاس پہنچنے لگی تھی کہ اسے اللہ نے بلا لیا اور یہ وہیں رک گئی۔ شکر ہے رک گئی ورنہ پرنالوں سے ٹکراتی پھرتی۔" بی بی جی کی ہنسی ختم ہونے کا انتظار کرنے کے بعد وہ کہتی۔ "اب بھی دیکھ لیجیے، ویسی ہی انوکھی ہے۔ نوکری کرنے کو اللہ نے ایسا گھر دیا ہے کہ ——، یہی جوڑا دیکھ لیجیے، ایسا ریشم پہننے کا خواب تو میری دادی پردادی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں تو اسے ایک دن نجمہ بی بی سمجھ کر سلام بھی کر بیٹھی تھی اور اس حرام کی اولاد کو دیکھیے کہ بولی، "وعلیکم السلام"۔

دونوں مائیں ہنسنے لگتیں اور حلیمہ جو ماں کی باتوں کے دوران میں مسلسل مسکرائے جاتی، بھاگ کر نجمہ کو ماں کی ساری باتوں کی رپورٹ کرنے پہنچ جاتی۔ نجمہ کے لیے حلیمہ محلے کا اخبار تھی۔ وہ دس منٹ کے لیے بھی کہیں پڑوس میں رقعہ دینے جاتی تو واپس آ کر ایک گھنٹے تک گلی کے ہر گھر کے تازہ حالات بیان کرتی رہتی اور نجمہ کے جسم میں سنسنی پر سنسنی دوڑتی رہتی۔ "اب آگے بھی بکو نا —— پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا نجمہ بی بی! طلاق ہو گئی۔"

"کس کی؟"

"جس کی بات کر رہی ہوں۔"

"ہائے بے چاری۔"

"بے چاری نا بے چاری! قسم سے نجمہ بی بی! بیویوں نے بھی کبھی عشق کیا ہے؟"

"پر کسی نے دیکھا تھوڑی ہو گا۔"

"کسی نے دیکھا ہو، نہ دیکھا ہو۔ اُس کے گھر والے نے تو دیکھا۔ لوگ کہتے ہیں نجمہ بی بی کہ اُس نے چاقو بھی نکال لیا۔"

"ہائے —— پھر؟"

"پھر کیا، بس سوچا ہو گا کہ چاقو نہ مارو، طلاق دے دو۔"

"ہاں —— بات تو ایک ہی ہے۔"

یا پھر نجمہ بے قرار ہو کر پوچھتی۔ "اب کہہ بھی چکو نا، پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا نجمہ بی بی! بس پولیس آ گئی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا نجمہ بی بی! بس بچے کو نالی میں سے اٹھوایا۔"

"ہائے —— نالی میں سے؟"

"تو کیا گود میں سے؟ قسم سے نجمہ بی بی! آپ بھی بڑی بھولی ہیں۔ کہہ تو چکی ہوں حرام کا تھا۔"

"اوچھا مت بکو۔"

"لیجیے، باہر گھر گھر ڈھنڈورا پٹ گیا ہے اور نجمہ بی بی کہتی ہیں،

"اوچھا مت بکو۔"

"پر تھا کس کا؟"

"یہ تو نجمہ بی بی! خدا ہی جانے، کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے سنا ہے سارے محلے کی عورتوں کی ڈاکٹری ہو گی تو پتہ چل جائے گا۔"

"ہائے، خدا سب کے پردے رکھے۔"

ایک بار حلیمہ کی ماں کو نمونیا ہو گیا اور حلیمہ اُس کے پاس چلی گئی تو نجمہ سارے گھر میں اجنبیوں کی طرح ٹامک ٹوئیے مارتی پھری۔ ایک دن چنا جور گرم والے نے اپنی کراری آواز میں مسالوں کی تعریف گائی تو نجمہ رونے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ چنوں والا سیڑھیوں کے سامنے کھڑا حلیمہ کے اُترنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اسی لیے تو وہ "چنا جور گرم بابو کی جگہ" چنا جور گرم بی بی" گا رہا تھا اور اُس کے گیت میں یہ اصلاح حلیمہ ہی نے کی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔ "کیوں رے، تو منوں بابو کیوں کہتا ہے، کیا بابو ایسے ہوتے ہیں؟" اور وہ یوں اکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی جیسے تصویر اتروا رہی ہے۔ نجمہ اوپر کھڑکی کی چق سے دیکھ رہی تھی، اس زور سے ہنسی اور اتنی دیر تک کمرے کمرے میں ہنستی پھری کہ اُس کے ابا جی کو بھی آخر ذرا سا مسکرا دینا پڑا۔

نجمہ کے ابا صرف اُس وقت مسکراتے تھے جب انھیں یقین ہو جاتا تھا کہ اب فرار کی کوئی راہ نہیں اور مسکرائے بغیر چارہ نہیں۔ اسی لیے نجمہ اپنی امی سے کہا کرتی تھی کہ "اگر ابا کھالوں کے سوداگر نہ ہوتے تو بڑے قنوطی قسم کے فلسفی ہوتے۔" وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ایسے لگتے جیسے انھوں نے اپنی گردن پر بھینسے کی کھال لپیٹ رکھی ہے۔ ہزاروں کماتے مگر کبھی کبھار ایک آدھ سینکڑے کا بھی نقصان ہو جاتا تو کم سے کم ایک وقت کا کھانا نہ کھاتے اور رات بھر جاگتے اور تسبیح کے منکے چلاتے رہتے۔ کھالیں بیچ بیچ کر انھوں نے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ بیٹھے ہوئے بھی ہانپتے رہتے۔ محلے والے اُن کی دولت کا اندازہ یہ کہہ کر لگاتے کہ جب وہ مر مل گئے اور اُن کی دولت اُن کے ساتھ قبر میں دفن کرنی پڑے گی تو خود اُن کی میت کے لیے دوسری قبر

کھودنی پڑے گی اور اگر اُن کی گنجائش نکالنے کے لیے قبر کچھ اور کھودی گئی تو نیچے سے پانی نکل آئے گا۔"

مگر ادھر نجمہ اسکول سے نکل کر کالج پہنچی، اُدھر اُن کی دولت کو سینڈھ لگ گئی۔ ادھر فیشن بدلتا، اُدھر وہ نئے فیشن کے اکٹھے دس پندرہ جمپر سلوا لیتی۔ چار تو اُس کے صرف برقعے تھے۔ کالا، نیلا، گہرا چاکلیٹی اور ہلکا بادامی۔ جوتے اتنے تھے کہ دو شیلفوں سے کتابیں نکال کر اُن میں جوتے بھر دیے گئے تھے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بھی فیشن کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ لپ اسٹک کے سب شیڈ اُس کے پاس تھے۔ نیل پالش کی ہر ملک کی شیشیاں اُس کی سنگھار میز پہ سجی رہتی تھیں۔ "آئی برو" پینسلیں تک درجنوں کی تعداد میں موجود تھیں۔

شروع شروع میں جب نجمہ نے ہاتھ دکھانے شروع کیے تو اُس کی امی بہت گھبرائیں۔ نجمہ کو ابا کے پاس جانے سے روکتی رہیں مگر نجمہ بولی "میں اُن کا بیٹا ہوتی تو دو تین موٹریں اب تک خرید چکی ہوتی۔ پھر بھی چلتا اباجی کو— میرا خرچا تو ایک سائیکل تک کا خرچا بھی نہیں ہے۔" پھر وہ ابا کے کمرے میں دراّنہ چلی گئی اور ہکا بکا ماں دیوار سے چمٹ کر اندر جھانکنے لگی۔ وہ بیٹھے شاید کھالیں گن رہے تھے۔ نجمہ نے "ابا جی!" کہا تو اُسے چھوٹے چھوٹے شیشوں والی سنہری عینک کے اوپر سے یوں دیکھا جیسے مارے پیار کے ڈکرانے لگیں گے۔ پھر جب اُس نے کہا "اباجی! مجھے پانچ سو روپے چاہئیں، کپڑے خریدنے ہیں اور چند جوڑی جوتے اور لڑکیوں کی ضرورت کی کچھ اور الا بلا۔" تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مہینوں کے بعد مسکرا دیے۔ پھر گدّے کا ایک کونا اٹھایا، انگشتِ شہادت زبان سے چھو کر گیلی کی اور سو سو کے پانچ نوٹ گن کر نجمہ کی طرف بڑھا دیے۔

چکراتی ہوئی امی کو اتنا ہوش تھا کہ بیٹی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے جب نجمہ نوٹ لے کر اور سر پہ ہاتھ پھروا کر پلٹی تو وہ کھسک کر ایک طرف ہو گئیں اور جب وہ چلی گئی تو آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے پاس پہنچیں۔ انھوں نے بیوی کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ کچھ اور قریب آئیں تو انھیں بھنبھوڑ ماریں گے۔ بولے "روپیہ چاہیے؟"

نجمہ کی امی بولیں "جی ہاں۔" اور انھوں نے سنہری عینک کی کمانی ذرا سی ہلا کر کہا "تو پھر اتنی جلدی کاہے کی ہے، میرے مرنے کا ذرا تو انتظار کر لو۔" پھر سر جھکا کر ہندسے گننے لگے۔

بیٹی کے سلسلے میں باپ کی اسی فیاضی کا نتیجہ تھا کہ نجمہ نے اپنی الگ نوکرانی رکھ لی۔ پچاس روپے ماہانہ بھی اور روٹی بھی اور کپڑا الگ۔ اور کپڑے بھی موسم کے ساتھ نہیں، فیشن کے ساتھ۔ امی نے صرف اتنا کہا کہ "بیٹی! جب تمھارے ابا کلرک بھرتی ہوئے تھے تو اتنی تنخواہ تو انھیں بھی نہیں ملتی تھی۔"

مگر بیٹی پر اس بات کا صرف اتنا سا اثر ہوا کہ ہنسنے لگی اور بولی۔ "ہائے امی! یہ سوچ کر کیسا عجیب سا لگتا ہے کہ ہمارے اباجی بے چارے کبھی کلرک بھی تھے۔"

آہستہ آہستہ نجمہ کی امی بھی عادی ہو گئیں بلکہ اب تو جب بھی نجمہ ہاتھ میں سو سو کے چند نوٹ لے کر ابا کے کمرے سے نکلتی تو وہ یوں اطمینان کا سانس لیتیں جیسے انھوں نے اپنے شوہر سے انتقام لیا ہے۔ اُن کے اطمینان کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اُن کی بھی بعض ضرورتیں نجمہ کے روپے سے پوری ہونے لگی تھیں۔ اب روپے کی خاطر وہ شوہر کے بجائے بیٹی کو خوش کرنے میں لگی رہتیں۔ اسی سلسلے میں ایک دن حلیمہ کی تنخواہ میں اکٹھے دس روپے بڑھا دیے اور جب حلیمہ نے جا کر نجمہ کو بتایا تو وہ اتنی خوش ہوئی کہ بھاگتی ہوئی آئی اور امی سے لپٹ کر انھیں چومنے لگی۔ پھر امی کو اباجی کی طرف سے ملنے والے ماہانہ حساب کے روپوں میں اُس نے حلیمہ کی تنخواہ کے علاوہ دس دس کے دو نوٹوں کا بھی اضافہ کر دیا اور بولی "آپ نے میری نوکرانی کے دس روپے بڑھائے ہیں تو میں آپ کی مائی کے دس روپے بڑھاتی ہوں۔"

ویسے تو مائی اور شرفو، نجمہ کے دست بستہ غلام تھے مگر نجمہ کی شکل یہ تھی کہ اُن میں سے کوئی بھی اُس کے کمرے میں اگر دو منٹ سے زیادہ رک جاتا تو نجمہ کو ایسا لگتا جیسے وہ پلٹ کر آئینہ دیکھے گی تو اُس کے بال سفید ہو چکے ہوں گے۔ شرفو کے سر اور داڑھی کے بال اتنے سفید تھے کہ وہ سارے کا سارا برف کا بنا ہوا لگتا تھا اور پھر وہ مُرد تھا اور نجمہ کو بیٹی جی اور بٹو جی کہہ کر پکارتا تھا۔ اب نجمہ اُسے یہ کیسے سمجھاتی کہ تانے "برکھا بہار آئی" گا کر اپنے آپ پر دوزخ کی آگ حرام کر لی ہے۔

ادھر مائی تھی کہ اس عمر میں اُس کے صرف دو کام رہ گئے تھے کھانا پکانا اور وضو کرنا۔ کھانا یوں فٹافٹ پکاتی تھی جیسے چولھے میں لکڑیوں کے ساتھ خود بھی جل رہی ہے مگر نماز یوں آسودگی سے پڑھتی تھی جیسے اب مر کر ہی سلام پھیرے گی۔ پھر ایک بار جب نجمہ ریڈیو پر فرمائشی پروگرام سن رہی تھی اور مائی اُس کے پاس کافی لائی تھی تو گانے میں جوبن کا لفظ سن کر مائی کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی تھی جیسے گانے والے نے اُس کے سینے میں مُکّہ کھینچ مارا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے کہا تھا "یہ تو بٹو جی! بڑی شرم کی بات ہے۔"

اور نجمہ نے کہا تھا "ہاں مائی! تمھاری عمر میں سچ مچ بڑی شرم کی بات ہے۔" اس کے بعد وہ خوب ہنسی تھی مگر یہ اکتاہٹ کی ہنسی تھی جیسے وہ ہنس نہیں رہی ہے چہرہ مکھیوں سے بچا رہی ہے۔

حلیمہ کو اُس نے صرف اس لیے ملازم رکھا تھا کہ جوان لڑکی ہے، اس سے دل کی بات کہی جائے گی تو پلکیں نہیں جھپکانے لگے گی۔ وہ غسل خانے میں ہوئی اور ادھر ریڈیو پہ فرمائشی پروگرام شروع ہو گیا تو وہ بے کہے ریڈیو آن کر دے گی اور یوں ایک بھی ریکارڈ ضائع نہیں جانے دے گی۔ وہ گھر میں چلتے پھرتے

گی تو دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ نہیں کھنچ جائے گا بلکہ زندہ رہنے کو جی چاہے گا۔"

مگر جس روز حلیمہ آئی تو دن بھر نجمہ سے دور رہنے کے بہانے ڈھونڈتی رہی۔ نجمہ نے اُسے بار بار پکارا اور وہ بار بار آئی مگر جھکی اور سمٹی ہوئی، جیسے جوانی کا محض سوانگ بھرے پھرتی ہے۔

رات نجمہ کو کھانا کھلانے کے بعد جب حلیمہ جانے کی سوچ رہی تھی تو نجمہ اٹھی اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ پھر حیران حلیمہ کو بازو سے پکڑا اور جھٹکے سے کھینچ کر اپنے بستر پر گرا لیا۔ حلیمہ پلش کے لحاف پر یوں گیند کی طرح اچھلی جیسے آگ میں گر پڑی تھی مگر بے تحاشا ہنستی ہوئی نجمہ نے اُسے پھر سے دھکا دیا اور وہ پھر پلش کا لحاف اپنے جسم کے مَس سے بچانے کی کوشش میں نجمہ کی مسہری دور تک دھکیلتی چلی گئی۔ پھر فرش پہ گر پڑی۔ مسہری کے پائے ٹائلوں والے صاف فرش پر چیخے تو دُور سے نجمہ کی امی کی آواز آئی: "کیا ہوا بیٹی؟"

نجمہ پکاری: "کچھ نہیں امی جی! حلیمہ سے پلنگ کی پوزیشن بدلوا رہی ہوں۔" پھر وہ حلیمہ کی طرف ہنستی ہوئی بڑھی۔ حلیمہ ڈر کر اٹھی اور کمرے کے ایک کونے میں دبک گئی۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو دیوانی؟" نجمہ نے حلیمہ کے پاس آ کر پوچھا "مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھو۔" حلیمہ نے ایک دم اپنا کھلا منہ اور پھٹی آنکھیں سمیٹ لیں۔ "تم میری نوکرانی نہیں ہو۔" نجمہ نے اُسے سمجھایا۔ "تم میری سہیلی ہو۔ تم میری باتنخواہ سہیلی ہو۔ میں بڈھوں میں گھر گئی تھی۔ گھر میں رہ کر بھی ایسا لگتا تھا جیسے موہنجوڈارو کے کھنڈروں میں گھوم رہی ہوں اسی لیے میرا دل بھی بوڑھا ہو رہا تھا۔ اب میں 'زہرِ عشق' کے بجائے مناجات بیوہ' پڑھنے کی سوچ رہی تھی۔ سمجھ رہی ہو میری بات؟"

حلیمہ کا منہ پھر کھلنے لگا مگر نجمہ کے اس سوال پر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی: "جی کچھ سمجھی ہوں، کچھ نہیں سمجھی ہوں۔"

نجمہ مسکرائی: "جو کچھ سمجھی ہو وہ مجھے بتاؤ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتاؤ۔"

خاموشی کے ایک مختصر سے وقفے میں حلیمہ نے ہمت باندھی، پھر پکھ نگل کر بولی: "جی بس اتنا سمجھی ہوں کہ آپ بھرے گھر میں اکیلی ہیں اور ، اور اکیلی ہیں۔"

"اور —— ؟" نجمہ نے پوچھا۔

"اور بہت اچھی بی بی ہیں آپ۔" حلیمہ سے صرف یہی الفاظ بن پڑے۔

نجمہ نے ہنس کر حلیمہ کا ہاتھ پکڑا۔ پھر اُسے اپنی مسہری کے پاس لے آئی اور بولی: "اچھی بی بیاں محبت تو نہیں کرتیں نا؟"

"جی نہیں۔" حلیمہ فوراً بولی۔

اور نجمہ نے پوچھا: "پھر میں اچھی کیسے ہو گئی؟ میں تو محبت کرتی ہوں۔"

---

* جس بات کا علم حاصل ہو وہی بیان کرو اور جس بات کا علم نہ ہو، اُس پر خاموش رہو۔ —— اِمام مالکؒ
* جو منانے پر بھی نہ منے، وہ شیطان ہے۔ —— اِمام شافعیؒ
* متواضع ہونے کی شرط یہ ہے کہ گھر سے باہر بھی کسی سے ملو تو اُسے اپنے سے افضل و برتر سمجھو۔ —— حسن بصریؒ
* اگر تم اپنے بھائیوں کی عزت کرو گے تو اُن سے تمہاری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔ —— حسن بصریؒ
* شریف بڑھتا ہے تو فروتنی کرتا ہے اور کمینہ بڑھتا ہے تو سر اٹھاتا ہے۔ —— وھب بن منبہؒ

نجمہ یہ کہہ کر مسہری پر بیٹھ گئی اور حلیمہ یوں کھڑی رہ گئی جیسے گاڑی یکایک چھوٹ گئی ہو۔

نجمہ نے مسہری پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا اور بولی: "آؤ، ادھر میرے پاس لحاف میں گھس آؤ۔"

"میں؟" حلیمہ نے پوچھا جیسے کمرے میں نجمہ اور اُس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہو۔

"تم نہیں تو کیا تمھارے فرشتے؟" نجمہ ہنسی۔ "کہہ جو چکی ہوں کہ تم میری نوکرانی نہیں ہو، سہیلی ہو۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ لوگ سہیلیاں بناتے ہیں، میں نے سہیلی رکھی ہے اور اگر تم اپنے آپ کو نوکرانی ہی سمجھتی ہو تو میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ ادھر میرے پاس گھس آؤ۔" حلیمہ ہکا بکا کھڑی رہی۔ "سنتی نہیں ہو؟" نجمہ نے ذرا رعب سے کہا۔ "چلو، ادھر آؤ۔"

حلیمہ اُس کی طرف یوں چلی جیسے ملزم حوالات کی طرف بڑھ رہا ہو۔ پھر وہ اُس کے پاس جا کر رُک گئی۔ نجمہ نے پل بھر انتظار کیا۔ پھر اُسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور جب وہ بستر پر گر پڑی تو اُسے لحاف اُڑھا دیا۔ حلیمہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی۔ پھر بولی: "قسم سے نجمہ بی بی! کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

نجمہ نے سمبل کے تکیوں سے سر اٹھایا اور حلیمہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا: "تم کتنی خوب صورت ہو حلیمہ! تمھاری آنکھیں کسی شاعر فرشتے نے بنائی ہیں اور تمھارے ہونٹ کسی مصوّر فرشتے نے تراشے ہیں۔ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے حلیمہ؟ مگر تم نے کیا کی ہو گی۔ تم سے تو محبت کی جانی چاہیے، کسی نے کی؟" حلیمہ جو نجمہ کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی، آنکھیں جھکا کر مسکرانے لگی: "اچھا تو پہلے میں بتاتی ہوں۔" نجمہ بولی: "میں نے صرف ایک محبت کی ہے اور میں نے جو تمھیں پچاس روپے مہینے پر بلایا ہے نا تو اسی لیے بلایا ہے کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔"

"پر کس سے نجمہ بی بی؟" حلیمہ نے پہلی بار کارروائی میں براہِ راست حصہ لیا مگر وہ یہ پوچھتے ہی ڈر گئی جیسے اُس کا مخاطب کوئی مرد ہے اور اُس

کے سوال کے جواب میں وہ اُسی کا نام لے دے گا۔

نجمہ نے لحاف کے اندر حلیمہ پر اپنا بازو پھیلا دیا اور بولی "آج تم چنا جور گرم والے سے چنے خریدنے گلی میں گئی تھیں نا تو سبز دروازوں، سبز کھڑکیوں اور سبز روشن دانوں والے جس مکان کے سامنے تم نے چنے خریدے اُس کا مالک شیخ منصور احمد ہے اور وہ اتنا خوب صورت ہے کہ اگر وہ عورت ہوتا اور میں مرد ہوتی تو اُسے بھگا لے جاتی۔" حلیمہ پہلی بار کھل کر ہنسی۔ نجمہ کہتی رہی "اُس کے گھر میں صرف وہی رہتا ہے یا نوکر چاکر ہیں جو اُس کے حکم کے بغیر اوپر کی منزل میں نہیں آ سکتے۔ اگر کوئی چاہے تو بڑی آسانی سے اُس کے پاس جا سکتا ہے اور گھنٹوں بیٹھ سکتا ہے مگر میں کیا کروں کہ بڑے باپ کی بیٹی ہوں اور میرا کسی ایسے گھر میں قدم رکھنا جس میں میری عمر کی کوئی لڑکی نہیں رہتی، ایسا ہی ہے جیسے نیکر بنیان پہن کر میں سڑک پر نکل جاؤں۔" حلیمہ ایک بار پھر ہنسی۔ نجمہ بولتی رہی۔ "میرے ہاں سے اگر کوئی وہاں جا سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔"

"میں؟" حلیمہ بستر میں اُٹھ بیٹھی۔

نجمہ نے تپائی سے ایک کتاب اٹھائی اور اُس میں سے ایک بند لفافہ نکال کر بولی "میں نے باتوں باتوں میں مہترانی سے اُس کے گھر کا سارا نقشہ پوچھ لیا ہے۔ اندر جاتے ہی دائیں ہاتھ کو سیڑھیاں ہیں جو سیدھی اوپر جاتی ہیں، تم اوپر چلی جانا، منصور کو سلام کرنا اور کہنا کہ اِس خط کی صورت میں بے حد شریف خاندان کی ایک لڑکی کی آبرو آپ کے پاس امانت رکھنے آئی ہوں۔"

"آپ نے اُسے خط لکھا ہے؟" حلیمہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" نجمہ بے حد سنجیدہ ہو رہی تھی۔ "میں نے اُسے لکھا ہے کہ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے، مجھے ایسا معلوم ہونے لگا ہے جیسے پوری دنیا میں صرف ایک مرد رہتا ہے اور وہ آپ ہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ کوئی سبیل نکالیے ورنہ میں کسی روز آپ کے کمرے میں چھرا لے کے داخل ہوں گی اور اُسے آپ کے سامنے اپنے سینے میں اتار لوں گی۔"

"ہائے نجمہ بی بی! قسم سے؟ یہ لکھا ہے آپ نے؟" حلیمہ نے پہلی بار نجمہ کے کندھے پکڑ لیے۔

"ہاں۔" اب نجمہ کی آنکھوں پر آنسوؤں کی ایک مہین سی تہہ پھیل رہی تھی۔ "میں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر صورت دیکھے بغیر محبت نہیں ہو سکتی تو بھی آپ کو مطمئن رہنا چاہیے کیونکہ مجھے میرا آئینہ روزانہ بتاتا ہے کہ میں بھی کچھ ایسی بری نہیں ہوں۔"

"بری نہیں ہوں!" حلیمہ بولی۔ "ارے نجمہ بی بی! قسم سے آپ تو چھپی ہوئی مورت ہیں۔ آپ تو اتنی خوب صورت ہیں کہ آپ کو میں نے پہلی بار دیکھا تو سوچا کہ یہ بی بی بے شک مجھے تنخواہ نہ دیں، بس مجھے دیکھا جانے دیں تو میرے لیے یہی بہت ہے۔"



نجمہ چونکی پھر ہنستی ہوئی اُس سے لپٹ گئی اور بولی "ہائے تم نے کیسی پڑھے لکھوں کی سی بات کی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بس یوں ہی ہو۔ تمہارے سینے کے اندر تو دل ہے۔"

حلیمہ شرما کر مسکرائی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "لائیے۔"

"اس وقت؟" نجمہ نے خط کتاب میں رکھ دیا۔ "اری نہیں دیوانی! اس وقت نہیں، رات بھی کوئی وقت ہے؟ صبح صبح سودا لینے کے بہانے نکلنا تو چلی جانا، اوپر کوئی نوکر ہو تو کہنا، شیخ جی سے ایک دکان کا پوچھنے آئی ہوں، بازار میں منصور کی اپنی بھی ایک دکان ہے اور بہت سی دکانیں کرائے پر دے رکھی ہیں۔ لوگ دکانوں کے لیے اُس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اور دیکھو میں نے خط میں اپنا نام نہیں لکھا۔ تم بھی نہ بتانا۔ پوچھے تو کہنا۔ بس کوئی ہے۔ اُس کے جواب ہی سے پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اگر وہ ایسا ویسا نکلا تو یوں کریں گے کہ تم اباجی کے لیے کشتے کے بہانے ذرا سی سنکھیا لے آنا۔ وہ میں چپکے سے کھا لوں گی اور میرے ساتھ میری محبت بھی ختم ہو جائے گی۔ محبت یوں ہی ختم ہوتی ہے۔ یوں ختم نہ ہو تو محبت نہیں ہوتی۔ بدچلنی ہوتی ہے، سمجھ گئی نا۔" مگر حلیمہ تو یہ بات سن کر رونے لگی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ حلیمہ بس اُسی دن روئی اور اس کے بعد تو وہ جیسے رونا بھول ہی گئی۔ چند ہی دنوں میں اُس کے اندر کی چنچلتا یوں اُمڈ گھمڈ کر نکلی کہ سارے گھر کو ہنسانے اور سارے محلے کو چونکانے لگی۔ ایک لڑکا تو اُس پر فدا بھی ہو گیا۔ جس گلی سے گزرتی، وہ نکڑ پر کھڑا آہیں بھرتا ملتا۔ ایک دن اُس نے حوصلہ کر کے کہہ بھی دیا کہ "حلیمہ! میں تم پہ مرتا ہوں۔"

اور حلیمہ پٹ سے بولی "مرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیا ہوتا کہ تمہاری ناک سامنے سے دیکھیں تو پورب سے پچھم تک پھیل رہی ہے اور ایک طرف سے دیکھیں تو جیسے تم گھر سے نکلتے ہوئے ناک کہیں الماری میں بند کر آتے ہو۔" اُس لڑکے کی محبت سنکھیے کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

حلیمہ شیخ منصور کے گھر یوں جانے لگی تھی جیسے اپنے گھر میں جا رہی

ہو۔ رقعہ دیتی، رقعہ لیتی، پھر نجمہ کے پاس آکر دروازہ اندر سے بند کر دیتی اور کہتی "پڑھیے نجمہ بی بی! اونچا اونچا پڑھیے۔"

نجمہ پڑھتی "تم نے یہ کیا ستم توڑا ہے کہ اپنے کاروبار میں میرا جی ہی نہیں لگتا۔ دکان پر بھی جاتا ہوں تو تمھارے خط ساتھ لے جاتا ہوں اور انھیں باربار پڑھتا ہوں۔ اب، کہ تم نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم کون ہو، یہ دوری مجھے اور بھی مارے ڈال رہی ہے کل ایک شخص نے سات رُپے کے رُومال خریدے اور مجھے دس رُپے کا نوٹ دیا۔ میں نے تین کی جگہ اسے ترانوے رُپے تھما دیے اور اُس اللہ کے بندے نے بھی انھیں اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میرا ایک آدمی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ٹوکا تو گاہک بولا کہ میں سمجھا شیخ صاحب زکات نکال رہے ہیں۔ میرا آدمی نہ دیکھتا تو نوّے کی ڈز پڑ گئی تھی۔ تو میرے ذہن کا یہ عالم ہے اور تم ایسی ظالم ہو کہ آج تک ذرا سی جھلک بھی نہ دکھائی۔ تم کہتی ہو تم ہر روز مجھے چق سے دیکھتی ہو، تو کیا یہ چق اتنی بھاری ہے کہ تم سے ذرا سی اُٹھ نہیں سکتی؟ کیا یہ بھینسے کی کھال سے بنی ہوئی چق ہے؟"

نجمہ اور حلیمہ ایک دم کھل کھلا کر ہنسنے لگتیں۔ پھر حلیمہ نجمہ کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اُس کی مسہری پر گراتی اور اُسے پیار کرنے لگتی اور کہتی "قسم سے نجمہ بی بی! آپ کے رقعے کے انتظار میں وہ ایسا تیار بیٹھا ہوتا ہے جیسے بلّی چڑیا کی تاک میں ہو۔ مجھے دیکھتا ہے تو یوں فراٹے سے آکر رقعہ چھینتا ہے کہ میرے تو پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ آج تو اُس نے شاید سیڑھیوں پر میرے قدموں کی چاپ سن لی۔ ابھی میں آخری سیڑھی پر تھی کہ میرے ہاتھ سے رقعہ جھپٹ کر وہ گیا اور میں گرتی گرتی بچی۔ سیدھی سیڑھیاں ہیں۔ گرتی تو کھوپڑی ہنڈیا کی طرح پھیتے پھیتے ہو جاتی۔"

"اور جب تک وہ میرا رقعہ پڑھتا اور اپنا رقعہ لکھتا ہے، تم کیا کرتی ہو۔" نجمہ کہتی۔

حلیمہ کہتی "میں بس اُس کی کتابوں میں مُورتیں دیکھتی رہتی ہوں۔"

ایک دن حلیمہ نے اسی سلسلے میں بتایا کہ "نجمہ بی بی! ہائے کیسے بتاؤں، اُس کے پاس ایک کتاب ہے۔ اُس میں ننگی تصویریں ہیں قسم سے، بالکل الف ننگی۔ یہاں وہاں دو اُنگل دھجی بھی نہیں، سہاگ رات کو پوچھ لیجیے گا اُس سے۔ کوئی کھڑی ہے، کوئی بیٹھی ہے، کوئی لیٹی ہے، کوئی دُہری ہو گئی ہے، کوئی تہری ہو گئی ہے، قسم سے۔"

"ہائے ایسی ہے وہ کتاب!" نجمہ کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"جی" حلیمہ نے جی کی "ی" کو لٹکایا۔ "پرسوں وہ رقعہ لکھ رہا تھا۔ میں نے کیا کیا کہ یہی کتاب کھول کر اُس کے سامنے رکھ دی مگر وہ اللہ کا بندہ اتنا سا بھی نہ گھبرایا۔ بولا۔ ارے یہ کہاں سے اُٹھا لائی ہو میری ڈاکٹری کی کتاب۔ سو نجمہ بی بی! آپ کا شیخ منصور احمد صرف کاروباری نہیں ہے لیڈی ڈاکٹر بھی بننے والا ہے۔"

اس دوران میں حلیمہ پر کپڑوں کے نت نئے بدلتے فیشنوں کے دم سے جمپروں اور شلواروں کے ڈھیر لگتے رہے اور اُس کی تنخواہ میں اضافے پر اضافہ ہوتا رہا۔ پھر حلیمہ کے دم سے نجمہ کو محلّے کے سو سوا سو بالغ افراد میں سے ہر ایک کے معاشقے بھی معلوم تھے سو وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کس کی کس کے ساتھ دوستی لگی ہے، کون کسے دھوکا دے کر کدھر جھک گیا ہے اور کس نے کس کے ہاتھ کیوں رقعہ بھیجا ہے۔ حد یہ تھی کہ جب نجمہ اور حلیمہ چق کی اوٹ میں بیٹھی ہوتیں اور سڑک سے کوئی برقع پوش لڑکی گزرتی تو حلیمہ بُرقع ہی سے پہچان لیتی کہ یہ اس محلّے کی نہیں ہے اور — "اگرچہ میں اسے نہیں جانتی مگر یہ کہیں خراب نیّت سے نہیں جا رہی ہے۔ نیت خراب ہو تو چال بولتی ہے۔ یہ ضرور کسی خالہ ممانی سے ملنے جا رہی ہے۔"

محبّت کے بعد نجمہ کے صرف دو محبوب مشغلے تھے۔ نئے فیشن کے کپڑے اور محلّے کے اسکینڈل۔ یہ شوق اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ اگر کالج میں اُس نے کسی لڑکی کے دوپٹے کا ایک سرا محض اتفاقاً بال پن سے اٹکا پایا تو اسی کو فیشن بنا لیا اور محلّے میں کوئی زور سے چھینکا بھی تو حلیمہ کو دوڑایا کہ سُن گُن لے آئے۔

ایک روز نجمہ نے شام کے بعد حلیمہ کو بلایا اور اُس سے کہا "وہ اُدھر منصور کے گھر کی پرلی طرف سے عورتوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ذرا جا کر معلوم تو کرو کہ کیا ہوا ہے۔"

حلیمہ تیر کی سی تیزی سے گئی مگر خاصی دیر تک نہ آئی۔ نجمہ چق کی اوٹ سے گلی میں جھانکتی رہی مگر کہیں حلیمہ کا پتہ نہ تھا۔ اُس نے کمرے میں روشنی بھی نہیں کی۔ وہ بار بار چق کے پاس کیسے جا سکے گی۔ اُس کی امّی نے آکر اُسے پکارا تو وہ بولی۔ "کیا ہے امّی؟"

امّی نے روشنی کر دی اور پوچھا "اندھیرے میں کیا کر رہی ہو بیٹی؟"

نجمہ بولی "سر میں درد ہے۔"

"تو پھر کھڑی کیوں ہو؟" امّی نے پوچھا۔

"بس ٹہل رہی تھی۔" نجمہ نے جواب دیا۔

حلیمہ سے سر دبواؤ، وہ کہاں ہے؟" امّی نے پھر پوچھا۔

"اسپرو لینے بھیجا ہے۔" نجمہ نے فوراً جواب گھڑا۔

"اسپرو؟" امّی بولیں۔ "تمھارے ابّا کے لیے میں نے درجنوں منگوا رکھی ہیں۔ تم لیٹ جاؤ۔ میں ابھی لاتی ہوں۔"

امّی پلٹیں تو حلیمہ آ گئی۔ وہ اتنی سنجیدہ ہو رہی تھی جیسے ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر اُس کی عمر دس سال بڑھ گئی ہے۔ "اسپرو لائیں؟" امّی نے پوچھا۔

حلیمہ بس ایک پل کو جھجکی۔ پھر بولی "جی نہیں ملی۔"

"اسپرو نہیں ملی؟" امّی حیران رہ گئیں۔ "یہ بھی کوئی نہ ملنے والی چیز ہے۔"

حلیمہ نے بڑے بھول پن سے کہا "جی میں نے تو یہاں سے وہاں

تک سارے سبزی والوں سے پوچھا ہے کسی کے پاس نہیں۔"

"سبزی والوں کے پاس؟" امّی نے قہقہہ مارا اور نجمہ بھی ہنسنے لگی۔ "رہیں نا وہی گنوار کی گنوار۔" پھر وہ چلی گئیں۔

نجمہ سنجیدہ ہو کر حلیمہ کی طرف بڑھی مگر اب حلیمہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی

"کیوں نجمہ بی بی! قسم سے کیسا بہانہ گھڑا؟"

"مگر تمھیں ہوا کیا تھا"؟ نجمہ نے پوچھا۔

حلیمہ کچھ کہنے لگی تو امّی اسپرے لے آئیں۔ پھر جب وہ نجمہ کو چند ہدایات دے کر چلی گئیں تو حلیمہ بولی۔ "ایک لڑکی بھاگ گئی۔ وہ جس کا دوپٹا برقع سے ہمیشہ نکلا رہتا تھا۔ اری نجمہ بی بی! وہی جو اُس روز کپڑے والے سے قیمت چکا رہی تھی کہ برقع کی نقاب اٹھا دی اور کپڑے والا مفت کپڑا دے گیا۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔"

"مجھے تو یاد نہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"تو پھر میں بتانا بھول گئی ہوں گی۔" حلیمہ بولی۔ "بس وہ لڑکی بھاگ گئی۔ ایک سہیلی کے ساتھ سینما دیکھنے گئی اور اُسی سہیلی کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ اُس کا کوئی دوست تھا جو برقع پہن کر آیا تھا۔"

پر یہ سب پتہ کیسے چلا؟" نجمہ نے پوچھا۔

"یوں کہ سینما کا وقت ختم ہو گیا اور وہ نہ آئی۔ پھر اُس کی ڈھونڈ یا پڑی۔ پھر اُس کی ماں وہیں اُس کے بستر پہ بے ہوش ہو گئی۔ کسی نے تکیہ ٹھیک کیا تو نیچے سے لڑکی کا رقعہ نکلا۔ اُس میں وہ لکھ گئی ہے کہ "ہم چلے۔"

"بے حیا۔" نجمہ نے گالی دی۔

"اُس کے باپ نے تو کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا ہے اور اس کا بھائی گلیوں میں چاقو لیے پھرتا ہے۔"

"ہائے۔" نجمہ ڈر گئی۔ "پر تم نے کیوں اتنی دیر لگا دی؟"

"میں اُس کی ماں بے چاری کے تلوے ملتی رہی۔ اب ہوش میں آئی ہے تو میں اُٹھ آئی۔"

"اب کیا ہوگا؟" نجمہ نے پوچھا۔

اور حلیمہ بولی۔ "ہونا کیا ہے بی بی! ہوتا آیا ہے ایسی بھی کیا بات ہے؟"

پھر حلیمہ جانے لگی تو نجمہ نے کہا۔ "اپنا کھانا یہیں اٹھا لاؤ۔ اکٹھے کھائیں گے۔"

حلیمہ بولی۔ "آج تو نجمہ بی بی! قسم سے میری طبیعت اتنی اُلجھ رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ بس بستر پہ لیٹوں گی۔ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔ آج رات کی چھٹی دے دیجیے۔" پھر وہ ایک دم ہنسنے لگی اور بولی۔ "ہائے بڑی بی بی جی کے سامنے مجھے کیسا مزے کا بہانہ سوجھا۔ کیوں نجمہ بی بی؟" اور وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

اب حلیمہ کا معمول سا ہو گیا تھا کہ نجمہ کے کسی حکم کی تعمیل میں جاتی تو دیر سے واپس آتی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی کہ درد ہو رہا ہے۔ انھی دنوں

مہینے کی پانچویں تاریخ کو اُس کی ماں تنخواہ لینے آتی۔ پہلے اُس نے بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی کو سلام کیا۔ پھر حلیمہ سے رقم لینے کے لیے اُسے الگ لے گئی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اُس نے حلیمہ کو دو ہتڑوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ نجمہ اور اُس کی امّی آواز سُن کر نیچے بھاگیں مگر جب تک وہ حلیمہ کو ہاتھ سے گھسیٹ کر باہر گلی میں لے جا چکی تھی۔ نجمہ اور اُس کی امّی نے فوراً اوپر آکر چھت سے نیچے جھانکا تو حلیمہ کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی اور اُس کی ماں نے اُس کا بازو اُسی طرح جکڑ رکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار نجمہ کی آواز چھت کی چلمنی سے نکلی اور وہ پکاری: "حلیمہ! —— اے حلیمہ!"

مگر اوپر نہ حلیمہ نے دیکھا نہ اُس کی ماں نے اور دونوں گلی کے موڑ پر غائب ہو گئیں۔

نجمہ کی امّی نے اُسے فوراً پیچھے کھینچ لینا چاہا: "محلّے میں اتنا اونچا نہیں بولتے بیٹی! کوئی تمھاری آواز سُن لیتا تو کیا کہتا؟"

نجمہ کھڑکی سے ہٹ آئی اور بولی "مگر امّی! یہ آخر کیا ہوا؟"

امّی نے اُسے سمجھایا کہ "اُجڈ لوگ ہیں، بڑی بڑی باتیں پی جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر گلے کاٹ دیتے ہیں۔ حلیمہ نے کہیں پیسے خرچ کر ڈالے ہوں گے۔ بڑھیا کو ہر مہینے بندھی ہوئی آمدنی ہو رہی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرتی۔ مار پیٹ کر لے گئی، کل کلاں لے آئے گی۔"

مگر کل کلاں کیا، حلیمہ مہینوں تک واپس نہ آئی۔

اور جب روز آئی۔ اُس روز نجمہ کا گھر رنگ رنگ کی جھنڈیوں سے دلھن بن رہا تھا اور سڑک تک کی لمبی گلی نے شامیانے اور قناتیں اور قالین اوڑھ رکھے تھے۔ حلیمہ نے فوراً پلٹ کر سبز دروازوں، سبز کھڑکیوں اور سبز روشن دانوں والے مکان کی طرف دیکھا مگر وہاں تو محلّے کے چند کتّے ایک ایک ہڈی کے مسئلے پر لڑ رہے تھے۔

حلیمہ کے پاؤں میں پھٹا پرانا جوتا تھا۔ اُس کے کپڑے ڈھیلے اور میلے تھے اور اُس کی لٹیں دُھول نے رسیاں بنا ڈالی تھیں کہ وہ آئی اور سیدھی اُوپر جانے لگی۔ عورتوں کا اتنا ہجوم ہو رہا تھا کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جنگلے کے ساتھ اُس کی کمر چھل چھل گئی مگر اُسے کسی نے نہ پہچانا۔ پھر اوپر سے ہانپتا ہوا نشر فو آیا۔ اُسے گھور کر دیکھا اور بولا "اے! اوپر منہ اٹھائے کہاں جا رہی ہے؟ جا —— باہر سے مانگ۔" پھر وہ تیزی سے نیچے اُتر گیا اور حلیمہ اوپر نجمہ کے کمرے میں آ گئی۔

رنگ رنگ کے ریشم میں لپٹی ہوئی ساٹھ ستّر لڑکیوں نے اس مخلوق کو ایک ساتھ دیکھا۔ پھر کوئی ہنسا تو سب ہنسنے لگیں۔ حلیمہ اُن میں سے کئی کو پہچانتی تھی اور اُن کا سارا کچا چٹھا بیان کر سکتی تھی مگر پھر وہ سب ایک دم خاموش ہو گئیں کیونکہ دلھن اُٹھی، روتی بلکتی ہوئی جھپٹی اور حلیمہ سے لپٹ گئی: "اری حلیمہ! اری میری سہیلی! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم حلیمہ ہی ہو نا؟"

"جی ہاں نجمہ بی بی۔" وہ بولی۔ "ہوں تو حلیمہ ہی۔"

"اور یہ کون ہے؟" نجمہ نے مہینے دو مہینے کے بچّے کی طرف اشارہ کیا جسے حلیمہ نے اُٹھا رکھا تھا۔

"جی یہ میرا بیٹا ہے۔" حلیمہ بولی

"اری کم بخت" نجمہ مسکرائی اور اُس کے کندھے پر چپت ماری۔

"تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں اور چپکے سے شادی کر لی۔"

حلیمہ بولی "شادی تو کر لی نجمہ بی بی! چپکے ہی سے کر لی، کرنی پڑ گئی، کرنی پڑتی ہے۔"

لڑکیاں ہنسنے لگیں تو حلیمہ نے نجمہ کو بازو سے پکڑا اور ملحقہ غسل خانے میں لے گئی۔ ذرا سی دیر بعد ایک چیخ نکلی اور کسی کے دھب سے گرنے کی آواز آئی۔ لڑکیاں گھبرا کر اٹھیں اور غسل خانے کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی پھر نجمہ کی امّی کو راستہ دیا گیا۔ انھوں نے اندر جا کر دیکھا کہ نجمہ فرش پہ بے ہوش پڑی ہے۔ حلیمہ زور زور سے اُس کی ہتھیلیاں مل رہی ہے اور بچہ فرش میں گرتے ہوئے فلش کے بیسن میں لڑھک گیا ہے اور رو رہا ہے۔

نجمہ کی امّی نے وہیں فرش پر بیٹھ کر بیٹی کا سر گود میں رکھ لیا۔ لڑکیاں اُس کی ہتھیلیوں اور تلووں سے چمٹ گئیں اور حلیمہ بچّے کو فلش سے اٹھا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

پھر دروازے میں کھڑی ہوئی لڑکیاں دوپٹّے سروں پر پھیلاتی اِدھر اُدھر ہٹ گئیں اور نجمہ کے ابّا گھبرائے اور ہانپتے ہوئے آ گئے۔ نجمہ کے ہاتھ پیروں میں حرکت آ چلی تھی اس لیے اُدھر سے مطمئن ہو کر وہ حلیمہ کے سامنے آئے اور گرج کر پوچھا: "سچ سچ بتا، کیا ہوا؟"

حلیمہ دُور سے آتی ہوئی آواز میں بولی: "میں نے تو میاں جی! قسم سے بس اتنا کہا کہ نجمہ بی بی کو شادی کی مبارک باد دی اور کہا کہ نجمہ بی بی خدا کا شکر ہے کہ آپ کی شادی شیخ منصور احمد جیسے کمینے سے نہیں ہو رہی ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟" نجمہ کے ابّا کڑکے۔ "اُسی سے تو ہو رہی ہے۔"

حلیمہ کی آنکھیں جیسے پتھرا گئیں۔ "اُسی سے ہو رہی ہے؟ مگر میاں جی! وہاں اُس کے گھر کے سامنے تو ——"

"وہ گلبرگ چلا گیا ہے۔" نجمہ کے ابّا دہاڑے۔ "پر کتیا تو نے اُسے کمینہ کیوں کہا ہے؟"

حلیمہ خاصے وقفے تک اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی۔ پھر نظریں جھکا لیں اور بچّے کو ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر لاتی ہوئی بولی: "غلطی ہو گئی میاں جی!"





بورس لاسکن ٭ عمر

تین رقیبوں کی ایک کہانی

فرض کیجیے اُن میں سے ایک آپ ہوں

رُوس سے ایک خوشنما اور دل پذیر تحریر

وہ ہم تینوں دوستوں کی مشترکہ پسند تھی۔ اُسے ہم تینوں بیک وقت دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے اور ہم میں سے ہر فرد اُسے اپنانے کے لیے مختلف منصوبے بناتا تھا۔

ایک روز ہم تینوں یعنی میں، سرجی اور ڈمسکا ایک جگہ جا رہے تھے۔ وہ کالج کے بڑے دروازے سے اپنی سہیلیوں کے ہمراہ اچانک نمودار ہوئی۔ وہ اور اُس کی سہیلیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہنستی، مُسکراتی، گنگناتی، مٹکتی ہوئی رستے کے بیچوں بیچ چل رہی تھیں۔ ہم دلچسپی سے انھیں دیکھ رہے تھے اور آنکھوں آنکھوں میں اُن کی ہر ادا کی داد دے رہے تھے۔ ہمارے علاوہ اکثر دوسرے راہ گیر بھی اُن کی طرف متوجہ تھے مگر وہ اتنے الھڑ اور لااُبالی پن کا مظاہرہ کر رہی تھیں جیسے انھیں کسی کی موجودی کا احساس ہی نہ ہو۔

وہ اپنی سہیلیوں کے بیچوں بیچ چل رہی تھی۔ اُس کی لمبی، گھنیری زُلفیں، غزالیں آنکھیں اور مستانہ خرامی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اِس قدر خوب صورت تھی کہ قلم میں اُس کی خوب صورتی کا حق ادا کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ ہم اُن کے قریب پہنچ کے رُک گئے۔ ڈمسکا نے دھیمی آواز میں

سب رنگ

کہا: "اِن کے پیچھے چلنا چاہیے، کیا خیال ہے؟"

"بہت نیک خیال ہے۔" سرجی نے کہا۔ "میں نے اس قدر دِل کش لڑکی آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

"ہاں بُری نہیں ہے۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔ سچ پوچھیے تو وہ مجھے بھی بہت پسند آئی تھی مگر میں سرجی اور ڈمکا پر اپنی دلی کیفیت ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنی مردانہ خوبیوں میں یہی چیز سب سے زیادہ پسند ہے کہ میں ایک دم پھٹ نہیں پڑتا۔ "لڑکیوں کو جتنا کم چاہا جائے، وہ اُتنا ہی زیادہ جھکتی ہیں۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔

وہ دوسرے روز ایک جگہ پھر ہمیں نظر آئی۔ وہ ایک چھوٹا سا خوش نما پرس شانے سے لٹکائے ہوئے بے نیازی کے ساتھ ڈیزی کے پھول کی پتیاں الگ کرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ وہی لمبی گھنیری زلفیں، غزالیں آنکھیں اور مستانہ خرامی۔ ڈمکا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت ہمارے ہی متعلق سوچ رہی ہے۔ دیکھو دیکھو، وہ پھول کی پتیوں سے یہ معلوم کر رہی ہے کہ ہم تین لڑکوں میں سے کون سا لڑکا اُسے چاہتا ہے اور کون سا نہیں چاہتا۔" وہ چلتے چلتے ہمارے قریب آ گئی تھی۔ میں نے اُسے سنانے کے لیے قدرے بلند آواز میں کہا: "وہ تمھیں نہیں چاہتا۔"

وہ چونک گئی۔ "کون نہیں چاہتا؟" اُس نے گویا خیالوں کی دُنیا سے واپس آتے ہوئے معصومیت کے ساتھ دریافت کیا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کی نگاہوں کا مرکز ڈمکا ہے۔ ہمیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کے وہ جز بز سی ہوئی۔ "معاف کیجیے گا، آپ لوگ غلط سوچ رہے ہیں۔" اُس کے مترنم لہجے میں شرم بھی تھی اور عاجزی بھی۔ "میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ امتحان میں کامیاب ہو جاؤں گی یا نہیں؟"

"کل کس مضمون کا پرچہ ہے؟" ڈمکا نے دریافت کیا۔

"کیمیا کا۔" لڑکی نے پُر اُمید انداز میں بتایا۔

"اگر آپ چاہیں تو میں اپنے نوٹس آپ کو دے سکتا ہوں۔" ڈمکا چہکا۔ میں اور سرجی خاموش کھڑے تھے۔

"اوہ، آپ کی بڑی نوازش ہو گی۔" لڑکی ممنونیت سے بولی۔ "میں بڑی خوشی کے ساتھ اُن سے استفادہ کر لوں گی۔ آپ جب جانے لگیں تو براہِ کرم نوٹس میرے پاس چھوڑتے جائیے گا۔"

"کہاں؟" ڈمکا نے پوچھا۔ وہ ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔

"بلاک نمبر دو، دوسری منزل، کمرہ نمبر پانچ۔"

"اور تمھارا نام؟" ڈمکا نے دریافت کیا۔ اب وہ شیر بن گیا تھا۔

"ہلینا۔" لڑکی نے مختصر جواب دیا۔

"بڑا اچھا نام ہے۔" ڈمکا نے کہا۔

ہلینا نے اپنے ہونٹوں پر تبسم سجا کے پہلے ڈمکا کی طرف اور پھر ہماری طرف دیکھا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ ہم ایک دو منٹ تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر خود بھی آگے بڑھ گئے۔ راستے بھر ہم تینوں اپنے اپنے انداز میں اُس کی تعریف کرتے رہے۔

تو ہم تینوں نے اِس طرح اُس کا نظارہ کیا اور بیک وقت اُسے چاہنے لگے۔ ڈمکا اُسے نوٹس دیتا رہا۔ یہ نوٹس ہم تینوں کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہوتے تھے، ہماری مشترکہ محنت کے بل بوتے پر وہ امتحان میں کامیاب ہو گئی۔ ہم تینوں گل دستے لے کے اُس سے ملنے گئے، اُس نے ہمارے گل دستوں کا شکریہ ادا کیا، پھر ہم سب نے مل کر تھیٹر دیکھا۔ تھیٹر میں اس سے ہماری خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اِس لیے اُس روز کے بعد سے ہم اُسے ساتھ لے کے اکثر تفریح کے لیے جانے لگے۔ ایک دن ہم شہر سے باہر پکنک کے لیے گئے۔ پھر ایک دن ہم نے کشتی میں بیٹھ کے دریا کی سیر کی۔ ایسی تفریحات ہمارا معمول بن گئی تھیں۔ وہ ہم تینوں کے ساتھ بہت خوش رہتی تھی اور اپنی دل آویز باتوں سے ہمیں بھی خوش کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع کا ذکر ہے، میں نے کوئی چیز اُٹھانے کے بہانے جُھک کر اُس کے ہاتھوں کا بوسہ لے لیا تھا مگر اِس طرح لیا تھا کہ اگر سرجی اور ڈمکا دیکھ بھی لیں تو یہ سمجھیں کہ یہ محض ایک اتفاقی امر ہے مگر سرجی کی نگاہ بڑی تیز نکلی، اُس نے میری چوری پکڑ لی اور بعد میں زبردست شکایت کی۔ ڈمکا نے بھی شکایت میں اُس کا پورا ساتھ دیا۔ اُنھیں شکایت کرنی ہی چاہیے تھی کیونکہ ہلینا ہم تینوں کی مشترکہ محبوبہ تھی اور اُس پر محض کسی ایک کا حق نہیں تھا۔

تو ہم تینوں اُسے پسند کرتے تھے اور تینوں ایک دوسرے پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہماری پسندیدگی خود غرضی سے پاک ہے۔ دوسری طرف ہلینا بھی نرم دلی سے بیک وقت ہم تینوں ہی کو پسند کرتی تھی۔ اُس کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو زیادہ چاہتی ہے۔ پھر بھی میری اور سرجی کی رائے یہ تھی کہ ہم دونوں کے مقابلے میں اُس کا جھکاؤ ڈمکا کی طرف زیادہ ہے۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ ہم تینوں ایک دوسرے سے اور ہلینا سے بہت دُور چلے گئے۔ آخری بار ملنے کی غرض سے جب ہم اُس کے پاس گئے تھے تو ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی وقت ماسکو آیا تو ہلینا سے ضرور ملے گا مگر ملاقات کے وقت میز کے گرد چار کرسیاں رکھی جائیں گی۔ چنانچہ جنگ کے دوران میں ہم لوگ جب بھی ماسکو پہنچے، ہلینا سے ضرور ملتے مگر ایک ساتھ نہیں، الگ الگ کیونکہ ہم الگ الگ ہی ماسکو پہنچتے تھے۔ ایسے ہر موقع پر معاہدے کی رُو سے میز کے گرد چار کرسیاں لگائی جاتیں۔ ہم میں سے جس نے بھی اس انداز میں ہلینا سے ملاقات کی،

اُس نے یہی محسوس کیا کہ ہم سب جُدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہیں موجود ہیں اور یقیناً ایک دن پھر چاروں ایک ساتھ ملیں گے۔

کچھ وقت اسی طرح گزر گیا۔ پھر میں اور سرجی ایک دفعہ ساتھ ساتھ ماسکو پہنچے۔ ہمیں ہلینا سے ملنے کی ایسی بے تابی تھی جیسے صرف اُسی سے ملنے کے لیے ماسکو آئے ہوں۔ ہم پہلی فرصت میں ہلینا سے ملے۔ ملاقات کے وقت بدستور میز کے گرد چار کرسیاں رکھی گئیں۔ ہلینا نے ہم سے جنگ کے متعلق ڈھیروں باتیں پوچھیں اور ڈمکا کی خیریت خاص طور پر دریافت کرنے لگی۔ ہم نے اُسے ڈمکا کی خیریت سے مطلع کیا اور ڈمکا کی بہت تعریف کی کیونکہ ہمیں احساس تھا کہ ہلینا ہمارے مقابلے میں ڈمکا کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ وہ ہلینا کو برابر خط لکھتا رہتا تھا۔ ہلینا نے ہمیں اُس کا ایک خط پڑھ کر سنایا۔ ڈمکا نے لکھا تھا کہ جلد ہی اُسے محاذ سے واپس بلایا جا رہا ہے اور اُسے ماسکو سے صرف ایک سو کلومیٹر دُور ایک فیکٹری میں متعین کیا گیا ہے۔ میں نے اور سرجی نے غیر محسوس انداز میں ایک ایک ٹھنڈی آہ بھری لیکن شاید ہلینا نے ہماری یہ کیفیت محسوس کر لی اس لیے ہمیں تسلّی دینے اور پچکارنے کے انداز میں مسکرا کر بولی "یہ سب کچھ ویسا ہی رہے گا دوستو! جیسا پہلے تھا۔ کسی تفریق اور امتیاز کے بغیر تم تینوں میرے دوست رہو گے۔" مگر اُس کی آنکھوں میں ہم نے مسرت کی ایک لکیر دیکھ لی۔ وہ لکیر اُس کی آنکھوں میں ڈمکا کے قریب آنے کی بشارت پر چمکی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ میں اور سرجی نومبر میں فوجی اعزازات کی تقریب میں شرکت کے لیے پہنچے اور ہلینا سے ملے۔ ہلینا نے ڈمکا کو بھی تار دے کے بلوا لیا۔ بھلا ہلینا تار دیتی اور ڈمکا نہ آتا؟ وہ تار ملتے ہی ماسکو کے لیے روانہ ہو گیا اور بہت جلد ہم سے آملا۔ اس طرح خاصی طویل مدت بعد ہم تینوں ایک ساتھ ہلینا سے ملے۔ ہلینا نے اس موقع پر اپنی کچھ سہیلیوں کو بھی مدعو کرنا چاہا تھا مگر ہم نے اُسے منع کر دیا تھا۔ ہم یہ ملاقات صرف اپنے تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔

ہلینا نے اپنا سب سے دیدہ زیب اور خوش نما لباس زیب تن کیا۔ وہ بہت ہی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم تینوں اُسے محویت سے دیکھتے رہے اور گزشتہ دنوں کی خوش گوار یادیں تازہ کرتے رہے۔ ہلینا نے ڈمکا سے اُس کی نئی ڈیوٹی کی تفصیلات سُنیں۔ پھر گفتگو کرتے کرتے ہم تینوں سے وہ اچانک بولی۔ "اچھے دوستو! آج میں نے ایک بہت لذیذ کیک تیار کیا ہے۔ یہ کیک میری طرف سے تمہارے لیے آج کی ملاقات کا خصوصی تحفہ ہے، انتظار کرو میں لاتی ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ ہلینا نے یہ خصوصی تحفہ کیوں تیار کیا ہے۔ میں نے ہکلا کے کہا۔ "ہلینا! میرا ایک عاجزانہ مشورہ ہے کہ......"



اُس نے توجّہ دیے بغیر میری بات کاٹ کے کہا۔ "کہو کہو، کیا بات ہے؟" سرجی اور ڈمکا میری طرف متوجّہ تھے۔

میں نے اپنی تمام تر ہمّت جمع کی اور کہا۔ "سرجی، ڈمکا اور میں، ہم تینوں تمھیں کسی کمی بیشی کے بغیر مساوی طور پر بے پناہ چاہتے ہیں اور ...."

ہلینا نے پھر جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ "میں بھی تمھیں، سرجی اور ڈمکا کو مساوی طور چاہتی ہوں۔"

اُس کے لہجے میں سادگی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ یہ بات وہ صرف اخلاقاً کہہ رہی ہے کیونکہ دو کو وہ رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ دل سے کسی ایک ہی کو پسند کرتی ہے لیکن وہ ایک کون ہے؟ اور وہ دو کون ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مجھے وثوق سے یہ علم نہیں تھا کہ وہ دو کون ہو سکتے ہیں۔ "سنو ہلینا!" میرے لہجے میں التجا تھی۔ "میں مانے لیتا ہوں کہ تم ہم تینوں ہی کو پسند کرتی ہو اور کسی ایک کو دوسروں پر فوقیت نہیں دیتیں لیکن اگر یہ بات سچ ہے تو ایسا کرو کہ تم کیک میں ایک سکّہ چھپا دو۔ کیک تین برابر حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے گا پھر جس کے حصّے میں سکّہ آ جائے گا وہ ...."

"خوش قسمت کہلائے گا۔" سرجی نے لقمہ دیا۔

ہلینا شانے جھٹک کے شرمیلے انداز میں مسکرائی "ٹھیک ہے، یہی کرتے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ کمرے سے چلی گئی اور ہم بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔

"وہ آج ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت نظر آ رہی ہے۔" سرجی

نے کہا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، وہ ہمیشہ خوب صورت لگتی ہے" ڈمکا نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"لگے گی کیوں نہیں" میں نے کہا۔ "جب ایک لڑکی کے تین تین امیدوار ہوں گے تو وہ خود بخود خوب صورت لگے گی۔"

گفتگو اس سے آگے نہیں چل سکی۔ ہم تینوں کے دلوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ واقعی ہلینا ایک پری تھی۔ اُسے حاصل کر کے ہم میں سے کوئی بھی خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین نوجوان سمجھ سکتا تھا۔ سرجی نے اپنے خیالات جھٹکنے کے لیے سگریٹ نکال لیا اور ڈمکا پیانو پر بے ڈھنگے سُر چھیڑنے لگا۔ وہ یقیناً کچھ زیادہ پریشان تھا مگر ہم سے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سرجی نے مجھ سے کہا "میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم کچھ نروس ہو گئے ہو۔"

"نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور سنو، سگریٹ سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہ اشد ضروری ہوتا ہے کہ اسے سلگایا بھی جائے۔ دُھواں یوں ہی نہیں نکلتا۔ چاہے کتنے ہی گہرے کش کیوں نہ لو۔" میں نے اُس کی توجہ سگریٹ کی طرف دلائی۔ وہ سگریٹ جلائے بغیر پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری بات سُن کے وہ مسکرایا۔ اُس نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال کے دوبارہ پیکٹ میں رکھ دیا۔ ہم نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"بھئی ڈمکا! اب بند کرو یہ بے وقت کی راگنی، وہ آ رہی ہے۔" سرجی نے ہنس کے کہا۔

آخر ہلینا آ گئی۔ وہ کیک بھی ساتھ لائی تھی۔ کیک اُس نے میز پر رکھا اور کہنے لگی۔ "اِسے کاٹے گا کون؟"

ہم نے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سرجی نے ہلینا سے کہا۔ "بہتر یہ ہے کہ اسے تم خود اپنے ہاتھ سے کاٹو، یہی بہتر ہو گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ہم ہلینا کا ہاتھ اپنی قسمت کا ہاتھ سمجھ لیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور ڈمکا! تمھارا کیا خیال ہے؟" ہلینا نے مسکراتے ہوئے اُس سے دریافت کیا۔

"میں اپنے دوستوں کی بات سے متفق ہوں۔" ڈمکا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

ہلینا نے چھُری اُٹھائی اور کیک برابر برابر تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ہم تینوں نے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اپنے اپنے حصے کا کیک اُٹھا لیا مگر خاصی دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور کیک کھانے سے ہچکچاتے رہے۔ آخر سرجی نے کہا۔ "شروع کرو یار! جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔"

اُس نے آہستہ آہستہ کیک کھانا شروع کر دیا۔ میں نے اور ڈمکا نے بھی اُس کی تقلید کی۔

ہم لوگ کیک کھا نہیں رہے تھے بلکہ چُگ رہے تھے اور بار ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے دلوں کی جو حالت تھی، وہ بیان نہیں کی جا سکتی ـــــ کمرے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا ہلینا ایک کونے میں بیٹھی اپنے ترشے ہوئے احمریں لبوں پر تبسم بکھ باری باری ہماری جانب دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شوخی شرارت رقصاں تھی اور رخسار ایک معصوم شگفتگی سے کھلے ہوئے تھے

ہم لوگ بہت خاموشی، بہت احتیاط سے کیک کا ذرّہ کُترتے اور اُسے دیر تک منہ میں پھیرتے، جب اچھی طرح یقین ہو کہ سکہ اس نوالے میں نہیں ہے، تب اُسے نگلتے۔ اِسی گومگو کے عا میں سرجی نے ہمیں مخاطب کیا۔ "دوستو!"

میں نے اور ڈمکا نے بے اختیار اپنے ہاتھ سینوں پر رکھ ہمارا خیال تھا کہ سرجی کو سکہ مل گیا ہے۔ اُس کی آواز ہم نے بہت د سے آتی ہوئی محسوس کی۔ "دوستو! ایک ایک سگریٹ تو پی لیں۔" سـ نے کہا۔ "کیا خیال ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب کیک ختم ہی کر ڈالو۔ سگریٹ پی لیں گے۔"

اُسی لمحے ڈمکا ایک جھٹکے سے اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ "دوستو! د اُس کی آواز چھلکی پڑ رہی تھی۔ "یہ دیکھو، میں جیت گیا، میں جیت گیا" ا نے کسی مداری کی طرح اپنے منہ سے بیس کوپک کا ایک سکّہ نکال ہمارے سامنے رکھ دیا۔

سرجی نے ایک سرد آہ بھری اور شکست خوردہ انداز میں "میں تو ہمیشہ کہتا تھا کہ ڈمکا بہت خوش قسمت آدمی ہے۔"

ڈمکا نے مسکرا کر ہلینا کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کے قریب جا ایک گھٹنے کے بل بیٹھ گیا اور سر جھکا کے ادب سے کہنے لگا۔ "ہلینا قسمت نے مجھے چن لیا ہے پیاری! لاؤ اپنا ہاتھ۔"

سرجی نے کیک کی پلیٹ ایک طرف سرکا دی اور میری طر معنی خیز نگاہ سے دیکھنے لگا۔ میں اُس کی نگاہ کا مطلب سمجھ گیا۔ میں بھی اُسی انداز میں اُس کی جانب دیکھا۔ "شادی کا کیک؟ کیوں" سرجی نے کہا۔

"ہاں بالکل۔" میں ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔
"اچھا دوستو! اب رخصت، پھر ملیں گے۔"

ہماری ملاقات پورے چھ مہینے بعد ہوئی۔ ڈمکا نے خر

ذریعے ہمیں مطلع کیا تھا کہ وہ اور ہلینا ایک ہو چکے ہیں مگر شادی کی دعوت ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ یہ بات ہمارے لیے تعجب خیز نہیں تھی کہ شادی کی دعوت ابھی تک کیوں نہیں ہوئی۔ ہمیں معلوم تھا کہ دونوں میاں بیوی دعوت میں ہماری شرکت کے خواہاں ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی اُن کی زندگی کی پہلی خوشی میں شامل ہونے کے لیے تار سے انھیں اطلاع بھجوائی کہ ہم ہر حال میں اُن کی دعوت میں ضرور شریک ہوں گے۔

میں اور سرجی مئی میں ماسکو پہنچے۔ اس خوشی کے موقع پر ہم اُن سے بے تعلق کیسے رہ سکتے تھے۔ آخر یہ ہمارے عزیز ترین دوست کی شادی تھی۔

ہلینا کے گھر کا جانا پہچانا زینہ ہم نے بہت سنجیدگی اور خاموشی سے طے کیا۔ دروازے کی اوٹ سے سُریلے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ہم نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا کر اُنھیں اپنی آمد سے مطلع کیا۔ دروازہ ڈمکا نے کھولا۔ ہم نے اُس کی پیشانی چوم کے اُسے شادی کی مبارک باد دی اور نئی زندگی کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

پھر ہلینا ہمارے سامنے آئی۔ ہم نے جھک کر انکسار سے اُسے بھی مبارک باد پیش کی اور ایک خوش گوار زندگی کی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ باتیں بہت سنجیدہ ماحول میں ہو رہی تھیں۔ "اچھے دوستو! تم لوگ آج ہماری شادی کی دعوت پر آئے ہو۔ تمھاری طرف سے شادی کے تحفے کہاں ہیں؟" ہلینا نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

سرجی نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا: "تمھارا تحفہ اُدھار رہا، ہلینا! البتہ ڈمکا کے لیے تحفہ حاضر ہے۔" اُس نے اپنی جیب سے بیس کوپک کا ایک سکہ نکال کے ڈمکا کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں بھی سرجی سے بڑا تحفہ دے کے اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتا" میں نے بھی اپنی جیب سے ویسا ہی بیس کوپک کا ایک سکہ نکال کے ڈمکا کو پیش کیا۔

"یہ .... یہ سب کیا ہے؟ اِس کا مطلب کیا ہے؟" ڈمکا نے حیرانی سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا حالانکہ اُس کی آنکھوں کی گردش سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اصل بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہے۔

"تمھارا بہت بہت شکریہ دوستو" ہلینا نے کہا۔ "در اصل ڈمکا۔" وہ ڈمکا کی طرف مڑی اور پیار سے بولی: "بات یہ ہے کہ میں نے کیک میں تین سکے رکھے تھے۔"

"میں اپنے حصے کا سکہ آدھے گھنٹے تک منہ میں دبائے رہا تھا۔" سرجی نے کہا۔

"اور میں تو تھک کے اسے نگلنے والا تھا۔" میں نے بتایا۔

"اوہ دوستو!" ڈمکا شرمندہ ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات نظر آئے جنھیں الفاظ کا جامہ پہنانا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔



کم لکھنا اور خوب لکھنا اُن کا شیوہ، اُن کے مشاہدے کی قوت بے پناہ، اُن کا انداز بیان ہی کچھ اور ہے۔ اُن کی تحریریں دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں فوراً منتقل کر لی جاتی ہیں۔ دنیا کے چند ہی خوش نصیب ادیبوں کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ اُن کے موضوعات عام مگر اُن سے اُن کا برتاؤ سب سے جدا ہے۔ اُن کا نام ہے ہنری سلاسر، ہنری سلاسر

شگفتہ نثر، عبرت اثر

از راہ کرم توجہ دیجیے

٭ ش م جمیل

وہ رات کا کھانا کھا چکا تھا اس لیے اپنے کتے کے ساتھ چہل قدمی کے لیے باغ کی طرف نکل گیا۔ باغ میں پہنچ کے ٹہلتے ٹہلتے معاً اُسے احساس ہوا کہ ایک اجنبی بار بار اُس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ کسی اجنبی کا اس طرح بار بار دیکھنا بے معنی نہیں ہو سکتا۔ جلد ہی اُس کا یہ قیاس درست ثابت ہو گیا۔ کچھ دیر بعد گورڈن واپسی کے لیے پلٹا تو اجنبی تیزی سے اُس کے نزدیک آیا اور جلدی جلدی کچھ کہنے لگا۔ وہ فراٹے سے بول رہا تھا۔ گورڈن کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا: "اجنبی دوست! صبر" اُس نے ہاتھ اُٹھا کے کہا۔ "ذرا آہستہ، اس طرح تو میں آپ کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکوں گا۔"

اجنبی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے اپنے لہجے پر قابو پا کے آہستہ آہستہ کہا: "جناب! میں آپ سے کیلر کے متعلق کچھ گفت گو کرنا چاہتا ہوں۔"

اجنبی کی زبان سے کیلر کا نام سن کے گورڈن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر محسوس کی اور بہت غور سے اجنبی دیکھا۔ اجنبی درمیانی عمر اور درمیانے قد کا ایک عام سا آدمی تھا۔ وہ بہت گھ ہوا معلوم ہو رہا تھا، اُس کی آنکھیں متورم تھیں اور ہونٹ سفید تھے۔ وہ متفک نگاہ سے گورڈن کو دیکھ رہا تھا۔ گورڈن نے تھوک نگل کے کہا: "میں کیلر نا آدمی سے واقف نہیں ہوں۔"

"مسٹر گورڈن!" اجنبی نرمی سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں بیٹھ گفتگو کرنی چاہیے۔ آپ کا کتا بہت خوب صورت اور عمدہ نسل کا معلوم ہوتا۔

وہ دونوں باغ کی ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے۔ اجنبی نے اپنا تع کرایا: "میرا نام بلس ہے اور آپ کے نام سے میں واقف ہوں۔ مجھے یہ بھی ہے کہ آپ کہاں رہتے ہیں۔ آپ کی ایک بیوی ہے اور دو بچے ہیں نیز آپ کی زندگی میں کیلر کے عمل دخل سے بھی آگاہ ہوں۔" گورڈن حیرت

سے اُسے دیکھنے لگا۔ بلس کہہ رہا تھا: "میں آپ سے یہ دریافت نہیں کروں گا کہ ماوی بلیک میلر کیلر آپ کو کس بات پر بلیک میل کر رہا ہے"۔ بلس نے سگریٹ کا کش لیا: "مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ مجھے تو صرف اس سے مطلب ہے کہ کیلر کے دوسرے مظلوموں کی طرح آپ بھی میرے لیے کارآمد ثابت ہوں گے۔ اب میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ کیلر آپ سے کتنی رقم ماہانہ لیتا ہے! جہاں تک میرا سوال ہے آپ کی طرح میں بھی اُس کا ایک شکار ہوں۔ مجھ سے وہ پچاس ڈالر ماہانہ اینٹھتا ہے۔"

"میں بھی پچاس ہی ڈالر ادا کرتا ہوں"۔ گورڈن کی آواز حلق سے نکلی۔ "پہلے وہ چالیس ڈالر لیتا تھا لیکن گزشتہ مہینے سے اُس نے اس رقم میں دس ڈالر کا اضافہ کر دیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے، مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ چالیس ڈالر میں اُس کا کام نہیں چلتا۔"

"یہی بات اُس نے مجھ سے بھی کہی تھی"۔ بلس نے کہا: "اسی لیے تنگ آ کے میں نے کیلر کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔ تعاقب کر کے میں اُس کے متعلق معلومات جمع کرنا چاہتا تھا کہ میرے علاوہ کتنے بدنصیب اُس کے شکار ہیں۔ میں ڈاک خانے میں ملازم ہوں اور مجھے اپنی قلیل تنخواہ میں سے ہر مہینے پچاس ڈالر کیلر کو دینے پڑتے ہیں، مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ پہلے چالیس ڈالر ادا کر کے اتنا بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن جب سے مہنگائی بڑھی ہے..." بلس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"میں ایک سیلز مین ہوں"۔ گورڈن نے کہا: "مجھے کوئی تنخواہ نہیں ملتی۔ مال فروخت کرنے پر صرف کمیشن ملتا ہے۔ کبھی کبھی فاقوں کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔"

"اب تک تو کیلر کی ضروریات محدود ہیں لیکن کیا معلوم کب اُس پر لالچ سوار ہو جائے، وہ ریس کھیلنا شروع کر دے یا شاہ خرچ عورتوں کے چکر میں پڑ جائے پھر یہ تمام اخراجات وہ ہم ہی لوگوں سے وصول کرے گا۔ یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"آپ نے اُس کا تعاقب کیا تو کیا کیا انکشافات ہوئے؟" گورڈن نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ بیک وقت دس پندرہ آدمیوں کو بلیک میل کر رہا ہے"۔ بلس نے بتایا: "میں اُس کا تعاقب کرتا ہوا دس پندرہ مکانات پر گیا۔ ہر مکان سے اُس نے ماہانہ رقمیں وصول کیں۔ مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وہ اپنے شکاروں کے نام پتے کہیں درج نہیں کرتا بلکہ یادداشت میں محفوظ رکھتا ہے۔"

"اوہ! اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تنہا نہیں ہیں۔"

بلس نے اثبات میں سر ہلایا: "اسی نکتے کی بنیاد پر میں نے کیلر سے نجات حاصل کرنے کا ایک منصوبہ بنایا ہے اور اسی نکتے پر میرے منصوبے کی کامیابی کا انحصار ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟ کیسا منصوبہ؟"

"کیلر گندگی کا کیڑا ہے۔ اُس کا وجود انسانیت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے۔ وہ معاشرے کے لیے ایک لاعلاج ناسور ہے"۔ بلس نے نفرت سے کہا: "یہاں سوال رقم کا نہیں ہے۔ رقم تو ایک ثانوی چیز ہے، مسٹر گورڈن! ذرا یہ سوچیے کہ وہ انسانوں سے سلوک کیسا کرتا ہے۔ اُس کے ذلت آمیز سلوک کے باعث مجھے تو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔ میں خود کو ایک انتہائی حقیر اور قابلِ نفرت چیز محسوس کرنے لگا ہوں۔ کیلر نے مجھے خود میری نظر سے گرا دیا ہے"۔ بلس نے جلتی ہوئی سگریٹ زمین پر پھینک دی۔ گورڈن کا کتا جلتا ہوا ٹوٹا سونگھنے لگا۔ گورڈن نے اُسے پیچھے کھینچ کے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بلس رازداری سے کہنے لگا: "مسٹر گورڈن! ہم اپنی زمین کیلر کے شرم ناک اور تکلیف دہ وجود سے پاک کر دیں گے، یہ ہے میرا منصوبہ اور اس پر عمل کرنے کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔"

"کیا آپ اُسے قتل کرنا چاہتے ہیں؟ مسٹر بلس! شکل و صورت سے تو آپ ایک باہوش آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔ کیا آپ کو علم نہیں ہے کسی کو قتل کرنا بلیک میلنگ سے زیادہ سنگین اور گھناؤنا جرم ہے؟"

"آپ اسے قتل کیوں کہہ رہے ہیں مسٹر گورڈن! اس نیک کام کے لیے قتل کا لفظ استعمال کرنا سراسر غلط ہے۔ اسے ہم اپنی غلطی کی تلافی تو کہہ سکتے ہیں، قتل ہرگز نہیں کہہ سکتے"۔ بلس نے سمجھایا۔

"میں آپ سے متفق نہیں ہوں"۔ گورڈن نے کہا: "یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دیجیے مسٹر بلس! میں یہ فرض کر لوں گا کہ آپ نے مجھ سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ پریشان میں بھی ہوں لیکن اتنے ہول ناک اقدام کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔"

بلس نے دوسرا سگریٹ جلایا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ پُرسکون نظر آ رہا تھا: "میں اس منصوبے میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ کیلر کے تمام شکار میرے ساتھ شامل ہیں۔ میں فرداً فرداً سب سے مل چکا ہوں۔ ابتدا میں بعض حضرات نے یہی بات کہی تھی جو آپ کہہ رہے ہیں لیکن جب میں نے انھیں اپنے منصوبے کی تفصیلات بتائیں تو سب کے سب مجھ سے تعاون کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ میں اس سلسلے میں اب تک کیلر کے بارہ شکاروں سے ملاقات کر چکا ہوں۔ آپ اس فہرست کے آخری فرد ہیں۔ میرا منصوبہ نہایت آسان، جامع اور بے داغ ہے۔ اس پر عمل کرنے سے کوئی خطرہ نہیں ہے اسی لیے سب نے مجھے اپنے تعاون کا یقین دلا دیا۔ آپ بھی میرے ساتھ تعاون کیجیے اور یقین رکھیے کہ آپ کا ضمیر اس معاملے میں کبھی آپ کو ملامت نہیں کرے گا۔ ضمیر ہمیشہ بُرے کام پر ملامت کرتا ہے اور کیلر کے بوجھ سے زمین ہلکی کرنا ایک نیک کام ہے۔ نیز اس منصوبے میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم قانون کی گرفت میں نہیں آئیں گے۔ قانون نیکی اور بدی کا فرق نہیں سمجھتا،

وہ اندھا ہوتا ہے۔"

"جناب! آپ جانتے ہوں گے ہر مجرمانہ منصوبے کا مجرم یہی تصور کرتا ہے کہ وہ قانون سے بچ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی مجرم اپنے منصوبے پر عمل ہی نہ کرے۔"

"میں پھر کہتا ہوں مسٹر گورڈن! یہ کوئی مجرمانہ منصوبہ نہیں ہے۔" بلس نے کہا۔ "اور میں دعوا کرتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی شخص پکڑا نہیں جائے گا کیونکہ یہ واردات قتل کی واردات نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک حادثہ ہوگا۔ ہاں اگر اس منصوبے پر عمل کر کے کوئی شخص مصیبت میں مبتلا ہوا بھی تو وہ صرف میں ہوں گا میرے سوا کوئی قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا کیونکہ منصوبے کے مطابق میں کیلر کو اپنی گاڑی سے کچل کے ہلاک کروں گا اور یہ حادثہ اس وقت پیش آئے گا جب وہ اگلے مہینے ہم لوگوں سے رقمیں وصول کرنے کے لیے نکلے گا۔ میں نے حادثے کے وقت اور مقام کا بھی تعین کر لیا ہے۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔ "کیرول اسٹریٹ کے چوراہے پر آدھی رات سے کچھ پہلے۔ اب آپ کو احساس ہوا کہ میں آپ سب کے لیے کتنی بڑی قربانی دے رہا ہوں؟"

"شاید آپ کا خیال یہ ہے کہ پولیس والوں کی کھوپڑیوں میں بھیجا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ غلط قسم کی کتابیں پڑھنے کے عادی رہے ہیں۔ میں آپ سے کہوں گا کہ مسٹر! کسی خوش فہمی میں نہ رہیے گا۔ قتل ہمیشہ منکشف ہوتا ہے اور قاتل ہمیشہ پکڑے جاتے ہیں۔ چاہے قتل کی واردات کا نام حادثہ ہی کیوں نہ ہو۔"

"یہ ایک بالکل مختلف معاملہ ہے مسٹر گورڈن! سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" بلس نے کہا۔ "اس واردات کے کئی گواہ موجود ہوں گے۔"

"گواہ؟"

"جی ہاں اس واردات کے بہت سے گواہ موقع پر موجود ہوں گے اور ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ کم سے کم پولیس اس تعلق سے واقف نہیں ہو سکتی۔ تمام عینی گواہ حادثے کے بارے میں پولیس کو ایک ہی کہانی سنائیں گے اور سب کی گواہیوں کا خلاصہ یہ ہوگا کہ اس حادثے میں سارا قصور مرنے والے کا تھا، کار ڈرائیور کی کوئی غلطی نہیں تھی۔"

گورڈن اچانک کھڑا ہو گیا۔ "بس کیجیے جناب! میں مزید کچھ سننا نہیں چاہتا۔ میں جا رہا ہوں۔"

"سنیے تو سہی۔" بلس نے گورڈن کا ہاتھ پکڑ کے اسے دوبارہ بینچ پر بٹھا لیا۔ "پہلے میری پوری بات سن لیجیے۔ میرے گواہوں میں آپ بھی شامل ہوں گے۔ کیا آپ منصوبے کی تہہ تک نہیں پہنچے؟ اس منصوبے کی تمام تر خوب صورتی گواہوں کی تعداد اور حیثیت میں پوشیدہ ہے۔ حادثے کے تمام گواہ اس شہر کے معززین ہوں گے، قابلِ احترام شہری۔ وہ سب پولیس کو ایک ہی کہانی سنائیں گے۔ دراصل آپ کو کیلر کے شکاروں کے متعلق کچھ معلو[م] نہیں ہے۔ ان میں سے ایک کسی کالج میں پروفیسر ہے، دو ڈاکٹر ہیں۔ چار شا[دی] شدہ گھریلو خواتین ہیں، ایک شخص ایک شراب خانے میں بار ٹینڈر ہے، چ[ند] تاجر ہیں اور کچھ میری طرح مختلف دفتروں میں ملازم ہیں۔ یہ سب لوگ م[جھ سے] مکمل تعاون کرنے پر آمادہ ہیں۔"

"ایک حادثے کے اتنے بہت سے گواہ؟"

"جی نہیں، ہمیں سب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پولیس کچھ لوگوں سے سوالات کرے گی کچھ سے نہیں لیکن وہ سب حادثے کے مقام پر موجو[د] ہوں گے تاکہ ضرورت پڑنے پر گواہی دے سکیں اسی لیے تو ہمیں آپ کی بھی ضرورت ہے، اس منصوبے میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔"

"آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" گورڈن ضبط نہیں کر سکا۔ "آ[پ کا] بھی اور آپ کے ساتھیوں کا بھی۔ آپ کے احمقانہ منصوبے میں تم[ہارے ساتھ] میں ہرگز شرکت نہیں کروں گا۔ میں بھی کیلر سے نفرت کرتا ہوں لیکن [اس] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے قتل کر دوں۔"

"میں نے بتایا نا......"

"جی ہاں سن لیا۔ قتل کا طریقہ چاہے کچھ بھی ہو، اسے قتل ہی کہا جا[ئے گا۔] اس سے بہتر تو یہ ہوگا کہ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے ہم سب پولیس سے کیلر کے خلاف مدد طلب کریں۔ پولیس خود کیلر سے نمٹ [لے گی] اور ہماری جانیں چھوٹ جائیں گی۔"

"مگر اس طرح تو کیلر ہم سب کے راز فاش کر دے گا اور اخبار[وں] کے مزے آ جائیں گے۔ نہیں دوست! شکریہ۔ میرا طریقہ آپ کے طر[یقے سے] زیادہ محفوظ اور بہتر ہے۔"

"یہ محض آپ کی خوش فہمی ہے۔" گورڈن نے کہا۔ "میری [رائے ہے] اپنا ارادہ ترک کر دیجیے۔ یہ میرا پُرخلوص مشورہ ہے۔" گورڈن دوبارہ [کھڑا] ہو گیا۔ اس نے کتے کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور باغ سے باہر [جانے لگا۔]

"سنیے۔" بلس نے بینچ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "اگر ہم نے آپ کا [تعاون] قبول نہ کیا تو آپ کیا کریں گے؟" گورڈن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ [اس نے] مُڑ کے دیکھا تک نہیں۔

گورڈن کیلر کو ہر مہینے پچاس ڈالر ادا کرنے پر مجبور تھا۔ [یہ رقم اس] کی نظر میں دوسرے ضروری اخراجات کی طرح ایک ضروری مد کی [حیثیت] اختیار کر گئی تھی جیسے فلیٹ کا کرایہ، بجلی کا بل اور گیس کا بل وغیرہ۔ [اس نے] کیلر کا وجود اپنی بیوی پامیلا سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش بھی نہیں [کی تھی۔] پامیلا کو یہ علم نہیں تھا کہ ایک دُبلا پتلا پستہ قد آدمی کیلر ہر ماہ اس [کے شوہر] سے کن خدمات کا معاوضہ وصول کرتا ہے۔ پامیلا کو معاشیات سے [دلچسپی] نہیں تھی۔ اس کی دنیا ادب اور مصوری تک محدود تھی۔ وہ تصو[یریں]

کلاسوں میں جاتی تھی، کتابوں کی انجمنوں کی رکن تھی اور ایک شبینہ درس گاہ میں تاریخ کا ایک نصاب مکمل کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ روزانہ اپنے دو بچوں کو چہل قدمی کے لیے بھی لے جاتی تھی۔ گورڈن کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی اور اس کی گھریلو زندگی نہایت پُرسکون تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کیلر اس کی بیوی کو اس کی گزشتہ لغزش کی گندی کہانی سنائے اور اس کی بیوی ایک غیر لڑکی کے ساتھ اس کی شرم ناک تصویریں دیکھے۔ یہ خیال ہی اُسے دہشت زدہ کر دیتا تھا۔ وہ اپنے گھر کا سکون تہ و بالا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ کیلر کو ہر مہینے پابندی سے اس کی خاموشی کا معاوضہ ادا کر دیتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ کیلر ایک بااصول بلیک میلر ہے جب تک وہ اُسے رقم ادا کرتا رہے گا، کیلر اس کے راز کی پوری حفاظت کرے گا۔

جمعرات کی رات اس کے گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف بلس تھا۔ "ہیلو مسٹر گورڈن! آپ مجھے بھول تو نہیں گئے ؟"

"جی نہیں۔" گورڈن نے تلخی سے کہا۔ "آپ بھلا بھولنے کی چیز ہیں۔"

"کل رات آپ کو کوئی مصروفیت تو نہیں ہے ؟"

"میری مصروفیت سے آپ کو کیا دلچسپی ؟"

"ہم لوگ کل رات ساڑھے گیارہ بجے کیرول اسٹریٹ پر جمع ہو رہے ہیں۔ کیا خیال ہے، آپ آئیں گے ؟ ممکن ہے وہاں آپ کو ایک دلچسپ منظر دیکھنے کا موقع مل جائے۔"

"آپ..... آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ مرتعش آواز میں بولا۔

"میں تنہا نہیں ہوں۔ اپنے مشترک دشمن کے خلاف ہم سب متحد ہیں۔ ممکن ہے آپ کی گواہی کی ضرورت پیش نہ آئے لیکن آپ کی موجودی ہمارے تقویت کا باعث ہوگی۔"

"میں پھر کہتا ہوں میرے الفاظ لکھ لیجیے مسٹر بلس! کوئی شخص قتل کر کے ہمیشہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پکڑا جاتا ہے۔"

"اگر ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے تو کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ کم سے کم میں ہرگز آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے بخشیے۔" گورڈن نے غصّے سے ٹیلی فون بند کر دیا۔

دوسری رات کیلر کے آنے کی تاریخ تھی۔ گورڈن بہت دیر تک اس کا منتظر رہا مگر وہ نہیں آیا۔ پانچ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ کیلر مقررہ تاریخ کو رقم لینے نہیں آیا۔ گورڈن رات بھر بے چین رہا۔ صبح اُٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے اخبار پر نظر ڈالی اور آخر اندرونی صفحات میں اُسے ایک چھوٹی سی خبر نظر آگئی۔

ٹریفک کے حادثے میں ایک شخص ہلاک۔

کیلر نامی ایک ساٹھ سالہ شخص کل رات ایک کار سے کچل کے ہلاک ہو گیا۔ یہ حادثہ کیرول اسٹریٹ پر پیش آیا۔ پولیس نے کار ڈرائیور مسٹر بلس کو معمولی پوچھ کچھ کے بعد رہا کر دیا کیونکہ چار عینی گواہوں کے بیانات کے مطابق متوفّی اچانک کار کے سامنے آگیا تھا۔ کار اس وقت ایک موڑ پر گھوم رہی تھی۔

گورڈن پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور ایک انسان اتنی آسانی سے قتل کیا جا سکتا ہے۔ اُسے کیلر کی موت پر کوئی مسرت نہیں ہوئی۔ وہ اپنی جذباتی کیفیت سمجھنے سے خود قاصر تھا۔ اس نے خبر کا تراشا کاٹ کے اپنی دراز میں ڈال لیا۔ پورے سات روز تک اس نے تراشا دوبارہ نہیں دیکھا۔ اُسے وہ خبر دوبارہ پڑھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ پورے ہفتے اسی کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اُسے ایک مرتبہ بلس سے ضرور ملاقات کرنی پڑے گی ورنہ اس کی نیند ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے گی۔

اس نے ڈائرکٹری میں بلس کا فون نمبر تلاش کیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بلس پہلے تو ملاقات کرنے کے لیے رضامند معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن پھر اس نے گورڈن کے اصرار پر چند روز بعد کچھ وقت نکالنے کا وعدہ کیا اور ایک شراب خانے میں ملاقات کا دن مقرر کر لیا۔

گورڈن مقررہ روز شراب خانے پہنچ گیا۔ بلس باہر ہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ آج وہ پہلے کی نسبت کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا تھا، پُرسکون اور پُراعتماد۔ شام کے چھ بجے تھے۔ شراب خانے میں صرف گنتی کے چند گاہک موجود تھے۔ گورڈن اور بلس کاؤنٹر کے ایک کونے میں اسٹولوں پر بیٹھ گئے۔ بارٹینڈر نے ان کے سامنے بیئر کے دو گلاس رکھ دیے۔ پھر بارٹینڈر ان کے سامنے سے ہٹ گیا تو بلس نے گفتگو شروع کی۔ "آپ نے اخبارات میں وہ خبر پڑھ لی ہوگی مسٹر گورڈن ؟" گورڈن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بلس نے کہا۔ "اس خبر سے آپ کو بہت سکون محسوس ہوا ہوگا۔ کیوں ؟ اب کوئی بلیک میلر آپ کی جیب پر ڈاکا ڈالنے نہیں آئے گا۔ اب آپ محفوظ ہیں۔ یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کی تنخواہ میں پچاس ڈالر کا اضافہ ہو گیا ہے۔" بلس مسکرایا۔ "میں اس شخص کو اتنی مدّت سے رقم ادا کر رہا تھا کہ اب ایسا لگتا ہے جیسے پچاس ڈالر سڑک پر پڑے ہوئے ملے ہوں۔"

گورڈن نے خبر کے الفاظ ذہن میں دہراتے ہوئے پوچھا۔ "وہ چار گواہ ؟ کیا وہ سب ؟....."

"ہاں۔" بلس نے اس کا مطلب بھانپ کے جواب دیا۔ "میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میرا منصوبہ قطعی مکمل اور جامع ہے۔ پولیس والوں نے صرف چار گواہوں کے بیانات لیے حالانکہ وہاں دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔"

"آپ اور آپ کے ساتھی، سب آپ بہت چالاک لوگ ہیں۔"

"درست ہے۔ اتنے بہت سے گواہوں کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس منصوبے پر عمل کرنا بے حد آسان ثابت ہوگا۔"

"فرض کیجیے کہ اگر آپ کے کسی ساتھی نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تو کیا ہوگا ؟"

"ناممکن ہے۔ ہمارا کوئی ساتھی مرتے وقت تک زبان نہیں کھولے گا کیونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

"واہ، وجہ کیوں نہیں ہے۔ کسی کا ضمیر کسی وقت بھی اُسے سچ بولنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔"

"کیا کیلر کے ضمیر نے کبھی اُسے ملامت کی تھی؟"

"لیکن کیلر قاتل نہیں تھا۔"

"وہ ایک قاتل سے زیادہ بدتر مجرم تھا۔"

"شاید آپ کا خیال یہ ہو کہ اس حادثے کے جتنے زیادہ گواہ ہوں گے، آپ اتنے ہی محفوظ رہیں گے؟ لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ جتنے زیادہ لوگ اس راز میں شریک ہوں گے، راز افشا ہونے کا اتنا ہی امکان ہوگا۔"

"ہم نے اپنے ساتھیوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ آخر ہمارا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔"

"میں صرف یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے ایک انسان کو قتل کیا ہے۔ یہ واقعہ میرے لیے سوہانِ روح ہو گیا ہے۔ میں ایک ہفتے سے اچھی طرح سو نہیں سکا ہوں اور جب تک میرے ضمیر پر یہ بوجھ رہے گا، میں گہری نیند نہیں سو سکوں گا۔"

"دوست! اگر آپ کے ذہن میں کوئی غلط خیال بیٹھ گیا ہے تو..."

"خیال غلط ہو یا صحیح، یہ حقیقت ہے کہ میں پورے ہفتے اس واقعے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکا۔"

"آپ کا ذہنی توازن درست معلوم نہیں ہوتا۔" بلس نے کہا۔ "ہم نے آپ پر بہت بڑا احسان کیا ہے، ہم نے آپ کو ایک اذیت ناک مصیبت سے نکالا ہے، فکر سے بچایا ہے اور آپ کی رقم بچوائی ہے اور آپ اس احسان کا یہ بدلہ دینا چاہتے ہیں کہ ایک حقیر کیڑے کی زندگی کے عوض ہم سب کو پھانسی لگوا دیں؟"

"میں نے آپ سے کب کہا تھا کہ آپ اُسے قتل کر دیجیے۔ نہ میں نے آپ لوگوں سے کیلر کے خلاف مدد کی درخواست کی تھی۔" جذبات کی شدت سے گورڈن کی انگلیاں کانپنے لگیں۔ اُس نے بیئر کا گلاس کاؤنٹر پر رکھ دیا اور مٹھیاں مضبوطی سے بند کر لیں۔ "معاف کیجیے گا، مجھ پر آپ نے کوئی احسان نہیں کیا۔ آپ نے ایک جرم کیا ہے اور میں یہ مجرمانہ واقعہ کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"تم احمق ہو، بے وقوف ہو۔" بلس نے اداسی سے کہا اور بارٹینڈر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ "ہمارے لیے بیئر کے دو گلاس اور لاؤ۔"

بارٹینڈر اُن کے بالکل قریب آ گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ پر کہنی تک تولیا لپٹا ہوا تھا۔ اُس نے بلس کی طرف دیکھا۔ "کیا کوئی گڑبڑ ہے؟"

بلس نے تاسف سے گورڈن کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں لیکن بہت معمولی گڑبڑ ہے۔ ہم مل جل کر اسے دور کر سکتے ہیں۔"

اچانک تولیے کے نیچے سے اعشاریہ پینتالیس بور کے ریوالور کی نال نظر آئی۔ گورڈن نے چونک کر بارٹینڈر کی طرف دیکھا۔ اُس کے ذہن میں ایک بجلی کوندی۔ اُسے یاد آیا، بلس نے بتایا تھا کہ کیلر کے شکاروں میں ایک بارٹینڈر بھی شامل ہے۔ گورڈن نے فوراً ریوالور کی نال اپنے سینے میں چبھتی ہوئی محسوس کی اور دونوں ہاتھوں سے اُسے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ بلس اچھل کے اسٹول سے کود گیا۔ دوسرے ہی لمحے شراب خانہ گولی کی آواز سے گونج اُٹھا۔ گولی کی آواز اتنی بلند تھی کہ گورڈن کے آخری خیالات اُسی میں ڈوب گئے۔



پولیس افسر نے بارٹینڈر سے پوچھا۔ "یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا؟"

"ان سے پوچھیے جناب!" بارٹینڈر نے جواب دیا اور اپنے گلاس میں بیئر انڈیلی۔ "میرے اعصاب ابھی تک کشیدہ ہیں، میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ بیئر میرے اعصاب پُرسکون کر دے گی۔"

"ضرور۔ تمہارا بیان بعد میں لے لیا جائے گا۔" پولیس افسر نے ایک عینی گواہ کو دیکھا۔ "آپ کا کیا نام ہے مسٹر؟"

"والٹن! میں ٹیلی فون کمپنی میں ملازم ہوں۔"

"اور آپ کا نام خاتون؟"

"مسز چیسٹر۔ میں شادی شدہ ہوں۔ کچھ سامان خریدنے کے لیے اِس طرف آئی تھی اور یہاں بیٹھ کے سستا رہی تھی۔"

"اور میں ڈاکٹر ایڈم ہوں۔" ادھیڑ عمر کے ایک آدمی نے جواب دیا۔ "پولی کلینک میں ملازم۔"

"یہ شخص میرے بالکل قریب بیٹھا ہوا تھا۔" بلس نے فرش پر پڑی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "اِس نے اچانک اپنی جیب سے ریوالور نکالا تو میں دس فٹ اُچھل گیا۔ اِس نے میری طرف ریوالور تان کے کہا کہ چپ چاپ ساری رقم میرے حوالے کر دو۔"

بارٹینڈر نے بیئر کا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر معلوم نہیں دفعتہً کیا ہوا؟ میں نے فوراً اس کا ریوالور پکڑ لیا اور اسے چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی کوشش میں گولی چل گئی۔"

"درست ہے۔ یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا۔" والٹن نے تصدیق کی۔

"میں بھی تائید کرتا ہوں۔ میں اتفاق سے اُس وقت کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔" ڈاکٹر ایڈم نے لقمہ دیا۔ دوسرے گواہوں نے اثبات میں سر ہلائے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر پولیس بدنصیب ڈاکو کی لاش اُٹھا لے گئی اور تمام عینی گواہوں کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ علیحدہ علیحدہ راستوں سے اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ (



عطیہ نسرین

ہنری سلاسر کی زبانی

دوسری مختصر کہانی

ایک آدمی کی کہانی جسے اپنے جواز کی تلاش تھی

وہ کمپنی میں نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ اُسے تشہیر کے شعبے میں اشتہارات لکھنے کی خدمت تفویض کی گئی تھی۔ اُس کا نام کراؤن تھا۔ کراؤن کے ایک دفتری ساتھی لیوٹ کا خیال تھا کہ کراؤن اشتہار لکھنے میں بہت ماہر ہے۔ لیوٹ کراؤن کے لکھے ہوئے اشتہارات بہت پسند کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ اپنے سپروائزر کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے وقت اُس نے کراؤن کی شخصیت اور اُس کی کارکردگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ کراؤن کی بہت تعریفیں کر رہا تھا لیکن سپروائزر اُس کی تعریفوں سے متفق نہیں تھا۔ سپروائزر نے کراؤن کے کام پر تحقیر آمیز انداز میں تبصرہ کیا۔ لیوٹ کے لیے سپروائزر کا تبصرہ غیر یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ صدمے کا باعث بھی تھا کیونکہ کراؤن اُس کا دوست تھا نیز وہ اُسے دل کی گہرائی سے ایک اچھا فن کار سمجھتا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ کراؤن کے چبھتے ہوئے اشتہارات سب رنگ

اور مضامین کے متعلّق ایسی پوچ خیال آرائی بھی ہوسکتی ہے۔ اُس نے کراؤن کی حمایت کرتے ہوئے سپروائزر سے کہا "ہوسکتا ہے کہ اُس کے دو ایک اشتہار آپ کو پھسپھسے معلوم ہوئے ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اُس کے زیادہ تر اشتہار شوخ اور جان دار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ایک دو اشتہار پھسپھسے بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

سپروائزر چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر اُس نے دانت کریدتے ہوئے آگے جھک کے رازداری سے کہا "لیوٹ! کراؤن کے متعلّق تمھاری رائے خواہ کچھ بھی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمپنی اُس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پہلی تاریخ کو اُسے ملازمت سے جواب ملنے والا ہے"۔ اُس کا لہجہ مزید رازدارانہ ہوگیا "میرا نام مت لینا لیکن یہ حقیقت ہے پہلی تاریخ کو اُسے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔"

"کیا؟" لیوٹ کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس خبر سے اُسے شدید صدمہ پہنچا ہے۔ "اُسے کام کرتے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ دو ہی مہینے تو گزرے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ اُسے کتنی تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد یہ ملازمت ملی تھی۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ شاید اس سے پہلے وہ پورے ایک سال سے بے روزگار تھا۔"

"ایک سال؟" لیوٹ نے کرب سے کہا۔ "نہیں جناب! وہ پورے سترہ مہینے سے بے روزگاری کا عذاب بھگت رہا تھا۔ اُس نے مسلسل سترہ مہینے تک کسی آمدنی کے بغیر نہایت صبر سے وقت کاٹا ہے۔ ورنہ تہی دستی کے عالم میں اتنی مدت تک کون زندہ رہ سکتا ہے؟"

"خرابی کی جڑ بھی یہی بات ہے۔" سپروائزر نے کہا۔ "بیکاری کے باعث اُس کا ذہن ایک ایسی کیتلی کی طرح گندا اور زنگ آلود ہو گیا ہے جو مدت سے کوڑے میں پڑی ہوئی ہو۔" سپروائزر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی لیکن کیتلی کی تشبیہہ پر وہ خوش ضرور معلوم ہو رہا تھا۔

لیوٹ کے دل میں اُس کے اس انداز سے نفرت کا لاوا کھولنے لگا۔ اُسے اس سپروائزر کے کٹھور پن سے شدید نفرت تھی۔ سپروائزر بسا اوقات لوگوں کے متعلق انتہائی سنگ دلانہ تبصرے کرنے کا عادی تھا۔ لیوٹ نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانے کے بعد سپروائزر اور وہ کچھ دیر تک ٹہلتے رہے لیکن لیوٹ کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اُسے کراؤن کا خیال رہ رہ کے ستا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کراؤن کو اس دفعہ بے کاری کی وجہ سے نہ جانے کس قدر مصیبت جھیلنی پڑے۔

وہ دفتر واپس پہنچا تو سپروائزر کے تبصرے سے اُس کا موڈ بہت خراب تھا۔ اُس کی چال میں تھوڑی سی لنگڑاہٹ تھی۔ وہ کراؤن کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو اُس کی نگاہ کراؤن پر پڑی۔ کراؤن ٹائپ رائٹر پر جھکا ہوا کوئی اشتہار ٹائپ کر رہا تھا۔ کمرے میں ٹائپ رائٹر کی آواز گونج رہی تھی۔ لیوٹ کے قدم غیر ارادی طور پر اُس کی طرف اٹھ گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے دروازہ بند کر دیا اور بے اختیار کہا۔ "کراؤن! کیا تم ایک تلخ حقیقت برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہو؟"

کراؤن اُس کی طرف گھوم گیا۔ اُس کے ہاتھ ٹائپ کرنے کے انداز میں اُٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک جسیم آدمی تھا۔ اُس نے لیوٹ کی طرف دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر معذرت آمیز تبسّم پھیل گیا۔ وہ اپنے اس مخصوص انداز میں ہمیشہ مسکرا سکتا تھا۔ یہ بات سامنے والے کی ذہانت پہ منحصر تھی کہ وہ اُس کی مسکراہٹ کو کیا معنی پہناتا ہے۔ "کیوں نہیں لیوٹ؟"

اُس نے کہا۔ "تم نے یہ مثل تو سنی ہو گی کہ سچائی کا بول بالا۔ میں ہر تلخ اور سچّی حقیقت سُننے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔"

لیوٹ نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ وہ کراؤن کو یہ بتانے سے ہچکچا رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر بے روزگاری کی دلدل میں دھنسنے والا ہے لیکن وہ کراؤن کی استفہامی نگاہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکا۔ "حقیقت یہ ہے کراؤن . . . . ." اُس نے اٹک اٹک کے سپروائزر سے سُنی ہوئی بات دُہرا دی۔

کراؤن نے یہ خبر خاموشی سے سُنی مگر اُس کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی اور اُس کے جبڑوں پہ دو نشان ابھر آئے۔ غالباً اس طرح جبڑے بھینچ کے وہ خود کو کچھ بولنے سے بہ دقّت روک رہا تھا۔ لیوٹ دل میں رو دیا۔ اُسے افسوس ہونے لگا کہ اُس نے یہ خوف ناک خبر سُنانے سے پہلے کراؤن کا ذہن آمادہ کیوں نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ کراؤن کے دل پر کیا بیت رہی ہے اس کا ثبوت وہ آنسو تھے جو کراؤن کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

"میرا خیال ہے، مَیں نے یہ حقیقت بہت بے دردی سے تمھارے گوش گزار کر دی ہے۔" لیوٹ نے جلدی سے کہا۔ "غالباً پہلے مجھے یہ بتانا چاہیے تھا کہ آج کل حالات کیا ہیں۔ ایک روز اگر کمپنی تمھیں ملازمت سے برطرف کرتی ہے تو تمھیں گھبرانا نہیں چاہیے۔ دوسرے دن یہی کمپنی تمھیں کاغذی تولیوں کی صنعت کا نائب صدر بھی بنا سکتی ہے۔" لیوٹ نے یہ جملہ مزاحیہ انداز میں کہا تھا، اس کے باوجود اُسے احساس تھا کہ کراؤن کی تکلیف کم نہیں ہوئی ہے۔ آنسو اب اُس کے رخساروں پہ آ گئے تھے۔

"مجھے اِس خبر سے بے حد غم ہوا ہے لیوٹ۔" کراؤن نے بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اپنے غم کی انتہا بتا نہیں سکتا اور یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ میرے نزدیک اس ملازمت کی کتنی اہمیّت ہے۔"

"میں جانتا ہوں کراؤن!"

"میں ڈیڑھ سال سے زیادہ بے روزگار رہا ہوں۔ میں نے بے روزگاری میں اس شہر کے ایک ایک دروازے پر دستک دی تھی۔ میں ہر دروازے تک پنجوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا پہنچا تھا۔ اُس پیاسے کی طرح جو صحرا میں برسوں سے پیاسا بھٹک رہا ہو لیکن کسی کو مجھ پہ رحم نہیں آتا تھا، کسی کو شرم نہیں آتی تھی۔ تمھیں کیا بتاؤں میں نے لوگوں کو اپنی بے بسی کا احساس دلانے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ تم جانتے ہو کہ میرے پانچ بچّے ہیں اور ایک بیوی ہے۔ وہ بیچاری عسرت کی وجہ سے کھال اور ہڈّیوں کا ڈھانچا بن کے رہ گئی ہے۔ میرے پانچوں بچّے بھوک سے ہر وقت بلکتے رہتے ہیں۔ اُن کی حالت مُردوں

سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔"

"تم ایک اچھے لکھنے والے ہو کراؤن!" لیوٹ نے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم ایک باصلاحیت آدمی ہو، ایک مخلص آدمی ہو۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ مجھے اُمید ہے کہ تمھیں جلد ہی کوئی دوسرا کام مل جائے گا۔"

"خاک مل جائے گا۔" کراؤن غرّایا۔ "یہ دفتر نوجوانوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر کام کے لیے نئے اور پُرجوش خون سے بھرپور لوگ موجود ہیں۔ اُن میں مجھ سے زیادہ صلاحیتیں ہیں، مجھ سے زیادہ جذبہ ہے۔ میں دوسرے کاموں میں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تم جانتے ہو کہ ایک ہی کام ایسا تھا جس کے لیے اگر کمپنی چاہتی تو میرا تقرّر قائم رہ سکتا تھا۔" اُس نے پیشانی میز پہ ٹکا دی۔ "اوہ، کیا مجھے اس طرح بے وجہ نکال پھینکنا ناانصافی نہیں ہے؟" وہ خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا۔ "اب میں کس منہ سے گھر جاؤں گا اور اپنے بیوی بچّوں کو یہ جان لیوا خبر کس طرح سناؤں گا؟ اُف!" ماحول بے حد سوگوار ہو گیا۔

لیوٹ اس سوگوار ماحول سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن گناہ کے احساس نے اُسے کرسی سے چپکا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صورتِ حال اُسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اُسے کراؤن کو یہ تلخ حقیقت نہیں بتانی چاہیے تھی۔ وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا ہوا خالی خالی نگاہ سے کراؤن کی طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے تلافی کے طور پر کہا۔ "آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" اُس کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "آمدنی اور ملازمت کے بارے میں کوئی شخص حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس معاملے میں دل کے معاملات عجیب ہوتے ہیں۔"

"دل کے معاملات؟" کراؤن نے وحشت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "دل کے معاملات سے تمھاری کیا مراد ہے؟ کہیں تم میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہو؟"

"نہیں کراؤن! میں سنجیدہ ہوں اور درست کہہ رہا ہوں کاروباری لوگ ہر موقع پر خود غرض اور سنگ دل نہیں ہوتے کبھی کبھی وہ عجیب رویّوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، کمپنی کے مالکان تمھارے متعلّق اپنی رائے بدل لیں۔ بہرحال تمھیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ سنو! اِس وقت جس صورتِ حال سے تم گزر رہے ہو، اِس سے میں بھی گزر چکا ہوں۔ مجھے اِس کا بہت اچھّا تجربہ ہے۔" کراؤن پُرامیّد نظروں سے لیوٹ کی طرف متوجّہ ہو گیا۔ لیوٹ نے کہا۔ "یہ بہت زیادہ عرصے کی بات نہیں ہے۔ کیا تم نے میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر کبھی توجّہ دی ہے؟"

"تمھاری ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے میرے موجودہ مسئلے کا کیا تعلّق ہے؟"

"بہت بڑا تعلّق ہے۔" لیوٹ نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالی۔ وہ پیکٹ اُس نے کراؤن کی میز پہ رکھ دیا تھا۔ وہ بہت کم سگریٹ پیتا تھا لیکن اس وقت اُسے تمباکو کی طلب شدّت سے محسوس ہو رہی تھی۔ "یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔" اُس نے سگریٹ سلگا کے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ "اس کمپنی میں میرے شعبے کا نگراں پہلے ایک بہت سخت گیر آدمی تھا۔ وہ ہر کارکن کو کمپنی پہ ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ اُس کی دانست میں کوئی شخص اتنا کام نہیں کرتا تھا جتنی اُسے تنخواہ دی جاتی تھی۔ اُس کے سبھی ماتحتوں کا خیال تھا کہ اُس سے معاوضہ وصول کرنے کے لیے ہاتھ بڑھانا قیمہ بنانے کی مشین میں ہاتھ دینے کے برابر ہے۔ بہرحال صرف چند دنوں میں مجھے یہ احساس ہو گیا کہ میرا نگراں مجھے ملازمت سے نکالنے پر تُلا ہوا ہے۔ وہ میری چھوٹی سی چھوٹی کوتاہی کا منتظر رہتا تھا۔ پھر ایک دفعہ کرسمس سے دو ہفتے قبل معلوم ہوا کہ کرسمس کا تہوار گزرتے ہی مجھے ملازمت سے جواب مل جائے گا۔ یہ خبر میرے لیے پریشان کُن ضرور تھی مگر میں نے ہمّت نہیں ہاری اور مجھے تجربہ ہوا کہ جرأت ہر معاملے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ میں نے ابھی دل کا ذکر کیا تھا۔ پوری بات سُن لو پھر تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ دل کا ذکر کرنے سے میری کیا مراد تھی۔ کمپنی مجھے کرسمس کے بعد برطرف کرنا چاہتی تھی حالانکہ کرسمس سے پہلے ہی برطرف کر دیتی تو اُسے کون روک سکتا تھا لیکن دوسرے ملازمین پر اچھّا تاثّر قائم کرنے کے لیے ایک ناکارہ آدمی کا تہوار خراب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی مجھے چونکہ برطرفی کی اطلّاع وقت سے پہلے مل گئی تھی اس لیے میں نے چپکے چپکے کسی دوسری ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کمپنی سے نکلنے کے بعد مجھے بے کاری کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن دوست! افسوس کہ مجھے کوئی دوسرا گھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُن دنوں آج کل سے زیادہ بُرے حالات تھے۔ ملازمت ملنا قطعی محال تھا۔ ہر ادارہ اپنے ملازموں میں تخفیف کر رہا تھا کہیں بھی کسی نئے آدمی کی بھرتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چھوٹے دُکان دار حالات سے بہت خوف زدہ تھے اور معمولی معاوضوں کے ملازم بھی بھرتی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ میرے اعصاب پہ فکر مندی سوار رہنے لگی۔ ہر وقت متفکّر رہنے کی وجہ سے میرے پیٹ میں ناسور ہو گیا اور معدے میں ہر وقت تکلیف رہنے لگی۔"

"کرسمس سے دو روز پہلے کا ذکر ہے میں دفتر میں دیر تک کام کرتا رہا۔ دیر تک رُکنے اور کام کرنے کا ایک مقصد تھا۔ میں یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ کمپنی کو میرے بعد مجھ جیسا محنتی آدمی کوئی نہیں ملے گا۔ خاصی دیر بعد میں نے دفتر سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا۔ اُس وقت لفٹ کام نہیں کر رہی تھی اس لیے مجھے نائٹ کار کے ذریعے نیچے جانا تھا۔ تمھیں کمپنی کی پرانی عمارت تو یاد ہو گی جہاں کمپنی نے لفٹ بند ہونے کے بعد رات کو دیر تک کام کرنے والوں کے لیے دو نائٹ کاروں کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نائٹ کار کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اُن میں سے ایک آ گئی۔

میں نے اُس میں سوار ہو کے بٹن دبا دیا۔ نائٹ کار متحرک ہوئی، دروازے پھسل کے بند ہو گئے، کار نیچے اترنے لگی۔ میں اپنے خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ کار گزرتے وقت لفٹ والے کنویں جیسے حصّے کی اینٹیں بہت عجیب نظر آ رہی تھیں۔ میری نگاہ اُن پر جمی ہوئی تھی اور میں گہری سوچ میں گم تھا اس لیے یہ محسوس نہیں کر سکا کہ کار کی رفتار معمول سے زیادہ تیز ہے۔ مجھے بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ میرا جسم یکایک ہلکا پھلکا ہو گیا ہے اور میں کسی سہارے کے بغیر گہرائی میں اُتر رہا ہوں۔ صرف چند لمحوں میں کار زمین کی تہہ سے جا ٹکرائی اور ایک زوردار جھٹکا لگا، ساتھ ہی شدید دھماکا ہوا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ میری ہڈّیاں چٹخ گئی ہیں۔ مجھے ایسی سخت تکلیف ہو رہی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا اور میں اُن دنوں ایسے کرب کا شکار تھا کہ کوئی جسمی تکلیف برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔"

"مگر حقیقت یہ ہے کہ میں خوش قسمت تھا۔ میری صرف ایک ٹانگ ٹوٹی اور جسم کی چند ہڈّیاں اپنی جگہ سے کھسک گئیں۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے فوراً اسپتال بھیج دیا گیا۔ اسپتال کے تمام اخراجات عمارت کے مالک نے ادا کیے۔ میں زخمی پڑا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں کمپنی میری طرف سے بے پروائی نہیں برت سکتی تھی چنانچہ کمپنی نے بہت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے مجھے مسلسل پانچ مہینوں تک پوری تنخواہ دی اور رفتہ رفتہ میں بالکل صحت یاب ہو گیا۔ کمپنی کا آدمی ہر مہینے ایک مخصوص تاریخ کو اس طرح تنخواہ لے کر آجاتا تھا جیسے چراغ کا غلام ہو۔ پھر ابھی میں اسپتال ہی میں تھا کہ میری سال گرہ آگئی۔ کمپنی کے صدر کی طرف سے مجھے ایک تحفہ بھیجا گیا۔ تحفے کے ساتھ ایک پیغام بھی تھا۔ پیغام میں صدر نے لکھا تھا کہ کمپنی میں میری جدائی شدّت سے محسوس کی جا رہی ہے اس لیے میری صحت یابی اور کمپنی میں دوبارہ شمولیت سب کے لیے خوشی کا باعث ہو گی۔"

"جب میں کام پر واپس پہنچا تو میرا سخت گیر نگراں تبدیل ہو کے کسی دوسرے شعبے میں جا چکا تھا۔ میں نئے نگراں کے ساتھ اطمینان سے کام کرنے لگا۔ میری ہلکی سی لنگڑاہٹ کے باعث ہر شخص کو مجھ سے گہری ہمدردی ہو گئی تھی۔ میرا حال ایسا تھا جیسے کسی ہیرو کو کوئی کارنامہ انجام دینے کے نتیجے میں سب کی توجّہ حاصل ہو گئی ہو۔ کمپنی یہ بات قطعی بھول گئی تھی کہ مجھے ملازمت سے نکالنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ گویا وہ حادثہ میرے لیے بہت مبارک ثابت ہوا۔ اُس کی بدولت نہ صرف میری ملازمت بچ گئی بلکہ تنخواہ میں اضافہ بھی کر دیا گیا۔ میرا خیال ہے، اب تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے؟"

کراؤن اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "شکریہ۔" اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ واقعہ سنانے کے لیے تمہارا شکریہ لیکن یہ بتاؤ کہ سپروائزر نے کیا کہا تھا؟ مجھے ملازمت سے کب جواب دیا جائے گا؟"

"آئندہ ماہ کی پہلی تاریخ کو یہ صرف سپروائزر کا قیاس ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ۔۔۔۔"

"چھوڑو یہ باتیں۔" کراؤن نے کہا۔ "فی الحال مجھے یہ کام ختم کرنا چاہیے کیونکہ میں اس وقت کی تو تنخواہ وصول کروں گا۔"

"ہاں۔ تمھیں ابھی تک کوئی نوٹس نہیں دیا گیا ہے۔ جب تک نوٹس نہ ملے تم باقاعدہ ملازم ہو۔"



پیر کی صبح سپروائزر نے لیوٹ کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ لیوٹ آئس کریم کی فروخت بڑھانے کے لیے ایک کارٹون بنا رہا تھا۔ وہ سمجھ کہ شاید سپروائزر اُس کا کام دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنا کام سمیٹ کے اُس کے دفتر کی طرف بھاگا۔ کارٹون اُس نے سپروائزر کی میز پر رکھ دیا لیکن سپروائزر نے اُس پر نظر تک نہیں ڈالی اور لیوٹ سے کہا۔ "لیوٹ تم کراؤن کی بہت حمایت کرتے ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اُس کے دوست ہو؟ میرا مطلب یہ ہے کہ تم اُس کے قریبی آدمیوں میں سے ایک ہو؟"

"قریبی آدمی تو نہیں ہوں البتہ مجھے اُس سے ہمدردی ہے۔ ایک دن اُس نے مجھے اپنے گھر بھی بلایا تھا اور خاصی مدارات کی تھی۔"

"پھر تو تم اُس کی بیوی سے بھی ضرور ملے ہو گے؟ کیوں؟"

"کیا اُس کی بیوی کے متعلق کوئی خاص بات ہے؟" لیوٹ نے چونک کے کہا۔

"اوہ۔" سپروائزر نے کہا۔ "غالباً تم نے کراؤن کے حادثے کے متعلق نہیں سنا؟"

"حادثہ؟" لیوٹ اچھل پڑا۔ "کیسا حادثہ؟"

"اتوار کی سہ پہر اُسے ایک حادثہ پیش آگیا تھا۔ باغ کے کنارے ایک درخت تھا۔ اُس کی کار درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ اگرچہ پولیس کا ہے کہ کار کی رفتار پچیس میل فی گھنٹہ سے کم تھی پھر بھی حادثے کے کار کا انجن کراؤن کی گود میں آگیا تھا۔" سپروائزر نے افسوس ظاہر کر ہوئے کہا۔ "آدمی اگر زندہ ہو تو ایسے حادثات پیش آتے ہی رہتے"

"اب وہ کیسا ہے؟"

"حالانکہ اُس کی رفتار بہت کم تھی، ایسے میں حادثہ ہو جائے خطرناک نہیں ہوتا لیکن بدقسمتی سے درخت کے ساتھ تصادم کے بعد زندہ نہیں رہ سکا۔ وہ مر چکا ہے۔ کمپنی اُس کی بیوی کو کچھ رقم دینا ہے۔ میرا خیال ہے، اُسے رقم پہنچانے کے لیے تم سے زیادہ مناسب کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔"

نیا برق آیا - نیا برق لایا
نئے رنگ روپ - نئے بلبلے



نیا برق

لاجواب
ڈیٹرجنٹ
صاف
ترین
دھلائی

نئے برق کے جھلملاتے بلبلوں میں کپڑوں سے میل کچیل باہر نکالنے کی زبردست قوت موجود ہے۔
برق کی صاف وشفاف، اجلی اور چمک دار دھلائی آپ کو برق کی گرویدہ بنادے گی۔

برق کا استعمال گویا: پیسے کی بچت - وقت کی بچت



دادا سوپ فیکٹری لمیٹڈ - کراچی

DSF-1/75 Crescent

آپ بیتی، جگ بیتی، بابر زماں خاں

بابر زماں خاں گیارہ ایک چھوٹے سے زمیں دار کا ناز و نعم میں پلا ہوا لڑکا تھا۔ ایک صبح وہ چہل قدمی کرتا ہوا ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ اُن دنوں بُدھ گیا میں گوتم بدھ کی ولادت کا سالانہ جشن منایا جا رہا تھا اس لیے جب ہوڑا ایکسپریس پلیٹ فارم پر رکی تو تقریباً ہر ڈبے سے بدھ بھکشوؤں کے غول برآمد ہوئے۔ قُلی اور رضا کار طلبہ ان کی پزیرائی کے لیے لپکے لیکن بابر دُور سے تماشا دیکھتا رہا۔ وہ ایک علیحدہ سا لڑکا تھا۔ سنجیدہ، تنہائی پسند، کتابوں کا دل دادہ۔ بابر اسٹیشن کی رنگا رنگ چہل پہل کا نظارہ نہیں بلکہ مطالعہ کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے ایک بوڑھے بُدھ راہب کو دیکھا۔ راہب کے ساتھ ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکی بھی تھی۔ لڑکی اتنی خوب صورت اور ایسی بھولی گڑیا جیسی تھی کہ بابر اُس کے چہرے سے نگاہ نہ ہٹا سکا، جیسے اُس نے زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی دیکھی ہو۔ اُس لڑکی میں نہ جانے کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ بابر بے اختیار اُس کے پاس پہنچا اور سامان اُٹھانے لگا۔ بوڑھے نے اُسے بے حد دُعائیں دیں۔ بابر ایک تانگے میں انھیں بُدھ گیا تک پہنچانے گیا۔ راستے میں جب بھی اُس کی آنکھیں لڑکی کی جھلمل جھلمل شرمیلی پلکوں سے ٹکرائیں اُس کے دل میں بجلی کوند گئی۔ لڑکی کا نام کررا اور بوڑھے کا نام اُجین تھا۔ وہ دونوں تبت کے جانگ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُجین ایک شفیق اور محبت کرنے والا شخص تھا۔ اُس کے حُسنِ سلوک نے بابر کو اجنبیت محسوس نہیں ہونے دی اور جب بابر گھر لوٹا تو خلافِ معمول کتابوں میں اُس کا دل نہ لگا اور رات ہوئی تو نیند سے بھی سمجھوتا نہ ہو سکا۔ کررا کی معصوم صورت مسلسل اُس کے نہاں خانے میں متموج رہی۔ دوسرے روز وہ پھر بے قراری سے بُدھ گیا پہنچا اور تیسرے روز بھی یہی ہوا۔ بوڑھا اُجین اُس کی آمد پر خوش بھی ہوتا تھا اور شکر گزار بھی۔ اُس نے بابر کو سچے موتیوں کی ایک بیش قیمت مالا دی۔ کررا کی آنکھوں کی سفارش پر بابر کو یہ تحفہ قبول کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ بابر اور کررا ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے یہاں تک کہ بابر شہر میں ہو یا گھر میں کررا اب ہر وقت اُس کے سینے میں دھڑکتی رہتی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کاش یہ خواب حقیقت کا روپ دھار لے۔ آخر ایک رات اُس کی یہ آرزو اس طرح پوری ہوئی کہ آدھی رات کے وقت اچانک کررا اُس کے گھر پہنچ گئی۔ اُسے دیکھ کے بابر کی آنکھیں چمک اٹھیں مگر دل بُجھ گیا کیونکہ کررا بہت حواس باختہ تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے کیچڑ اور دُھول میں لت پت تھے وہ اپنے پہلو میں ایک پوٹلی سینے ہوئے تھی۔ اُس نے وحشت سے بتایا کہ بابا اُجین قتل کر دیے گئے ہیں اور وہ بڑی مشکل سے جان بچا کے یہاں تک پہنچ سکی ہے۔ بابر نے فی الفور اُسے اپنی ماں اور بہنوں کی حفاظت میں دے کے گھر کا دروازہ مضبوطی سے بند کر لیا۔ کررا کی پوٹلی میں مقتول اُجین کی قیمتی دستاویزیں محفوظ تھیں۔ وہ بابر نے اپنے والد کی تحویل میں دے دیں۔ بابر کے گھر والوں نے کررا کو چوری کے مال کی طرح چھپا کے رکھا اور مشورے کرنے لگے کہ اُسے بُدھ گیا واپس بھیج دیا جائے یا پولیس کو اطلاع دے دی جائے؟ گھر والوں کی یہ مشورت بابر کو ایک سازش محسوس ہوئی چنانچہ تیسری رات اُس نے چپکے سے اُجین کی مالا سینے میں چھپائی، کررا کو اپنی بہن فہمیدہ کے کپڑے پہنا کے برقع اُڑھایا اور اُس کا ہاتھ تھام کے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ایک کم عمر لڑکی اور ایک علم و استدلال کے لڑکے کا اس طرح گھر سے نکلنا معمولی بات نہیں تھی، پھر بھی وہ دونوں بچتے بچاتے اسٹیشن پہنچ کے ریل میں سوار ہو گئے۔ بابر کو خود معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے لیکن راستے میں ایک ہم سفر مولوی محمد شفیق نے اُس سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اُس نے کہا کہ ہم کلکتے میں اپنے ماموں کے پاس جا رہے ہیں۔ مولوی شفیق بھی کلکتے جا رہے تھے۔ کلکتے پہنچ کے انھوں نے بابر اور کررا کی کم عمری کے باعث انھیں اپنے سامنے اُن کے ماموں کے حوالے کرنا مناسب سمجھا لیکن ماموں تھے کہاں جو آتے؟ خاصے انتظار کے بعد مولوی صاحب اُن دونوں کو اپنی قیام گاہ لے گئے۔ بابر اور کررا کو سر چھپانے کی جگہ تو مل گئی تھی مگر اُن کا جھوٹ کہاں تک نبھتا؟ لہٰذا جلد ہی ایک روز مولوی صاحب کی غیر حاضری میں بابر اور کررا وہاں سے فرار ہو کے ایک ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔ کررا بابر کی موجودگی کے باوجود نہایت سہمی ہوئی رہتی تھی کیوں کہ جانگ قبیلے کے جاسوس اُس کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔

کررا جانگ قبیلے کے آں جہانی سردار کی اکلوتی بیٹی اور اُس کے منصب کی حقیقی وارث تھی لیکن رواج کی رُو سے یہ منصب اُسے اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ شادی نہ کر لے چنانچہ اُس کا چچا قبیلے کا سردار بن بیٹھا

اُمنگوں کی

حوصلوں کی آنسوؤں کی

اور

آہوں کی ایک داستان

ایک آدمی کی عبرتناک سرگزشت

تھا اور کورا کو ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ گویا کورا کی زندگی سخت خطرے میں تھی اسی لیے اُس کا اتالیق اُجین موقع پا کے اُسے تبت سے نکال لایا تھا۔ بابر نے کورا کو مکمل تحفظ کی اُمید دلائی اور ہر طرح اُس کی دل دہی کرتا رہا۔ ہوٹل میں ایک مرد کریم گل اور ایک عورت نسترن بھی مقیم تھے۔ کریم گل نسترن کو اپنی بچی بتاتا تھا۔ ان دونوں نے بابر اور کورا کے ساتھ نہایت شفقت اور اپنائیت کا برتاؤ کرنا شروع کر دیا اور ایک روز اصرار کر کے انھیں سینما لے گئے۔ سینما میں کریم گل اور نسترن کا ایک شناسا جوڑا مل گیا۔ اُس جوڑے نے نسترن سے کورا کے متعلق اشارۃً کچھ ایسی باتیں کیں کہ بابر کھٹک گیا۔ لہٰذا ہوٹل واپس پہنچتے ہی اُس نے کوچ کا ارادہ کر لیا۔ اس طرح ایک بار پھر وہ دونوں فٹ پاتھ پر آ گئے۔ اب کہاں جاتے؟ ایک ہی جگہ تھی۔ وہ ناچار دوبارہ مولوی صاحب کی پناہ میں پہنچ گئے۔ مولوی صاحب نے سیر چشمی سے انھیں پھر اپنی چھت دے دی اور ایک شام انھیں دریا کی سیر کرانے لے گئے۔ وہاں بدقسمتی سے اُن پر اچانک دو غنڈوں نے حملہ کر دیا۔ بابر کورا کی حفاظت کے لیے ایک چاقو چھپائے رکھتا تھا۔ اس غیر متوقع اُفتاد پر اُسے اپنا چاقو نکالنا پڑا اور غنڈوں کے خون سے رنگنا پڑا۔ غنڈے وہیں ڈھیر ہو گئے اور مولوی صاحب کورا کا ہاتھ تھام کے بھاگنے کا موقع مل گیا مگر بابر دھنستا تین کانسٹیبلوں میں پھنس گیا۔ اسی وقت دُور سے اُسے کورا کی چیخ سنائی دی۔ اُس نے وحشت میں ایک کانسٹیبل کے بھی چاقو گھونپ دیا۔ باقی دو کانسٹیبلوں نے پھرتی سے اُسے بے بس کر دیا اور وہ دیکھتے دیکھتے تین انسانوں کے قاتل کی حیثیت سے حوالات پہنچا دیا گیا۔ یہاں اُس نے اپنا نام طیب خاں ظاہر کیا اور پولیس افسروں نے سوالات کیے تو انھیں گول مول جواب دیے۔ پھر جلد ہی اُس پر باقاعدہ مقدمہ چلا کے اُسے سات سال کی طویل مدت کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل پہنچ کے اُسے اپنا گھر بہت یاد آیا اور یہ سوچ کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی کہ کورا اور مولوی صاحب نہ جانے کہاں بھٹک رہے ہوں گے؟ جیل کی نامانوس فضا میں بابر گھٹ کے رہ جاتا اگر بجل نامی ایک شخص نے اس کی معصومیت اور ناتجربہ کاری سے متاثر ہو کے اُسے خود سے قریب کر لیا اور لاڈلے کے خطاب سے نوازا۔ بجل کلکتے میں ایک بہت بڑے اڈّے کا سرغنہ تھا اس لیے قیدی اور پولیس والے اُسے اُستاد کہتے تھے۔ اُس کی قربت نے بابر کو بھی جیل میں یہاں تک ممتاز کر دیا کہ جب بجل اپنی سزا کاٹ کے چلا گیا تب بھی قیدی اور پولیس والے بابر سے عزت اور اپنائیت کا سلوک کرتے رہے۔ بابر نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے ایک طرف جہاں دیدہ قیدیوں سے اُن کے تمام حربے اور داؤ پیچ سیکھے دوسری طرف جیل ہی سے امتحانات دیتے ہوئے ایم اے کر لیا۔ انھی ہنگاموں میں آخر بابر کی سزا کے دن پورے ہو گئے اور اُسے اُس کی مالا واپس کر کے جیل کی سات سالہ رفیق دیواروں سے باہر دھکیل دیا گیا۔

بابر لب کلکتے میں بے گھر نہیں تھا۔ بجل کے اڈّے میں اُس کے لیے بہت گنجائش تھی مگر وہ وہاں نہیں گیا بلکہ ہر مزدیں مولوی صاحب کو اور ہر لڑکی میں کورا کو تلاش کرتا ہوا بڑی اُمید سے مولوی صاحب کے مسکن پہنچا مگر وہاں پہنچ کے اُس کے دل کو سخت دھچکا لگا۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کوئی سات آٹھ برس ہوئے اچانک کہیں چلے گئے اور نہ معلوم کیا حالات تھے کہ جاتے وقت انھیں اپنا سامان تک لینے کی مہلت نہیں ملی۔ بابر کے سینے میں کرچیاں چبھنے لگیں۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ مولوی صاحب اور کورا کو تلاش کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ اُس نے اُن کی تلاش میں مراد آباد اور حیدر آباد کے علاوہ ہندوستان کے متعدد شہروں کی خاک چھان ڈالی مگر آدمیوں کے گنجان جنگلوں میں اُسے اپنے پھول کہیں نظر نہیں آتے۔ وہ آبلہ پائی کے باوجود چلتا رہا، بھٹکتا رہا اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بار پھر اپنے وطن گیا پہنچ گیا۔ وہاں اس روح فرسا خبر نے اُس کا خیر مقدم کیا کہ اُس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے اور اُس کے باپ گھر بیچ کے متعلقین سمیت کسی نامعلوم جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ بابر دل شکستہ ہو کے برمو گیا پہنچا۔ یہاں اُس نے اُجین کی مالا دانستہ نمایاں رکھی۔ جلد ہی اُس کی توقع کے مطابق ایک بدھ بھکشو چھرلے کے اُس کے سر پر سوار ہو گیا۔ وہ اُتا بابے سے کورا کا سراغ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بابر کو سخت مایوسی ہوئی۔ بھکشو سے اُسے معلوم ہوا کہ اُجین کورا کے علاوہ جانگ قبیلے کے کچھ متبرک کاغذات بھی وہاں سے نکال لایا تھا اور کاغذات کی غیر موجودگی کے باعث قبیلہ نحوستوں کا شکار ہو گیا ہے۔ بابر کو یاد آیا کہ بھکشو جن کاغذات کا ذکر کر رہا ہے، وہ اُس کے والد کی تحویل میں ہیں لیکن اُس نے اِس سلسلے میں



صاف لاعلمی ظاہر کر دی۔ بھکشو نے مایوس ہو کر مالا پر ہاتھ ڈال دیا۔ اُس کا یہ اقدام بابر سے برداشت نہیں ہوا اور وہ اچانک سات برس کا سزا یافتہ ظہیر خاں بن گیا۔ اُس نے بھکشو کا جمرا چھین کے اُسی کی مالا میں اُتارا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ پولیس کے خوف سے اُسے انجن کے ملتی ہوئی ریل میں لٹکنا پڑا۔ اس طرح وہ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں پہنچ گیا۔ وہ ڈبا خالبا اُسی کا منتظر تھا۔ اُس میں ایک ادھیڑ عورت اور ایک نوجوان لڑکی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ عورت پر نظر پڑتے ہی بابر کی مٹھیاں بھینچ گئیں کیونکہ وہ کریم گل کی بہن نسترن تھی۔ ممکن تھا کہ بابر اپنی مٹھیاں کھول کے انھیں نسترن کی گردن کے لیے پھندا بنا دیتا مگر اُس کے ساتھ والی لڑکی کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کے بابر کو کورا یاد آ گئی اس لیے اُسے نسترن کی طرف مزاحمت کا ہاتھ بڑھانا پڑا۔ نسترن اُسے قطعی نہیں پہچانی تھی۔ بابر نے اطمینان کی سانس لے کے اُسے اپنا نام فقیرا بتایا اور چند تیر بہدف جملے استعمال کر کے اُس کی ہمدردی حاصل کر لی۔ نسترن اُسے ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے اپنے ساتھ کلکتے لے گئی۔ بابر اُس کے ہاں ملازمت کرنے لگا مگر اپنے فرض سے غافل نہیں ہوا اور نسترن کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی سے بتدریج قریب ہوتا رہا۔ لڑکی کا نام زریں تھا۔ وہ فیض آباد کے ایک متمول خاندان کی یتیم اور مظلوم لڑکی تھی۔ اُس کی جائداد پر اُس کے خالو نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ وہاں مطمئن نہیں تھی اس لیے نسترن اُسے سبز باغ دکھا کے اپنے ساتھ لے آنے میں کامیاب ہو گئی اور یہاں لا کے اُسے فروخت کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ گھر میں مختلف گاہکوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ایک روز چاند میاں نامی ایک شخص وہاں پہنچا۔ اُسے دیکھ کے بابر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے سینما میں نسترن سے کورا کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اُس نے زریں کی بولی لگائی اور قیمت دے کے مال لے جانے کے لیے رات کا وقت مقرر کر کے چلا گیا مگر اُس سے پہلے کہ وہ دوبارہ آتا بابر نے نہایت ہوشیاری سے نسترن کو تنہائی میں بے قابو کر کے اُس سے چاند میاں کا پتہ اگلوایا اور اُسے کرسی کے ساتھ جکڑ کے اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا پھر زریں کو لے کے کھلی فضا میں آ گیا۔ پورے کلکتے میں تجمل کے اڈے کے سوا کوئی جگہ نہیں تھی جہاں بابر زریں کو پناہ دلوا تا لہٰذا اُسے خاصی جھجک کے باوجود وہیں جانا پڑا۔ تجمل اُسے دیکھ کے آب دیدہ ہو گیا۔ اُس نے اپنے لاڈلے کو کلیجے میں جگہ دی اور زریں کو بہت عزت سے اپنی چہار دیواری میں سمیٹ لیا۔ بابر کے پہنچنے پر وہاں جشن منعقد ہوا۔ میلا لگا مگر بابر کا دل نہ لگا۔ وہ دوسرے ہی روز کسی سے کچھ کہے بغیر چاند میاں کے سر پر جا پہنچا کیونکہ اُسی سے کورا کا اتا پتہ ملنے کی کچھ اُمید تھی۔ چاند میاں کو بابر کے گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں نے لمحوں میں بے حال کر دیا۔ اُس نے گڑگڑاتے ہوئے ایک شخص مینی کا نام بتایا اور کہا کہ جن لوگوں نے کورا، بابر اور مولوی شفیق پر دریا کے کنارے حملہ کیا تھا، ممکن ہے اُن کے متعلق مینی کچھ بتا سکے۔ بابر نے چاند میاں کی گدی پکڑ کے اُسے اُسی وقت مینی کے پاس چلنے کا حکم دیا۔ چاند میاں اُسے مینی کے پاس لے جانے کے بہانے شہر کے ایک بہت بڑے بدمعاش مومجدار کے اڈے پر لے گیا۔ بابر کو جب یہ اندازہ ہوا کہ اُسے دھوکے سے لایا گیا ہے تو اُس نے مشتعل ہو کے وہیں چاند میاں کی انتڑیاں باہر نکال دیں۔ مومجدار نے غضب ناک ہو کے اُس پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ وہ جثے اور قوت میں بابر سے بڑا تھا لیکن اُس کے پاس کورا کی یاد نہیں تھی۔ بابر جیسا جذبہ نہیں تھا اس لیے اُسے بھی بابر کے ہاتھوں ذلت کی موت سے دوچار ہونا پڑا اگرچہ یہ دو قتل بھی رائگاں گئے۔ کورا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر بابر نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے زریں کو اُس کے گھر پہنچا دے پھر نئے سرے سے کورا کی تلاش کا آغاز کرے۔ زریں اب اُس کے سامنے شرمانے لگی تھی۔ بابر نے بڑی مشکلوں سے اُسے فیض آباد جانے پر رضامند کیا۔ تجمل نے زریں کو بابر کے علاوہ اپنے تین خاص آدمیوں کے ساتھ ایک بیٹی کی طرح رخصت کیا۔ یہ قافلہ لکھنؤ ہوتا ہوا فیض آباد پہنچا تو وہاں کے اُستاد جامو نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے آزمودہ کار ساتھیوں نیز ایک وکیل کی مدد سے زریں کی آبائی حویلی چند گھنٹوں کے اندر اندر اُس کے غاصب خالو سے خالی کرا لی۔ اس خوشی میں جامو اور اُس کے ساتھیوں کے اصرار پر بابر کو بازارِ حسن کی سیر کرنی پڑی۔ وہ لوگ اُسے ایک نائکہ چمپا بائی کے بالا خانے لے گئے۔ وہاں بازار کی سب سے اچھی مطربہ نیلم جان اپنی آواز کا جادو جگاتی تھی۔ بابر نے نیلم جان کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دوسری طرف نیلم جان کی نظر بابر پر پڑی تو وہ بے قرار ہو کے اُٹھی اور دیکھتے دیکھتے اُس نے کھڑکی سے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ بابر دیوانہ وار نیچے اُترا۔ چند لمحوں بعد سڑک پر اُس کی بہن فہمیدہ نے اُس کی آغوش میں آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ ہجوم کے ریلے اور پولیس کی لاٹھیوں نے بابر کو بے ہوش کر دیا پھر جب اُسے ہوش آیا تو وہ زریں کی حویلی میں تھا اور فہمیدہ کی میت تدفین کے لیے تیار تھی۔ فہمیدہ کو تو مٹی نے پناہ دے دی لیکن بابر اپنا کالا منہ کہاں چھپاتا؟ وہ تنفی تنفی پکارتا ہوا دیواروں سے ٹکریں مارنے لگا۔ بابر کی یہ حالت دیکھ کے تجمل کو تار دیا گیا۔ وہ فوراً کلکتے سے فیض آباد پہنچا۔ اُس نے بابر کو حوصلہ دلا کے اُسے پھر بیدار و باہوش کر دیا۔ ہوش میں آ کے بابر کو معلوم ہوا کہ چمپا بائی موقع ہی پر فرار ہو گئی تھی اور اُسے ڈھونڈنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ فیض آباد کا ایک رئیس نواب سراج علی شاید چمپا کا پتہ بتا سکے کیونکہ اُس کے چمپا سے روابط تھے اور وہ نیلم جان میں بے پناہ دلچسپی لیتا تھا۔ بابر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ اُدھر زریں اپنی حویلی اور اپنی حویلی میں بابر کو دیکھ کے پھولے نہیں سماتی تھی اور ہر طرح اُس کی دل جوئی میں لگی رہتی تھی یہاں تک کہ ایک روز اُس نے اپنی تمام جائداد بابر کے نام کر دی لیکن اُس کا یہ غیر معمولی ایثار بھی بابر کے پیروں میں زنجیر نہ ڈال سکا۔ ایک رات بابر، تجمل، زریں اور جامو لوسب کچھ چھوڑ چھاڑ کے وہاں سے نکلا اور نواب سراج علی کے پاس پہنچ گیا۔ بابر اُس پر رحم کرنے نہیں آیا تھا لیکن اُس کی مخلصانہ اور پُرسوز باتوں سے اُسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ نیلم جان میں ایک شریف آدمی کی طرح دلچسپی لیتا تھا اور اپنے گھر میں اُسے اُس کے شایانِ شان رتبہ دینا چاہتا تھا پھر بھی وہ بابر کو فہمیدہ کے متعلق کچھ اور نہیں بتا سکا۔ ہاں چمپا کے بارے میں اُس نے اتنا بتایا کہ اُس کی ایک بہن موتیا بائی آگرے میں رہتی ہے۔ بابر آندھی اور طوفان کی طرح سفر کرتا ہوا آگرے کی چھم چھم گلی پہنچا۔ موتیا بائی کے بالا خانے میں اُسے چمپا نظر آ گئی۔ چمپا سے فہمیدہ کا پتہ حاصل کر کے وہ اپنے بچھڑے ہوئے خاندان اور اُجڑے ہوئے گھر کا پتہ چلا سکتا تھا۔ اُس کی تیز دھار آنکھیں چمپا بائی کے چہرے میں گڑ گئیں۔ چمپا گھبرا کے دوسرے کمرے میں رینگ گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی بابر بھی وہیں پہنچ گیا۔ چمپا سہم کے ایک کونے میں دبک گئی اور اُس کی بہن موتیا دو مسٹنڈوں کو لے کے وہاں آ دھمکی۔ بابر صرف بابر نہیں، ظہیر خاں بھی تھا اس لیے اُن مسٹنڈوں کو بے سدھ کر کے چمپا کو ساتھ لے جانے کے لیے اُسے اپنا فن بہت زیادہ استعمال نہیں کرنا پڑا۔ چمپا کے بیان کے مطابق اُس نے فہمیدہ کو پانچ ہزار روپے کے عوض میسور میں خریدا تھا لیکن بابر جب اُسے لے کے اسٹیشن پہنچا تو اُس نے لرزیدہ آواز میں بمبئی کے ٹکٹ لینے کی درخواست کی۔ بابر نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے۔ ڈبے میں اُن کے علاوہ صرف ایک مدراسی مسافر اور تھا۔ اُس کا نام راج کرشنا تھا اور وہ مدراس کا ایک بڑا پولیس افسر تھا۔ راستے میں راج کرشنا نے بابر کو کریدنا چاہا مگر بابر نے بہت خوب صورتی سے اُسے ٹال دیا۔ سفر جاری رہا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھیری پھر چھو ٹنے ہی والی تھی کہ ایک مسافر بھاگتا ہوا ڈبے میں آ گیا۔ پھر بمبئی آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا کہ نو وارد مسافر نے بابر اور چمپا کو غافل سمجھ کے راج کرشنا پر تمنچہ تان لیا اور اُسے دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ راج کرشنا کا فیصلہ لمحوں ہی میں ہو جاتا لیکن بابر نے نہایت ڈرامائی انداز میں اچانک نو وارد سے تمنچہ چھین کے اُسے بمبئی تک کے لیے بے ہوش کر دیا اور راج کرشنا کی جان بچا لی۔ راج کرشنا نے اُس کے ہاتھ چوم لیے اور بتایا کہ وہ ایک خطرناک گروہ کی بیخ کنی کے لیے بمبئی جا رہا ہے۔ یہ شخص اُسی گروہ کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بمبئی پہنچ کے اُس نے بابر اور چمپا کو قیام گاہ اور سواری کی پیش کش کی لیکن بابر نے معذرت کر لی اور چمپا کے ساتھ دادر کے ایک ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔ یہاں اُسے چمپا کی نشان دہی پر اُن غنڈوں کو تلاش کرنا تھا جنھوں نے فہمیدہ کو اغوا کیا تھا۔ بابر نے چمپا کے ساتھ جگہ جگہ ٹکریں ماریں مگر وہ لوگ آزاد نہیں تھے۔ آخر بابر کرلا میں پہنچ کے اپنے والد کا پتہ حاصل کرنا پڑا مگر جب وہ اُس پتے پر پہنچا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ ایک بزرگ مولوی اکرم سے اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے باپ مدت ہوئی خاموشی کے ساتھ کہیں اور منتقل ہو گئے۔ مولوی اکرم نے بابر کو بتایا کہ اُس کے والد ہر وقت چند کاغذات سامنے دھرے بیٹھے رہتے تھے اور اُن کی مدد سے کوئی خزانہ حاصل کر لینے کے جنون میں مبتلا تھے۔ بابر سمجھ گیا کہ یہ وہی کاغذات ہوں گے جو کورا نے انھیں دیے تھے۔ یہاں سے بھی مایوسی ہوئی تو بابر اندر سے ٹوٹ گیا اور باہر بکھر گیا۔ اُس نے چمپا کو زبردستی آگرے روانہ کیا اور عجیب ہیئت کذائی سے بمبئی کی سڑکوں کا بوجھ بن گیا۔ اسی عالم میں ایک روز وہ جوہو کے ساحل پر پڑا تھا کہ کسی نے پکار کے اُسے چونکایا۔ وہ راج کرشنا تھا۔ بابر نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

راج کرشنا نے اپنی حیثیت اور بابر کی ہیئت کا خیال نہیں کیا۔ اُس نے اپنے ہمراہیوں کے سامنے اُسے ایک چھوٹے بھائی کی طرح سینے سے لگایا اور بابر کی شدید بیزاری اور بے اعتنائی کے باوجود اصرار سے اُسے اپنے گھر لے گیا اور اُس کی مدارات کرنے لگا۔ اُس نے چمپا کے متعلق پوچھا تو بابر نے بے رخی سے یہ کہہ کے بات ختم کر دی کہ وہ اپنے گھر چلی گئی۔ راج کرشنا پولیس کا اعلا افسر تھا۔ اُس نے پیش کش کی کہ بابر کو جس شخص کی تلاش تھی وہ اُس کے لیے شہر بھر میں جال پھیلا سکتا ہے مگر بابر نے انکار کر دیا۔ راج کرشنا سمجھ گیا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ وہ ایک بالغ نظر آدمی تھا اس لیے اُس نے زیادہ کرید بھی نہیں کی۔ بابر واپس جانے کے لیے مصر تھا لیکن راج کرشنا نے خوش دلی سے کہا کہ اب تم گرفتار کر لیے گئے ہو اور اب مفر کی کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ تم میرے محسن ہو کیونکہ تم نے ایک بوڑھی ماں کے بیٹے کو دوسری زندگی دی ہے۔ بابر کے لیے کوئی راہِ فرار نہ رہی۔ راج کرشنا نے اپنے حلقے میں اُس کا تعارف ایک مرحوم دوست کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے کرایا۔ اُس نے بابر کا حلیہ بدلنے اور اُس کی دل دہی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر بابر کو سوئیاں سی چبھتی رہیں۔ اُس نے بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن تجمل اور زریں کی شاکی اور حسرت زدہ صورتیں اُس کی نگاہ میں گھوم گئیں اور پھر وہ اس شرمندگی سے بھی خوف زدہ تھا کہ اگر راج کرشنا نے اُسے دوبارہ ڈھونڈ نکالا تو کیا ہو گا۔ راج کرشنا کی ماں مدراس میں تھی۔ وہ اپنے کشادہ بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ ایک شام وہ بابر کی دل جوئی کے لیے اُسے بمبئی کے ایک عالی شان ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں اُس نے بابر کی ملاقات شہر کے ایک بڑے اور مشہور تاجر رستم جی، اُس کی بیوی اور بیٹی نورین سے کرائی۔ نورین ایک شوخ اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ اُس نے بابر کے بہکے بہکے اُکھڑے اُکھڑے انداز میں دلچسپی لی اور راج کرشنا سے اصرار کیا کہ انھیں ہمارے گھر لائیے گا۔ اس دل کش ماحول میں بھی بابر کی بے قراری کم نہ ہوئی۔ وہ بنگلے لوٹ آئے۔ راج کرشنا دفتر چلا جاتا تو بابر گھبرا کے گھر سے نکل کھڑا ہوتا اور بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہتا۔ راج کرشنا اُن دنوں بہت پریشان تھا۔ اُس کی پریشانی کی وجہ بابر نے پولیس افسروں کی سرگوشیوں اور راج کرشنا کے پاس آنے والے ٹیلیفونوں سے اخذ کی۔ راج کرشنا ایک سنگین صورتِ حال سے دوچار تھا۔ اُسے قتل کی دھمکیاں دی جاتی تھیں چنانچہ بابر ایک روز گھومتا ہوا شہر کے ایک گنجان علاقے میں پہنچ گیا۔ وہاں چائے کے ایک اسٹال پر اُس نے چند شہدوں کو اپنی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتے پا کر سایا اور اُن سے بھڑ گیا۔ ماسٹرتا نامی ایک بدمعاش اور اُس کے ساتھی نے اُس سے مقابلے کی غلطی کی۔ نتیجتہً انھیں جلد ہی پٹ پٹا کے علاقے کے اُستاد مستانہ کے پاس بھاگنا پڑا۔ بابر وہاں سے ہلا نہیں۔ کچھ دیر بعد اُستاد مستانہ سات آٹھ آدمیوں کا گروہ لے کے بابر کے سر پر پہنچ گیا۔ بابر پہلے ہی تیار تھا۔ مستانہ نے اپنے ایک چیلے کو اشارہ کیا۔ وہ بابر پر کسی درندے کی طرح جھپٹ پڑا۔ بابر نے ڈرامائی انداز میں اُس کا بھی وہی حشر کیا جو پہلے والوں کا کر چکا تھا۔ مستانہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے بابر کو گلے لگایا اور اپنے اڈے لے گیا۔ یہ اڈا تجمل کے اڈے سے مختلف تھا اور صحیح معنوں میں بدمعاشوں کا اڈا تھا۔ یہاں جرائم، منشیات اور آوارہ عورتوں کی گرم بازاری تھی۔ بابر نے کچھ سوچ کے مستانہ کا اعتماد حاصل کیا اور اُنھی کے رنگ میں رنگ گیا۔ وہ دو ہفتے تک باریک بینی سے اُن کی مجرمانہ سرگرمیوں اور دُکھتی رگوں کا جائزہ لیتے رہنے

مستانہ کا اعتبار حاصل کرتا رہا۔ آخر ایک رات مستانہ نے اُسے دوسرے آدمیوں کے ساتھ ایک لڑکی کے اغوا پر مامور کیا۔ بابر کے تصور میں فہمیدہ، کورا اور زریں اُبھر آئیں لیکن اُس نے مصلحتاً اس مہم میں حصہ لیا۔ لڑکی ایک بوری کی طرح آسانی کے ساتھ اپنے گھر سے مستانہ کے اڈّے منتقل کرلی گئی۔ وہاں جشن برپا ہوگیا۔ یہاں تک کہ مرد اور عورتیں سب بہت جلد نشے میں نڈھال ہوکے گر پڑے۔ بابر نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور چوکیدار کو اپنی ایک مجرّب ضرب سے بے ہوش کرکے اڈّے سے فرار ہوگیا اور سیدھا راج کرشنا کے بنگلے پہنچ گیا۔ راج کرشنا نے اُس کی نشان دہی پر مستانہ کے اڈّے پہ چھاپا پڑوادیا۔ وہ لوگ اپنے صحیح مقام پہ پہنچا دیے گئے۔ سب سے پہلے بابر نے لڑکی کو عزت اور احتیاط سے اُس کے گھر پہنچا دیا۔ بمبئی میں ایک کہرام مچ گیا۔ مستانہ کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس کے ذیل میں شہر کی بڑی بڑی ہستیاں حوالات کی نذر ہوگئیں اور کئی عمارتیں سیل کردی گئیں۔ اخبارات راج کرشنا کے کارنامے سے بھرے پڑے تھے۔ راج کرشنا حیران تھا کہ بابر مستانہ جیسے بدمعاش کے اڈّے میں کس طرح داخل ہوا اور اُس نے اتنی جلد مستانہ کا اعتماد کیسے حاصل کرلیا مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ بابر کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ پھر وہ ایک شام بابر کو ایک پرائیویٹ کلب میں لے گیا۔ وہاں لوزین بھی اُسے نظر آئی، پہلے سے زیادہ شوخ اور شریر لوزین، وہ بابر کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ شہر بھر میں راج کرشنا کی دھوم مچی ہوئی تھی اس لیے کلب کے ارکان نے وہ رات 'راج کرشنا کی رات' کے طور پر منائی۔ راج کرشنا کو تقریر بھی کرنی پڑی۔ اُس نے کہا کہ اس اعزاز کا اصل مستحق ظہیر خاں ہے۔ اس طرح بابر کو بھی سب کے سامنے تماشا بننا پڑا۔ اس ہنگامے کے بعد جب وہ واپس ہو رہے تھے تو بابر ایک جگہ ٹھٹک کے رک گیا۔ مسز روپ پٹیل نامی ایک عورت کے گلے میں اُس نے وہ ہار دیکھ لیا تھا جسے اُس کی یادداشت کبھی محو نہیں کرسکتی تھی۔ اُس ہار کا ہیرا وہی تھا جو کورا کی پوٹلی میں آیا تھا اور جسے بابر کے والد نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ بابر کے کہنے پر راج کرشنا نے مسز پٹیل سے ہار کے بارے میں استفسار کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ہار اُس کے آں جہانی شوہر نے نانا بھائی جوہری سے خریدا تھا اور نانا بھائی کو ایک ضرورت مند نے فروخت کیا تھا۔ بابر کا حال بُرا تھا۔ اِسی بُرے حال میں جب وہ گھر پہنچا تو ڈرائنگ روم میں ایک اور تازیانہ موجود تھا۔ وہاں چمپا بائی بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

مگر وہاں سفید ساڑھی میں ملبوس چمپا بائی ہی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کا بھی وہی حال ہوا، جو میرا تھا۔ وہ بوکھلا کے اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اُس نے میری طرف بڑھنا چاہا۔ میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا اور راج کرشنا کی اوٹ میں ہو کر پھرتی سے چاقو جیب سے نکال لیا لیکن مجھے پھل کا دکھانے کی مہلت نہیں ملی۔ چمپا جلد ہی سنبھل گئی، اُس نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں راج کرشنا کو سلام کیا: "آپ کب آئیں؟" راج کرشنا نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد پُرتپاک لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"مجھے آئے ہوئے دیر ہوگئی۔" چمپا نے خفت سے جواب دیا۔

"بیٹھیے، بیٹھیے اور تو سب خیریت ہے؟"

"جی ہاں" اُس نے نظریں جھکا کے کہا: "میں دوبارہ بمبئی آئی ہوں، آپ سے آنے کا وعدہ کیا تھا، سوچا آج اُسے نبھا دوں۔"

"بہت اچھا کیا!" وہ بولا: "مگر آپ ٹھیری کہاں ہیں؟"

"ایک ہوٹل میں!" اُس نے مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل میں کیوں؟" راج کرشنا تند لہجے میں بولا: "یہ گھر خالی پڑا ہے، آپ سیدھی اِدھر آجاتیں، ظہیر بھی میرے ساتھ ہی ہے، کیوں ظہیر؟"

"جی، جی ہاں" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"بس" وہ جھینپ کے بولی: "ناحق آپ کو زحمت ہوتی، آپ مل گئے اور دو باتیں رواداری کی کرلیں، یہی بہت ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ظہیر بھی یہیں ہوں گے۔"

"تو پھر کیا آپ نہیں آتیں؟" راج کرشنا نے مسکرا کے پوچھا۔

"تو۔ تو میں شاید اور پہلے آجاتی۔"

راج کرشنا ہنسنے لگا: "آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔" وہ تردّد سے بولا: "ہم لوگ تو کلب میں کھا کے آئے ہیں۔" اُس نے بھکو کو آواز دی۔

"نہیں، نہیں، اس تکلف کی ضرورت نہیں، میں کھانا کھا کے آئی ہوں۔"

چمپا لجاجت سے بولی: "بس چائے پی لوں گی۔"

"غلط" آپ کھانا کھائیں گی، پھر چائے پییں گی اور ہاں اس کے بعد پان بھی کھائیں گی۔ پھر آرام سے بیٹھ کے باتیں ہوں گی۔ مجھے آپ کے پان اب تک یاد ہیں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو رات کو یہاں قیام بھی کریں۔ مجھے اتنی اجازت دیجیے کہ میں لباس تبدیل کرلوں، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چمپا کا جواب سُنے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اور چمپا اکیلے رہ گئے۔ میں نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور تیز نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔ میرے حواس خبط ہوگئے تھے، عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اُسے کس لہجے میں مخاطب کروں، وہ یہاں کیوں آئی ہے، جب وہ راج کرشنا سے بات کررہی تھی۔ تو اس کے ایک ایک لفظ پر میرا دل ہَول جاتا تھا۔ نہ جانے اُس کی زبان سے اب کیا نکل جائے۔ یہ میرا گھر بھی نہیں تھا کہ میں اُسے دھکّے دے کے نکال دیتا۔ "تم کیسے ہو؟" اچانک اُس کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تو ٹھیک ہوں مگر تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے چیخ کر کہنا چاہا لیکن میری بلند آواز راج کرشنا کے خوف سے گھُٹ کے رہ گئی: "بتاؤ تم واپس کیوں آئی ہو؟"

"میں اب وہاں نہیں رہ سکتی۔"

"کیوں نہیں رہ سکتیں؟" میں نے جھنجلا کے پوچھا۔

"مجھ سے اب وہاں نہیں رہا جاتا۔ تمھاری بات مان کے میں وہاں چلی تو گئی تھی لیکن میں نے یہ دن کانٹوں پر کاٹے۔"

"کیوں آخر کیوں؟" "تم آخر چاہتی کیا ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی: "میں جس حالت میں تمھیں چھوڑ کے گئی تھی۔ اُس نے مجھے چین لینے نہیں دیا۔ ان دو ہفتوں میں، میں نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی، ہر گلی کوچے میں تمھیں ڈھونڈتی رہی۔ دیکھو میرے پاؤں، جب ہر طرف سے مایوس ہوگئی تو کرشنا جی سے مدد لینے کے لیے یہاں آگئی۔"

"مگر کیوں؟" میں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔
"تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"کیسی معافی!" میں نے تلملا کے کہا۔ "کیا وہ واپس آجائے گی؟"

"وہ تو واپس نہیں آسکتی۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا لیکن جب تک تم سچے دل سے معاف نہیں کروگے، مجھے سکون سے موت تک نہیں آئے گی، خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔" وہ رونے لگی۔

"میں نے تمھیں معاف کیا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "یہ اُس کی قسمت تھی۔ اب تم اپنے گھر جاؤ اور دیکھو یہاں اپنی زبان مت کھولنا۔ کرشنا جی اگر تم سے میری قرابت کے بارے میں کرید کریں تو کچھ بھی بات بنا دینا مگر کوئی اور بات زبان پر مت لانا، سمجھ گئیں؟"

"سمجھ گئی۔ تم مجھے اتنا بُرا کیوں سمجھتے ہو، مجھے تمھاری عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تم اگر یہاں نہ ملتے تب بھی میں اُن سے کچھ نہیں کہتی۔ بہرحال اچھا ہوا تم ان کے پاس چلے آئے، خدا انھیں اپنی امان میں رکھے۔"

"مجھے کچھ سکون ہوا۔" "مگر تم،....... تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں کیا سوچوں گی۔" وہ سانس بھر کے بولی۔ "میری تو بس ایک ہی آرزو ہے کہ زندگی کے باقی دن تمھاری خدمت کرتے ہوئے گزار دوں یہی سوچ کے بمبئی آئی تھی کہ تمھیں ڈھونڈ کے، جہاں تم رہو گے، وہاں میں بھی کسی کونے میں پڑی رہوں گی۔ تم مجھے اپنے گھر میں اتنی جگہ تو دے دو گے کہ میں اپنا یہ سیاہ چہرہ چھپا سکوں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہوں۔ تم مجھے ایک ملازمہ سمجھ کے قبول کر لوگے۔ میں اب اُن لوگوں میں واپس جانا نہیں چاہتی اور نہ تمھیں پریشان کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"تم یہ باتیں پہلے بھی کر چکی ہو اور میں ان کا جواب دے چکا ہوں۔ میں، میں کیا بتا سکتا ہوں، میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے چمپا بائی۔ تمھیں میری حالت معلوم ہے۔ میں یہاں خود کرشنا جی کے ہاں ٹھیرا ہوا ہوں۔ میری مانو تم کہیں اور، کہیں اور چلی جاؤ۔ دُنیا بہت بڑی ہے۔ اگر تم نے اچھی زندگی گزارنے کا عہد کر لیا ہے تو تمھیں کوئی نہیں روکے گا۔"

"مگر مجھے ہر جگہ تمھارا خیال ستائے گا۔"

"میری بات چھوڑو۔" میری آواز بھر آگئی۔ "میرا کوئی یقین نہیں ہے جب تک بات چل رہی ہے، چل رہی ہے۔ پتہ نہیں کل میں کہاں ہوں، ہوں بھی یا نہیں۔"

"نہیں، تم ہو گے۔" وہ وحشت سے بولی۔ "اور تمھارے سب بچھڑے ہوئے مل جائیں گے، تم تو اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔"

"اتنی جلدی؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "تمھیں کیا معلوم۔"

"ہاں مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن اتنا تو میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری عمر کیا ہے، خدا نے تمھیں دماغ بھی دیا ہے، حوصلہ بھی، تم ایک مرد ہو۔"

"بس چمپا بائی۔" میرے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ راج کرشنا لباس تبدیل کر کے واپس آگیا۔ میں نے چپ سادھ لی۔ چمپا بھی سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ وہ ہم دونوں کو مسکرا کے دیکھنے لگا لیکن ابھی ٹھیک طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے خیال آیا، بھجو نے اُس کی آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ اُس نے چمپا سے معذرت کی اور بھجو کو دیکھنے کے لیے خود ہی اُٹھ کے اندر جانے لگا۔ ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی جیسے ہی وہ اوجھل ہوا، میں نے چپکے سے کہا۔ "میں کل صبح تمھارے پاس آؤں گا۔ تم اُسی ہوٹل میں ٹھیری ہوئی ہو نا؟"

"ہاں!" اُس نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

راج کرشنا بھجو پر ناراض ہوتا ہوا فوراً ہی واپس آگیا اور کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کے یوں ہی کسمساتا رہا۔ وہ صرف ایک بار ریل میں سفر کے دوران چمپا سے ملا تھا لیکن ایک دن کی اس ملاقات کا نقش اتنا گہرا تھا کہ راج کرشنا اُسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کا آدمی تھا اور سمجھ بوجھ کے آدمی کو بات کرتے ہوئے دیر لگتی ہے۔ چمپا نے مجھے محتاط رہنے کا یقین دلا دیا تھا مگر میرا دل مطمئن نہیں تھا، نجانے راج کرشنا کیا سوال کر بیٹھے اور چمپا سے بات بنائے نہ بنے۔ چمپا کی آمد کے بعد خود میری خاموشی اور سکوں آمیز اضطراب سے راج کرشنا کا ذہن کسی طرف بھی جا سکتا تھا۔ ایک بات سے پردہ اُٹھا تو بہت سے پردے اُٹھنے کا اندیشہ تھا، راج کرشنا پولیس افسر تھا اور افسر بھی ایسا جس کے حواس عام آدمیوں سے کئی گنا تیز تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی آنکھیں بظاہر دیوار کی سمت دیکھ رہی ہیں مگر وہ ہم دونوں کو ٹٹول رہی ہوں گی، چند لمحے سکوت رہا پھر وہ جھجک کے بولا۔ "اور سنائیے کیسے مزاج ہیں، آپ کی صحت تو ٹھیک ہے؟"

"جی۔" چمپا سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ظہیر کو یہاں دیکھ کے آپ کو خاصا اچنبھا ہوا ہوگا۔ یہ مجھے ملے تو میں انھیں اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ ایک آپ کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اب آپ یہیں رہیے۔ بمبئی میں میرا گھر ہو اور آپ ہوٹل میں ٹھیریں۔ یہ ایک نہایت نامناسب بات ہے، ویسے بھی یہاں کئی کمرے خالی پڑے ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میری ماں یہاں ہوتی تو مجھے بہت بُرا بھلا کہتی کہ میں آپ جیسے محسنوں کو اسٹیشن ہی سے اپنے ساتھ کیوں نہیں لایا۔ بعد میں میں آپ دونوں کو کئی دنوں تک ڈھونڈتا رہا۔"

"شرمندہ مت کیجیے، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" چمپا اٹک اٹک کے بولی۔ "ہاں ظہیر نے بے شک اُس وقت اپنے حواس بجا رکھے تھے، اگر آپ اُسے احسان سمجھتے ہیں تو وہ ظہیر خاں نے کیا ہے۔ میں تو ایک تماش بین کی طرح سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔"

"نہیں، آپ بھی میری وجہ سے ایک نازک وقت سے دوچار ہو گئی تھیں۔ آپ نے میرے ساتھ بہت سلوک کیا۔ مجھے سب باتیں یاد ہیں، میں نے ظہیر خاں کو یہاں لا کے کہا تھا کہ یہ احسان کا معاوضہ نہیں۔ جس کا

معاوضہ ادا کیا جائے وہ احسان نہیں ہوتا۔ آپ یہاں ٹھہر کے مجھے خوش کریں گی۔ ظہیر بھی اکیلا رہتا ہے۔ جب تک آپ کا جی چاہے آپ یہاں رہیے۔ کسی بات کا تکلف مت کیجیے۔"

"شکریہ۔" چمپا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ "میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دوں گی، ہوٹل میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کل صبح میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کا سامان لے آئے گا۔" راج کرشنا نے افسرانہ انداز میں فیصلہ سنا دیا۔ میں سنتا اور دیکھتا رہ گیا۔ چمپا بہت جز بز ہوئی۔ دونوں نے میری طرف دیکھا۔ میں درمیان میں دخل دینے والا کون تھا۔ یہ راج کرشنا کا گھر تھا، وہ اپنے گھر میں کسی کو بھی مہمان رکھے۔ میں نے نگاہیں چرالیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ عورت کون ہے۔ تم ایک پولیس افسر ہو۔ پہلے ہی تمہارے گھر میں ایک مشتبہ آدمی موجود ہے۔ اب دوسرے کو دعوت دے رہے ہو۔ اپنے عہدے کا خیال کرو۔ کبھی بات کھلی تو لوگ کیا کہیں گے۔ ویسے ہی لوگ تمہارے دشمن ہیں۔ ہر جگہ کہتے پھریں گے کہ راج کرشنا جیسے مشہور پولیس افسر کے ہاں فیض آباد کی مشہور طوائف چمپا بائی ٹھہری ہوئی ہے اور ایک نوجوان جس نے قتل کے الزام میں سات سال جیل میں گزارے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ راج کرشنا کی باریک بین نگاہیں چمپا کے چہرے، اُس کی باتوں اور انداز و اطوار کا جائزہ کیوں نہیں لے رہی ہیں۔ گو چمپا کے چہرے اور لہجے میں بہت سادگی تھی۔ کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ایک طوائف ہوگی مگر وہ تو راج کرشنا تھا، سڑک پر چلتا ہوا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اسے جاننا چاہیے تھا کہ ایک عورت یکہ و تنہا ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ رات کو اس وقت یہاں موجود ہے۔ کوئی عورت کس وجہ سے بار بار اس شہر کا رُخ کرتی ہے اور ہوٹل میں ٹھہرتی ہے۔ راج کرشنا کو یہ بھی محسوس کرنا چاہیے تھا کہ میں نے اُس کے سامنے چمپا سے کوئی بات نہیں کی ہے اور نہ اُس کی طرح میرے چہرے پر تپاک چھایا ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو اُس نے چمپا کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ میں نے سرسری طور پر اُس کا ذکر کیا تھا کہ بس وہ چلی گئی۔ راج کرشنا کو اگر میرا خیال تھا تو یہ باتیں محسوس کرنی چاہیے تھیں۔ شاید وہ سفر کے دوران ہمارے بارے میں اپنے لگائے ہوئے اندازوں پر پشیمان تھا اور اب ہمارے متعلق کوئی غلط بات سوچنے کے لیے اُس کا ذہن آمادہ نہیں ہوتا ہوگا۔ چمپا کی آمد پر میری خاموشی اور گھبراہٹ، اُس نے میری کسرِ نفسی پر محمول کی ہوگی مگر میرے پاس خاموش رہنے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ چمپا کو اچانک یہاں دیکھ کے جھوٹ موٹ کی خوشی کا اظہار مجھ سے کبھی نہ کیا جاتا اور نہ میں ناراضی کا اظہار ہی کر سکتا تھا کہ چمپا کی برہمی کا اندیشہ بھی تھا۔

بھکتو نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔ چمپا کی وجہ سے ہم دونوں بھی اُس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ چمپا چند ہی لقمے منہ میں ڈال سکی۔ اس اثنا میں راج کرشنا ریل میں حملہ کرنے والے آدمی اور اُس کے گروہ کے متعلق دلچسپ باتیں سناتا رہا۔ چمپا گردن جھکائے سنتی رہی۔ کھانے کے بعد راج کرشنا نے اسے آرام کا مشورہ دیا۔ وقت بھی کافی ہو چکا تھا، وہ واپس جانے کی درخواست کرتی رہی مگر راج کرشنا نے اُس کی ایک نہ سنی۔ کمرہ کھلوا کے صاف کرایا اور جب تک چمپا اپنے کمرے میں داخل نہیں ہوگئی، وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔

میں خاموشی سے اپنے بستر پہ چلا آیا۔ اس وقت تو اور باتوں میں وقت نکل گیا مگر کل صبح، کل دوپہر، کل شام، چمپا نہ جانے کب تک ٹھہری رہے۔ اس سے بہتر اور کون سا گوشہ اسے میسر آئے گا۔ میں اپنے بستر پہ لوٹتا رہا۔ ٹھیک ہے چمپا یہاں رہے اور راج کرشنا اپنی محسنہ کی خاطر داری کرتا رہے۔ میں تو پہلے ہی کہاں رُک رہا تھا۔ میں کہیں اور نکل جاؤں گا۔ جب تک چمپا سامنے رہے گی، مجھے ممتی کی یاد آتی رہے گی، اور میں خود یہاں کب تک رہوں گا۔ کلب میں مسز روپ کے گلے میں پڑا ہوا ہار دیکھ کے میرے دل کو قرار نہیں تھا۔ رات بہت ہوگئی تھی۔ نانا بھائی جوہری کی دکان بند ہوگئی ہوگی اور اُس کے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ میں کلب سے سیدھا اُس کی طرف جاتا اور اُس سے التجا کرتا، "تجھے تیری اولاد، اپنے خدا کی قسم، مجھے صحیح صحیح بتا دے کہ یہ ہیرا تو نے کہاں سے حاصل کیا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ وہی ہیرا تھا جو کورا اپنے ساتھ ہمارے گھر لائی تھی۔ اور موتی، میں نے خود انھیں ٹٹول کے دیکھا تھا۔ وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے ہوئے تھے۔ انھیں نے انھی موتیوں سے ایک مالا بنا کے مجھے دی تھی۔ راستے میں مجھے خیال بھی آیا تھا کہ راج کرشنا سے اسی وقت نانا بھائی کے ہاں چلنے کی استدعا کروں، مجھے شاید وہ آسانی سے اُس شخص کا نام نہ بتاتا جس سے اُس نے یہ ہیرا خریدا تھا، اتنی قیمتی چیزوں کی خرید و فروخت میں تو بڑی رازداری برتی جاتی ہوگی۔ رات کاٹنی یوں بھی مشکل تھی کہ چمپا بائی آگئی۔

میں صبح جلد ہی اُٹھ کے باہر آگیا مگر چمپا بائی اور راج کرشنا مجھ سے پہلے بیدار ہو چکے تھے۔ ناشتے کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی، کرشنا زیادہ تر اخبار بینی میں ڈوبا رہا اور چمپا گھر میں اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ جب میں لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آیا تو راج کرشنا بھی باہر جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔" میں نے اسے اطلاع دینی مناسب سمجھی۔

اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ جیسے اُسے شبہ ہو گیا ہو کہ اب میں واپس نہیں آؤں گا۔ میں نے نہ انکار کیا، نہ اقرار۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور لان عبور کرنے لگا، چمپا کیاری سے پھول توڑ رہی تھی۔ اُس نے گلاب کا ایک ایک پھول مجھے اور راج کرشنا کو پیش کیا۔ راج کرشنا نے اُسے کوٹ میں لگا کے چمپا کا شکریہ ادا کیا۔ "آج دوپہر تو آپ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا

کھانا کھلائیں گی۔ یہاں گوشت وغیرہ سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔ آپ جو بھی تیار کریں گی، بڑے شوق سے کھاؤں گا۔ میں نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ ہوٹل سے آپ کا سامان لے آئے۔"

پمیلا نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر راج کرشنا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا، آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم ایک معروف بازار سے گزر رہے تھے۔ راج کرشنا اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ ایک جگہ اُس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ سامنے نانا بھائی جوہری کی شاندار دُکان تھی۔ میرا سر چکرا گیا۔ نہ معلوم نانا بھائی ابّا جان کے بارے میں کیا بتائے؟ شاید اُسے اُن کا پتہ بھی معلوم ہو۔ اگر یہ سب باتیں راج کرشنا کے سامنے ہوئیں تو میں اُس سے کیا کہوں گا۔ گاڑی سے اُتر کے میرے لیے اپنے پیروں پر چلنا دوبھر ہو رہا تھا مگر راج کرشنا مجھے گھسیٹتا ہوا دُکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دُکان کے ایک باادب ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرے میں دو اطراف شیشے لگے ہوئے تھے اور ایک تن درست گول مٹول زرد رنگت کا شخص اُونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا، اُس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہو گی۔ میرے جسم میں خون تھم گیا تھا۔ نانا بھائی نے متانت سے ہمارا استقبال کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہ وہ ہماری کیا خدمت انجام دے سکتا ہے۔

"آپ کو ایک تکلیف دینی ہے۔" راج کرشنا نے جھجک کے کہا۔

"ضرور، حکم؟" وہ آنکھیں جھپکا کے بولا۔

"آپ کا وقت تو ضائع ہو گا لیکن کچھ ایسا ہی ضروری کام ہے۔" راج کرشنا نے آدھی انگریزی اور آدھی شکستہ اُردو میں شائستگی سے کہا۔ "آپ مسٹر پٹیل سے تو خوب واقف ہوں گے۔ وہی پٹیل صاحب جن کا ایک حادثے میں گزشتہ سال انتقال ہو گیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "وہ بہت مہربان آدمی تھے۔ میرے اچھے دوستوں میں تھے، بہت خوش ذوق لیکن آپ.... آپ...."

راج کرشنا نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ "اُن کی بیوہ مسز روپ پٹیل کے پاس ایک نادر ہار ہے۔ وہ ہار اُن جہانی پٹیل صاحب نے آپ کے ہاں سے خریدا تھا۔ شاید آپ کو یاد ہو، ضرور یاد ہو گا کیونکہ اُس میں ایک منفرد قسم کا ہیرا اور چار بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے۔ ہیرا جسامت میں چھوٹا اور نیلے رنگ کا تھا۔" نانا بھائی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "مسز روپ پٹیل نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ نے وہ ہار سپرد کرتے وقت اُن سے اُس کے ہیرے کی بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دُنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند اسے آپ کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ کہیے آپ کو کچھ یاد آیا؟" نانا بھائی نے متجسس انداز میں گردن ہلائی۔ راج کرشنا نے تیزی سے کہا۔ "وہ ایسا ہیرا نہیں تھا جسے آپ کی جوہر شناس نگاہ بھول سکے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے وہ ہیرا کس ضرورت مند سے خریدا تھا؟ وہ کون صاحب تھے اور اُن کا پتہ کیا ہے؟"

نانا بھائی نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا، اُس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا، میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ "جناب!" اُس نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ "مسز روپ پٹیل نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک نادر ہیرا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو فروخت کرنے والے کا نام نہیں بتا سکتا۔"

"دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو آپ بتانا نہیں چاہتے، یا آپ بھول گئے ہیں ہماری یہ درخواست بے جا ضرور ہے مگر معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ براہِ کرم ہماری مدد کیجیے۔ ہم بڑی اُمید سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ آپ کی نیک نامی اور ساکھ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

"مگر جناب! یہ بات میرے کاروباری اصول کے خلاف ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایک بات سمجھ لیجیے۔ معاف کیجیے، کوئی اور خدمت ہو تو بتائیے۔" وہ رُکھائی سے بولا۔

"نانا بھائی! ہم مسز روپ پٹیل کی سفارش بھی لا سکتے ہیں، آپ چاہیں تو انھیں فون کر لیجیے۔" راج کرشنا نے نرمی سے کہا۔ "میری مراد ہے۔ کہ آپ ہم پر ہر طرح کا اعتماد کر سکتے ہیں۔"

"سفارش اور اعتماد کی بات نہیں ہے جناب! اصول اپنی جگہ ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، مجھے وہ ہیرا اور موتی خریدے ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں۔ آپ نے خود فرمایا ہے کہ اسے مسٹر پٹیل نے تین سال پہلے مجھ سے خریدا تھا۔ یہاں نہ جانے کتنے ہیرے روز آتے ہیں۔ آپ ذرا سوچیے، کون یاد رکھ سکتا ہے۔"

"وہ ہیرا ایسا نہیں تھا جس کے فروخت کرنے والے کا چہرہ آپ کے ذہن میں محفوظ نہ ہو۔ ایسے سودوں میں ہر طرح کی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ آپ نے اپنی تسلی کے لیے ہر احتیاط کی ہو گی۔ رسید دی ہو گی، اسٹامپ لکھا ہو گا۔ اُس شخص کا نام پتہ آپ کے ریکارڈ میں ضرور موجود ہو گا۔"

"فرض کیجیے، یہ سب محفوظ ہے بھی تو میں بتانے پر آمادہ نہیں ہوں۔" وہ کبیدہ ہو کے بولا۔ "آپ مجھے مجبور مت کیجیے۔"

"دیکھیے آخر آپ نے قبول کر لیا کہ اُس شخص کا نام آپ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔" راج کرشنا نے اُسے چمکیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم آپ سے یہ کہیں کہ وہ ہیرا چوری کیا گیا تھا تو آپ کا جواب کیا ہو گا؟" اُس کے لہجے میں نمایاں طور پر سختی آ گئی۔

"میرا جواب آپ کو معلوم ہے لیکن میں ہر شخص کے سامنے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" نانا بھائی بیزاری سے بولا۔ "میرا وقت خاصا قیمتی ہے۔ ابھی صبح ہوئی ہے۔"

راج کرشنا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ

اُس کے سامنے پیش کر دیا۔ "یقیناً آپ کو اب کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ آپ نے اعتراف کرلیا ہے کہ اس ہیرے کی خرید کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا تھا۔"

نانا بھائی نے کارڈ اُٹھا کے اُس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور چند ثانیوں میں اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ اچانک چونک پڑا۔ کھڑا ہوگیا اور اُس نے تیزی سے فرش پر اُتر کے راج کرشنا کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "آپ نے کمال کر دیا۔ آپ پہلے ہی بتا دیتے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔" اُس کا لہجہ اور طور طریق یکسر بدل گیا۔ اُس نے ملازم کو آواز دے کے کافی لانے کے لیے کہا۔ "حد ہوگئی جناب! اب بتائیے۔ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے سامنے آپ بیٹھے ہیں۔ دیکھیے نا۔ یہ سودے بڑی رازداری کے ہوتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔" وہ بار بار معذرت کرنے لگا۔ "کل اور آج کے اخبارات آپ کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آج صبح صبح آپ کے دیدار ہوجائیں گے۔ میں نے توجہ ہی نہیں دی حالانکہ کل اور آج دونوں دنوں کے اخبارات میں آپ کے فوٹو چھپے ہیں۔ کاش آپ مجھے پہلے بتا دیتے۔"

"ہر جگہ یہ حوالہ دیتے ہوئے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا، ہمارے چہرے بھروسے کے قابل ضرور ہیں۔ یہ کارڈ میں مجبوراً استعمال کرتا ہوں۔"

"پتھروں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں بھی پتھر ہوگئی ہیں۔"

"پھر تو اور قیمتی ہوگئی ہوں گی۔" راج کرشنا مسکرانے لگا۔

"آپ اشارہ کر دیتے۔" وہ پشیمانی سے بولا۔ "مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اب اس کی تلافی کس صورت میں ہو سکتی ہے؟ مجھے آپ کا وقت ضائع کرنے کا افسوس ہے۔"

"تلافی کیا۔" راج کرشنا نے بے پروائی سے کہا۔ "اب آپ اپنی یادداشت پر زور دے کے ہمیں اس شخص کے بارے میں بتا دیجیے جس کے لیے ہم نے آپ کو زحمت دی ہے۔"

"زحمت کیسی جناب! میں بتاتا ہوں۔" نانا بھائی نے ندامت سے اپنی پیشانی پکڑ لی۔ "میں نے وہ ہیرا اور موتی ایک نہایت معزز شخص سے خریدے تھے۔" میرے کانوں میں جلن ہونے لگی، میں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ "وہ ایک مسلمان تھے۔ مجھے تو کوئی جاگیردار اور نواب معلوم ہوتے تھے۔ اُن پر بُرا وقت آگیا تھا۔ ایسے لوگوں کو ہماری ضرورت پڑتی ہی ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے بھی چند موتی اور ایک ہیرا میرے پاس فروخت کیا تھا مگر وہ ہیرا اتنا زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ انھوں نے مجھ سے رازداری کا عہد لیا تھا۔ اگر آپ کے بجائے کوئی اور یہ سوال کرتا تو میں جواب دیتا، زندگی بھر اپنا عہد نبھاتا۔ وہ اِدھر کئی برسوں سے مجھے نظر نہیں آئے۔ بمبئی میں ہوتے تو ضرور آتے۔ میں انھیں اپنے پاس دیر تک بٹھاتا تھا کیونکہ وہ مجھے ایک اچھے آدمی نظر آتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں یہ ہیرا کسی صاحبِ ذوق ہی کو فروخت کروں۔ میں نے مسٹر پٹیل کو منتخب کیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس سودے میں کوئی بہت بڑا منافع نہیں ہوا تھا۔"



"اُن کا نام؟" نانا بھائی سوچتے ہوئے بولا۔ "دلاور خاں تھا شاید۔"

"شاید نہیں، سوچ کے بتائیے۔"

"جی ہاں کچھ یہی نام تھا۔" وہ جھجک کے بولا۔

راج کرشنا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلی بار درمیان میں دخل دیا۔ "اُن کی عمر کیا ہوگی؟ وہ کس حلیے کے آدمی تھے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔ میری آواز کپکپا رہی تھی۔

نانا بھائی کے چہرے پر کشمکش کے آثار ہویدا ہوئے۔ "اُن کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ قد اوسط درجے کا تھا، رنگ کھلتا ہوا تھا، مونچھیں نمایاں تھیں۔ بہت چھوٹی سی داڑھی تھی۔ بہت باوقار چہرہ تھا۔ ہمیشہ شیروانی میں آتے تھے، صاف ستھرے لباس میں، لیکن وہ کچھ اُلجھے اُلجھے رہتے تھے۔"

وہ ابا جان ہی کا حلیہ بیان کر رہا تھا۔ ابا جان نے اپنا صحیح نام نہیں بتایا ہوگا اور پھر پتہ بھی غلط لکھوایا ہوگا۔

راج کرشنا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے دوسرا سوال نہیں کیا۔ وہ تحکمانہ لہجے میں نانا بھائی سے مخاطب ہوا۔ "کیا آپ مجھے ریکارڈ دکھا سکتے ہیں؟"

نانا بھائی نے خندہ پیشانی سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی پشت کی دیوار میں نصب الماری کھول کے فائلیں ٹٹولنے لگا۔ اُس نے چند

منٹ کی چھان بین کے بعد کاغذ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ راج کرشنا نے پتہ نوٹ کر لیا۔ دستخط دلاور خاں کے تھے مگر تحریر ابا جان کی تھی، وہی شکستہ تحریر۔

"شکریہ" راج کرشنا نے اُسے کاغذ واپس کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نے اس پتے کی تصدیق کی تھی؟"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی، مجھے اُن کی بات پر اعتماد تھا۔ یہ اُن کی توہین ہوتی کہ میں اُن کے پتے کی تصدیق کرتا۔"

نانا بھائی نے کافی پلائے بغیر ہمیں اپنی دُکان سے نہیں جانے دیا۔ میں نے چند گھونٹ لے کے کافی یوں ہی چھوڑ دی۔ نانا بھائی ہمیں گاڑی تک رخصت کرنے آیا اور چلتے چلتے اُس نے اپنے رویّے کی کئی بار معافی چاہی۔ راج کرشنا نے ڈرائیور کو نانا بھائی سے حاصل کیے ہوئے پتے پر چلنے کی ہدایت کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنا وقت خراب کر رہا ہے۔ نام کی طرح ابا جان نے پتہ بھی غلط لکھوایا ہوگا مگر میں نے اُسے منع نہیں کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اُس چار منزلہ عمارت میں داخل ہو رہے تھے جس کا نام ابا جان نے اپنے پتے میں لکھوایا تھا۔ وہاں بھی وہی نتیجہ نکلا، اس نام کے کسی شخص سے کوئی واقف ہی نہیں تھا، راج کرشنا نے حلیہ بیان کیا مگر ابا جان کے پتے والے فلیٹ نمبر میں دس سال سے ایک ہی خاندان رہ رہا تھا۔ راج کرشنا مایوس قدموں سے لوٹ آیا۔ مجھے کوئی خاص دُکھ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ کھوئے ہوئے لوگ اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔ ابا جان نے فہمیدہ کے غائب ہو جانے کے کچھ دنوں بعد ہی بمبئی شہر چھوڑ دیا تھا۔ نانا بھائی کی باتوں سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی تھی وہ عرصے سے اُس کے پاس نہیں آئے تھے۔ اگر بمبئی میں ہوتے تو ضرورت کے وقت کسی اور جوہری کے پاس نہ جاتے۔ اب کسی اور شہر میں کسی نئے جوہری سے دوستی کر لی ہوگی مگر پوٹلی کب تک چلائیں گے۔ پوٹلی خالی ہو جائے گی تو کیا کریں گے، شاید پھر بھیک مانگیں گے۔ ایک لڑکی کو بالا خانے پر بھیج دیا تھا مگر ابھی چار اور باقی ہیں۔ دو بیٹے بھی ہیں۔ جیب تراشی اور نقب زنی کے فن میں ماہر ہو گئے ہوں گے۔ نہ باپ کو اُس کا خزانہ ملے گا، نہ بیٹے کو اس کا۔ دونوں خزانے کی تلاش میں تھے۔ ایک زر و جواہر کے خزانے کی، دوسرا ایک لڑکی کے خزانے کی۔ وہ کاغذات کی سیاہ لکیروں اور لفظوں میں اپنی قسمت ڈھونڈ رہے تھے اور بیٹا اندھی گلیوں اور بازاروں کے چکّر کاٹ رہا تھا۔

سب سے بڑا ہے وہ خزانہ ہی کیا، جو آسانی سے مل جائے۔ موٹر سڑکوں پر بھاگ رہی تھی۔ میں شیشے کے پار لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ راج کرشنا کسی سوچ میں گم تھا۔ ابا جان اگر صحیح نام اور پتہ لکھوا دیتے تب بھی ملتے نہیں مگر وہی بات ہوتی جس کا چمپا کے آنے کے بعد مجھے خوف لاحق ہو گیا تھا۔ راج کرشنا مولوی اکرم کے پاس جاتا اور مولوی اکرم ساری کہانی بتا دیتے۔ موٹر دادر کے اُس ہوٹل کے سامنے ٹھہر گئی۔ جہاں میں اور چمپا ٹھہرے تھے۔ پھر ڈرائیور گیا اور ناکام واپس آ گیا، ہوٹل والوں نے اُسے چمپا کا سامان نہیں دیا۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ کہیں راج کرشنا خود نہ اندر چلا جائے۔ ہوٹل والوں کو معلوم ہوگا کہ چمپا کس قماش کی عورت ہے۔ ہوٹل کے کئی بیرے بھی اُسے جانتے تھے۔ راج کرشنا کی زبانی چمپا بائی کا نام سُن کے وہ مسکرائیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ راج کرشنا صاحب اُس کا سامان ہوٹل سے لے گئے تھے۔ میں نے سوچا، میں اُتر کے جاؤں کیونکہ ہوٹل والے مجھے جانتے ہیں لیکن اگر انھوں نے منع کر دیا تو؟ کسی کو کسی کا سامان سپرد کر دینا ہوٹل کے اصول کے خلاف تھا۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ راج کرشنا ایک دم موٹر سے اُتر کے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اُسے واپس ہونے میں چند ہی منٹ لگے۔ معلوم نہیں ہوٹل والوں نے اُس سے کیا کیا کہا سُنا اور کن نظروں سے دیکھا۔ میں نے اُس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ گھر کے قریب وہ اپنی نشست سے کھسک کے میرے نزدیک آ گیا اور میرا ہاتھ دباتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔" میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا کہ وہ کس بات کا افسوس کر رہا ہے۔ "گھبرانے کی بات نہیں۔" اُس نے مضبوط آواز میں کہا۔ "ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اِسی ہمّت کا ثبوت دیتے رہو۔"

میں اُس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے میری گردن سہلانی شروع کر دی۔ گھر آ گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں چمپا موجود تھی۔ راج کرشنا چند قدم چلا اور ٹھٹک کے رُک گیا۔ "ظہیر! ہم کسی دوسرے گھر میں تو نہیں آ گئے؟" وہ ہنس کے بولا۔ چمپا نے اتنی سی دیر میں گھر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ ہر چیز ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ کرسیوں، صوفوں کے غلاف اور کھڑکیوں کے پردے بدلے ہوئے تھے۔ راج کرشنا نے ممنونیت کا اظہار کیا تو چمپا دُہری ہو گئی اور نظریں نیچی کر کے بدحواسی سے کہنے لگی۔ "ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی، کئی لوگ آپ کو پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔"

راج کرشنا کا منہ بن گیا۔ جھنجلاہٹ سے اُس نے فون اُٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ فون پر وہ انگریزی میں کسی سے مخاطب تھا۔ اُسے آج دفتر جانا چاہیے تھا۔ یہ شبانہ، اُس کے ساتھیوں اور اُس کے سرپرستوں، بائی کلّا کی کئی معتبر شخصیتوں کی گرفتاری کا تیسرا دن تھا اور وہ چمپا کا شکریہ ادا کرنے اور میرا حال درست کرنے کی اُلجھن میں پڑا ہوا تھا۔ فون پر اُس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ اور گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں اور شہر کے دوسرے علاقوں میں حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں۔ راج کرشنا کے چہرے پر تشویش کی لکیریں بڑھتی گئیں اور اچانک اُس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ ہاتھ ملنے اور زانو پر گھونسے مارنے لگا۔ "میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔" اُس نے طیش میں کہا۔ "اس کے بجائے میں استعفا دینا زیادہ پسند کروں گا۔ تو پھر مجھے یہاں

بلایا کیوں گیا ہے؟ نہیں۔ ایک بھی آدمی نہیں چھوڑا جائے گا۔ منشانہ کے آدمیوں کو روم نمبر ۳ میں لے جاؤ اور جلد از جلد کارروائی مکمل کر کے انھیں عدالت میں پیش کر دو۔ کسی نے کچھ کہا ہوگا۔ راج کرشنا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے چیخ کر انکار کیا پھر فون بند کر کے اس نے فوراً دوسرا نمبر ملایا اور مخاطب کو ہدایت کی کہ وہ ملزموں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے ضرور رابطہ قائم کرے ورنہ وہ سینٹر سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس نے مختلف جگہوں پر یکے بعد دیگرے کئی فون کیے اور وہ بہت تھکا تھکا نظر آنے لگا۔ فون رکھنے کے بعد وہ کئی لمحوں تک سر جھکائے گم سم بیٹھا رہا۔ "مجھے جانا ہوگا۔" اس نے بے قرار ہو کے خود سے سرگوشی کی۔ پھر شاید اسے احساس ہوا کہ کمرے میں وہ تنہا نہیں ہے، ہم دونوں بھی موجود ہیں۔ اس نے اضطراری حالت میں ہمیں دیکھا اور اپنے چہرے کا کھنچاؤ دور کرنے کی کوشش کی۔ "تم نے سنا ظہیر!" وہ میرے پاس آ کر مسکرا کے بولا۔ "کیا دلچسپ بات ہے پولیس پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ان معززین کو آزاد کر دے جنھیں برسوں ناجائز کرنسی اور منشیات کے ذخیرے وغیرہ کے سنگین جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ کبھی کبھی تو بادشاہ بننے کو جی چاہتا ہے۔ اگر دباؤ کا یہی سلسلہ جاری رہا تو پولیس کا محکمہ کسی دن عملاً ختم ہو جائے گا یا کوئی دوسری حیثیت اختیار کر لے گا، بالکل الٹ کام کرے گا۔ اسے جرائم کی ڈھال اور پردے کے طور پہ استعمال کیا جائے گا۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ کپڑے بدل کے باہر جانے کے لیے تیار تھا کہ چمپا نے دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا کھانا یہاں نہ کھائیے گا؟" راج کرشنا نے ارادہ ملتوی کر دیا اور مجھے ہدایت کی کہ کوئی فون آئے تو اب کے میں ریسیور اٹھاؤں اور صاف منع کر دوں کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ کھانے کے دوران میں اس کی طبیعت کچھ خوش گوار ہو گئی۔ کھانا بھی بہت خوش ذائقہ تھا۔ چمپا نے اس کی فرمائش کے مطابق نہایت لذیذ پکوان بنائے تھے۔ "بس مرچیں کسی قدر زیادہ ہیں۔" وہ سوں سوں کرتے ہوئے بولا۔

"آیندہ خیال رکھوں گی۔" چمپا نے محتاط لہجے میں کہا۔

"نہیں، اب کھانا پکانے کی تکلیف آپ نہیں کریں گی۔ باورچی کس لیے ہے، آپ تو آرام کیجیے اور شہر کی سیر کیجیے جس چیز کی ضرورت ہو، نوکر سے کہہ دیجیے۔"

"عورت گھر میں موجود ہو اور کھانا باورچی پکائے۔ یہ اچھا نہیں لگتا، میں اس طرح مصروف بھی رہوں گی۔ کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟"

"ارے نہیں۔" جلدی کی بنا پر نوالہ راج کرشنا کے منہ میں اٹک گیا۔ "بہت زیادہ آیا۔ میں گزشتہ برسوں میں زیادہ تر سفر میں رہا ہوں۔ گھر کا کھانا کھائے ہوئے منہ ترس جاتا ہے۔ کھانا باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا ہو یا ہوٹل کا، برابر ہوتا ہے۔ عورت کے ہاتھ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے اب

سوچیے، اگر آپ نے اِس لذیذ کھانے کا، جو آج آپ نے تیار کیا ہے، عادی بنا دیا تو پھر کہیں مزہ نہیں آئے گا۔"

چمپا کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے جلدی لوٹنے والی نہیں ہے اور اب تو اُس کا سامان بھی آگیا تھا۔ اُس نے پورے گھر کا جائزہ لے کے انتظامات درست کرنے شروع کر دیے تھے۔ نوکروں کو حکم دے رہی تھی۔ نوکر اُس کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ راج کرشنا کھانے کے بعد دفتر چلا گیا تھا اور چمپا گھریلو کاموں میں اس طرح مصروف ہوگئی تھی جیسے یہ اُس کے چچا کا گھر ہو۔ میں اپنے کمرے میں جا کے چھپ گیا۔ وہ شام کے وقت چائے کی کشتی لے کے کمرے میں آگئی۔ اُس کے ساتھ زیادہ ضد بحث مناسب نہیں تھی۔ میں نے چپ چاپ چائے پی لی اور منہ پھیر کے لیٹ گیا۔ "کیا طبیعت خراب ہے؟" اُس کا ہاتھ میری کلائی ٹٹولنے لگا۔ میں نے وہی ہاتھ لوٹ کے اُس کے منہ پر مارنے کا ارادہ کیا مگر میرا ہاتھ من بھر کا ہوگیا۔

"بس میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کسمسا کے کہا۔

وہ چپ ہوگئی، پھر کچھ وقفے کے بعد بولی۔ "رات تم کہہ رہے تھے کہ میں کل ہوٹل آؤں گا۔ کیا بات کرنا چاہتے تھے؟"

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مجھے احساس تھا کہ تم بہت خفا ہوگے مگر مجھی بتاؤ، میں کیا کرتی؟"

"میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں کیا؟"

"ہاں زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے ہو لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، میرے کان سن رہے ہیں۔ یقین کرو میں چلی جاؤں گی مگر چند دن ضرور مجھے اپنے پاس رہنے دو۔"

"میں نے کب منع کیا ہے۔ میں منع کرنے والا ہوتا کون ہوں۔"

"میرے لیے تم سب کچھ ہو چکے ہو میں تمھارے لیے کچھ بھی نہیں ہوں میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں، تمھیں اپنی مری ہوئی بہن کی قسم۔ تم ...."

"چپ رہو۔" میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "خدارا، اب تو اُسے بھول جاؤ، بار بار اُس کا ذکر کر کے کیوں مجھے تنگ کرتی ہو۔ میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"میں ہر بات سُننے کے لیے تیار ہوں، جو دل چاہے کہو، مجھے گالیاں دو، مارو پیٹو، میری آنکھیں پھوڑ دو، مجھ پر چھرے چلاؤ، مگر میری ایک بات سُن لو۔ دیکھو یہاں سے میری وجہ سے مت جانا اور ہو سکے تو کبھی مت جانا۔ کرشنا جی تمھارا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"لحاظ و مروّت کا پتہ اُس وقت چلے گا جب انھیں معلوم ہوگا۔ کہ میں کس بہن کا بھائی ہوں۔ بی بی جی! مجھے مشورے مت دو۔"

"یہ مشورہ نہیں ہے، التجا ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔ "اور کرشنا جی چھوٹی آنکھوں اور کچے کانوں کے نہیں ہیں ورنہ پھر خیال رکھنا کسے کہتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں لیکن تمھیں اچانک یہاں دیکھ کے سب کچھ بھول گئی، جیسے جیسے یاد آتی رہیں گی کہتی رہوں گی، اگر تم نے کچھ سننے کا موقع دیا۔" اُس کی آواز بہت کمزور تھی، اندھی اور لُولی آواز۔ میں مضطرب ہوگیا۔ وہ مجھ سے اور کیا بات کرنے والی تھی؟ وہ کیا باتیں ہو سکتی ہیں؟ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، مجھے اختلاج سا ہونے لگا، جی چاہا کہ اُس کے ساتھ مل کے میں بھی روؤں۔ فہمی کے مرنے سے نقصان تو اُس کا بھی ہوا تھا۔ اُس نے تو فہمیدہ کو باقاعدہ رقم دے کے خریدا تھا، میں نے تو اُس کا کوئی بھی حق ادا نہیں کیا تھا بلکہ اُس سے خدمت لیتا تھا، اُس پر غصّے ہوتا تھا۔ مجھے اپنے رویّے پہ ندامت ہونے لگی۔

"تم کیا باتیں کرنا چاہتی تھیں؟" میں نے خفیف لہجے میں پوچھا۔ اُس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ "پیارے میاں! یقین کرو میرا وہاں دل نہیں لگا۔ تمھارا چہرہ ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا تھا اور یہاں یاد آیا۔" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولی۔

"ہمارے جانے کے تیسرے دن موتیا کے پاس فیض آباد کا استاد جامو آیا تھا۔"

"جامو؟" میں اچھل کے بیٹھ گیا۔

"اُس کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ انھوں نے بالاخانے پر بڑا ہنگامہ کیا، موتیا کو بہت مارا۔ موتیا کو بھی یہی معلوم تھا کہ میں تمھارے ساتھ میسور گئی ہوں۔ اُس نے صحیح صحیح بتا دیا تھا کہ تم بالاخانے آئے تھے اور مجھے ساتھ لے کے میسور چلے گئے ہو کیونکہ اُسے یہی معلوم تھا۔ جامو نے موتیا سے میسور کا پتہ پوچھا مگر اُسے کچھ معلوم ہوتا تو بتاتی بھی۔ وہ اُسے مارتے رہے۔ آگرے کے آدمیوں نے بھی اُن کا ساتھ دیا اور اس طرح بالاخانہ بند ہوگیا۔ پھر میں پہنچی تو وہ آگرے ہی میں تھے اور شاید علاقے کے آدمیوں سے موتیا کی باتوں کی تصدیق کرتے پھر رہے تھے، انھوں نے مجھے بھی بہت مارا۔ میں نے سچ بتا دیا کہ میں تمھارے ساتھ میسور کے بجائے بمبئی گئی تھی۔ بمبئی میں تمھارے گھر والے اپنی لڑکی غائب ہو جانے کے بعد بدنامی کے ڈر سے چپ چاپ کہیں نکل گئے۔ تم نے مجھے آگرے واپس کر دیا اور خود نہ جانے کس طرف چلے گئے۔"

"کیا.... کیا تم نے سب کچھ بتا دیا؟ یہ بھی کہ اب میں بمبئی میں ہوں گا۔ تم نے کرشنا جی کے بارے میں بھی بتا دیا ہوگا؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"نہیں، میں نے انھیں کرشنا جی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اُن کا ذکر میں کس طرح کر سکتی تھی۔ میں جو سچ بتا سکتی تھی، وہ بتا دیا۔ میں نے کہا، میں نے لڑکی کو گلابے اور لولا سے حاصل کیا تھا۔ وہ دونوں جیل میں تھے، ابھی میں نے اُن کے ایک ساتھی نور جانی کی منت کر کے گلابے اور لولا سے جیل میں ملنے کے لیے آمادہ کیا تھا کہ شاید تم خود جیل پہنچ گئے اور وہاں سے اپنے گھر کا پتہ حاصل

کرلیا۔ جب تم واپس آئے تو تم نے مجھے آگرے لوٹنے کا حکم دیا۔ بس اتنی سی بات میں نے بتائی تھی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ اب تم کہاں ہو گے۔ میں نے تمھاری حالت بتائی اور کہا کہ میں نے تمھیں اسٹیشن پر چھوڑا تھا۔ شاید تم کسی اور شہر کی طرف نکل گئے۔ میں انھیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ تم ممبئی میں ہو کیونکہ میں نے تمھیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ تم اُن کے ساتھ آئے ضرور تھے مگر تم اُن میں سے تھے نہیں۔ اور میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ تم اُن لوگوں میں واپس جاؤ۔ اسی لیے میں خود تمھارے پاس آگئی۔"

"مگر..... مگر انھیں یہ کیسے پتہ چلا کہ میں تمھارے پاس آگرے آیا ہوں گا یا تم بھاگ کے آگرے گئی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے تو کسی کو نہیں بتایا تھا۔"

"انھیں کسی نہ کسی طرح ضرور پتہ چل گیا ہو گا اسی لیے وہ سیدھے آگرے آ گئے۔ شاید تم بھول رہے ہو تم نے کسی کو بتایا ہی ہو گا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "لیکن میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ یہ شہر بڑا ہے اور دُور بھی بہت ہے اور انھیں میری بات کا یقین بھی آگیا تھا۔ جبھی تو وہ واپس چلے گئے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے سردی سی لگنے لگی ایک ایک چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا میرے آنے کے بعد بھّل کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اُس نے تو طوفان مچا دیا ہو گا۔ ایک ایک کو حاضر ہونے کا حکم دیا ہو گا کہ لاڈلا جہاں ملے اُسے پکڑ کے میرے پاس لاؤ ورنہ ۔۔جامو اور رکتن کے سر بھّل کے سامنے شرمندگی سے اُٹھتے نہ ہوں گے۔ زرّیں نے تو ضبط کر لیا ہو گا میری واپسی اور عافیت کے لیے دعائیں کر رہی ہو گی اور بھّل اُسے تسلیاں دے رہا ہو گا کہ مجھے جلد ہی تلاش کر لیا جائے گا۔ ادھر کلکتے میں بھّل کے اڈّے کا کاروبار اُس کی عدم موجودی میں چوپٹ پڑا ہو گا، موجدار کے مرنے کے بعد وہاں اُس کے ہونے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اِدھر اُدھر جہاں جہاں تک اُن کی پہنچ ہو گی مجھے ڈھونڈتے رہیں گے ممکن ہے نہ بھی ڈھونڈیں تھک جائیں۔ مجھے یاد آیا میرے غائب ہو جانے کے بعد انھوں نے سیدھے نواب سراج علی کی حویلی کا رُخ کیا ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چمپا بائی کے پاس پہنچ گئے۔ نہ معلوم انھوں نے آگرے میں میرے بارے میں کیا کیا باتیں کی ہوں۔ چمپا کو پھر میرا نام لاڈلا بھی معلوم ہو گا۔ انھوں نے لاڈلے کے نام ہی سے مجھے پوچھا ہو گا۔ اگر چمپا کی زبان سے راج کرشنا کے سامنے کسی وقت لاڈلا نکل گیا تو اچھا نہیں ہو گا۔ میرا خون رگ رگ سے گردش کرنے لگا اور رگوں میں مروڑ سی ہونے لگی۔

"میاں!" مجھے مبہوت دیکھ کے اُس نے سہمی ہوئی آواز میں مجھے پکارا۔ میں چونک پڑا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں اسی لیے تو تم سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی کہ تمھیں پُرانی باتیں یاد آجائیں گی مگر تمھیں یہ بتانا بھی ضروری تھا تاکہ تم بے خبر نہ رہو۔ چھاؤں مل گئی ہے تو کہیں پھر دھوپ میں نہ نکل جاؤ۔"



میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پیالیاں اُٹھا کے کمرے سے نکل گئی۔ میرا سر پھٹ رہا تھا۔ میں نے سوچا، میں چلا جاؤں۔ بہت دُور چلا جاؤں جہاں کوئی نہ مجھے جانتا ہو نہ لاڈلا سے واقف ہو نہ چمپا سے۔ نہ اسے یہ معلوم ہو کہ میں نے جیل کاٹی ہے اور نہ کوئی میرے ساتھ وہاں ہمدردی کرے۔ اب کے میں گونگا اور بہرا بن جاؤں گا اور جنگل میں نکل جاؤں گا، جہاں کوئی آدمی نہیں ہو گا اور ہو گا تو میں اُس سے بات ہی نہیں کروں گا۔ اب کوئی مُنیں ملے گا۔ کورا کو ملنا ہو گا تو خود مجھے ڈھونڈتی ہوئی آجائے گی۔ میں نے بہت ڈھونڈ لیا۔ اب میں کسی سنسان جگہ جا کے بس اُس کے خیال میں گم رہوں گا اور دنیا کا کوئی شخص میری محویت میں رخنہ نہیں ڈالے گا۔ میں اپنی یادداشت سے اُس کا ایک مجسّمہ بناؤں گا اور بس اُسے دیکھتا رہوں گا۔ کہیں کوئی آدمی نظر آیا تو میں وہ جگہ چھوڑ کے دوسری جگہ نکل جاؤں گا۔ میں اپنے سامنے کی دیوار پر اُس کی تصویر بنا رہا تھا۔

کسی نے کمرے کی بتّی جلا کے میری آنکھیں چکاچوند کر دیں۔ راج کرشنا مجھے اُٹھا کے باہر لے آیا۔ اُس نے میرے شانے زور زور سے ہلا کے میری سُستی دُور کرنے کی کوشش کی۔ "جب میں تمھاری عمر میں تھا تو خبر ہے کیا کرتا تھا؟" وہ ستعد لہجے میں بولا۔ میں نے پٹ پٹاتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ "میں جاگتا، کھیلتا، گاتا، کھاتا اور دیواروں پر گھونسے مارتا رہتا تھا۔" وہ میری پیٹھ اور سینے پر گھونسے مارتے ہوئے بولا۔ "بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ اٹین شن، بالکل پولیس والوں کی طرح، سینہ باہر نکالو، ہاں یہ بات، اب ٹھیک ہے۔ ایک جوان اور وجیہہ آدمی۔ پولیس کی وردی تم پر کتنی جچے گی۔" چمپا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "مجھے بہت بھوک لگی ہے چمپا دیوی!" وہ چمپا سے مخاطب ہو کے عاجزی سے بولا۔ چمپا جیسے منتظر کھڑی تھی، اِدھر اُس کے منہ سے بات نکلی، اُدھر وہ باورچی خانے کی طرف لپکی۔ "آج بہت کام کرنا پڑا۔ آخر جیت میری ہی ہوئی۔ میں نے کسی کی ضمانت نہیں ہونے دی۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اور ہاں ۔۔۔ آج دفتر میں رستم جی کا فون آیا تھا، یہاں آنا چاہتے تھے، کہہ رہے تھے نورین بہت ضد کر رہی ہے۔ میں نے کہا، اِن دنوں مصروفیت ہے آپ کو پھر کسی دن بلاؤں گا۔ کہہ رہے تھے، کل کلب

میں ہمارے آنے کے بعد لوگ ہمارا تذکرہ کرتے رہے۔ تمھارے بارے میں سب متجسس تھے۔"

اُس نے اتنی باتیں کہہ ڈالی تھیں مگر میری زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹا تھا۔ مجھے پھر شدت سے وہی احساس ہوا، اپنی بدتمیزی کا احساس۔ اس احساس کی وجہ سے میرا جسم کسی مجرم کی طرح اپنے آپ کو چھپانے لگا۔ میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے، پھر میں نے سٹ پٹا کے پوچھا "مستانہ کا کیا ہوا؟"

"مستانہ!" اُس نے اچانک جیسے ایک نعرہ بلند کیا۔ "مستانہ حوالات میں مستی کر رہا ہے، ڈنڈے پر ناچ رہا ہے۔ لمبی سزا ہوگی یا شاید گلے میں ہار پڑ جائے۔ اُس کے گلے میں پڑا ہوا گیندے کا ہار بھی سُوکھ گیا ہے۔ عجیب عجیب انکشاف ہو رہے ہیں۔ آج اُسے میرے سامنے لایا گیا تھا۔ خاصا دلچسپ آدمی ہے۔ بمبئی کی پولیس کا اُسے پہلی بار ذرا اجنبی انداز میں تجربہ ہوا اس لیے بہت ناراض نظر آتا تھا۔ دیکھو گے اُسے؟"

"نہیں۔ میں نے اُسے بہت دیکھ لیا ہے۔"

"پولیس کے کئی نوجوان افسر جو میری عزت کرتے ہیں، تم سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ میں نے انھیں ٹال دیا ہے۔ سب کو حیرانی ہے کہ ایک دم اچانک کرشنا جی نے یہ کیا جادو کر دیا۔"

کھانے کے بعد وہ مجھے اور چمپا کو موٹر میں بٹھا کے چوپاٹی لے گیا۔ میں اُس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا، چمپا پچھلی نشست پر تھی۔ ہم سمندر کے کنارے جا کے ریت پر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لہریں چنگھاڑتی ہوئی ہمارے پاؤں چھُوتیں اور سمندر کی پہنائیوں میں گُم ہو جاتیں۔ راج کرشنا کہنے لگا "آدمی بھی سمندر کی ایک لہر کے مانند ہے، اُٹھتا ہے گرجتا ہے کنارے پر آکے ہانپنے لگتا ہے زمین کو بوسہ دیتا ہے اور سمندر میں لوٹ جاتا ہے۔ پھر پرانی لہروں کے خمیر سے نئی لہریں اٹھتی ہیں مگر انجام ہر لہر کا یہی ہوتا ہے۔" وہ میرے ساتھ کنارے کنارے دُور تک چلا گیا۔ چمپا وہیں بیٹھی رہی۔ راستے میں اُس نے پوچھا "ظہیر خاں! تمھاری رائے میں میں کیسا آدمی ہوں؟"

میں اُس کے سوال پر حیران رہ گیا۔ "جی، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا، مجھے ڈر لگا کہ چمپا نے ضرور اُسے کچھ بتا دیا ہے۔

"نہیں میں تمھاری رائے جاننا چاہتا ہوں، اچھی بُری جو کچھ بھی ہو بتاؤ میں خفا نہ ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"آ..... آپ کا کیا مطلب ہے؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"میرا مطلب صاف ہے؟"

"مگر کیوں؟ آپ کو اس کی کیوں ضرورت پڑ گئی؟"

"مجھے اپنے آپ پر شبہ ہونے لگا ہے۔"

"نہیں میں نے بدبانی انداز میں کہا: "شبہ نکال دیجیے۔"

وہ چلتے چلتے ٹھہر گیا: "ظہیر! مجھے تمھارا جواب معلوم ہے، تم مجھے بھروسے کے قابل آدمی سمجھتے ہو لیکن پھر مجھ پر بھروسا کرو۔ ممکن ہے تمھاری سمجھ میں کوئی بات نہ آ رہی ہو، ایسا ہے تو میری عقل پر انحصار کرو۔ اپنا ہر کام آدمی خود نہیں کرتا، اُسے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں تمھارے لیے اچھا ہی سوچ سکتا ہوں اور مجھے ایسا کرنے کا موقع دو۔"

"مگر میں..... میں تو آپ کے پاس ہی موجود ہوں۔"

"لیکن کہاں؟" وہ مایوسی سے بولا۔ "تم تو علیحدہ رہتے ہو۔"

"میں ایسا نہیں چاہتا لیکن نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے، اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو مجھے معاف کر دیا کیجیے۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن جب ایسا ہو تو خود کو دوسروں کے قابو میں دے دینا چاہیے، تجربہ کر کے دیکھ لو، اگر کوئی فرق نہ پڑا تو دوسرے خود ندامت سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ پھر وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"جی۔" میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے چمپا تک پہنچ گئے۔ اُس نے بال کھول لیے تھے۔ سمندر کی ہوا سے اُس کے بال اُڑ رہے تھے، جب ہم گھر واپس پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ میں منع کرتا رہا مگر چمپا میرا سر دباتی رہی۔ میری آنکھ لگ گئی۔



دوسرے دن سہ پہر راج کرشنا دفتر سے واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ اُس کا رنگ صندلیں تھا، نقش و نگار سجل اور تیکھے تھے جیسے انھیں ڈھالا گیا ہو۔ شکل و صورت سے وہ بہت سنجیدہ اور پُروقار نظر آتی تھی حالانکہ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ آنکھیں سیاہ اور روشن تھیں، بال بھورے اور بہت لمبے تھے۔ ایک سادہ سی ساڑھی پہنے ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔ "یہ مس جولین ہیں۔" اُس نے شائستہ لہجے میں کہا۔ "انھوں نے کم عمری ہی میں اچھا خاصا پڑھ لکھ لیا ہے اور اب میں نے انھیں زحمت دی ہے کہ یہ اپنے علم سے کچھ تمھیں بھی فائدہ پہنچائیں۔ آج سے یہ تمھیں انگریزی پڑھائیں گی۔ مس جولین! یہ ظہیر ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ تمھارے لیے ایک اچھا شاگرد ثابت ہوگا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ زبان سیکھنی ہو تو عورت سے سیکھی جائے۔"

"مگر میں..... میں" میرے حلق میں لفظ پھنس گئے۔

"مگر کیا؟ یعنی کیا تم پڑھنا نہیں چاہتے؟ علم کے سامنے آدمی کی حیثیت ہمیشہ بچے جیسی ہوتی ہے اور ایک سعادت مند بچے ہی کی طرح اس سے پیش آنا چاہیے۔"

"علم کے لیے عمر مقرر نہیں ہوتی۔" پہلی بار جولین اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں بولی "اگر آپ نے محنت کی تو صرف چند مہینوں میں آپ بہت سے سال کراس کر لیں گے۔"

"بس اب اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہیں۔" راج کرشنا نے فیصلہ کن انداز میں کہا "مس جولین! آپ اپنے شاگرد کو لے کے دائیں جانب کے کمرے میں چلی جائیے۔"

"آئیے۔" جولین نے مسکراتے ہوئے کہا "آئیے۔"

"جاؤ۔" راج کرشنا نے میرا تذبذب دیکھ کے مجھے ڈانٹا۔

میں بھاری قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ کہوں اس کی ضرورت نہیں ہے مگر بات زبان تک آ آ کے رہ گئی۔ مس جولین راج کرشنا کے کمرے میں آ گئی اور ہم دونوں میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ "یہ بتائیے کہ آپ نے پہلے کتنا پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے؟"

"کچھ نہیں، میں نے کچھ نہیں پڑھا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"کچھ نہیں؟" اُس کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ "یعنی آپ نے بالکل نہیں پڑھا؟ کچھ بھی نہیں؟ آپ حروف نہیں پہچانتے؟"

"تھوڑے بہت۔" میں نے تلخی سے کہا۔

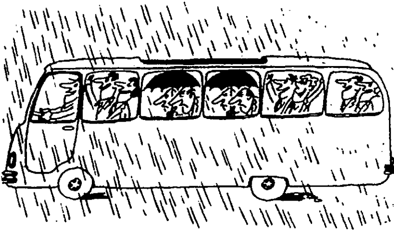
اُس نے سکون سے سادہ کاغذ کا ایک پیڈ اُٹھایا اور پنسل آگے کر دی۔

"ذرا اپنا نام لکھیے۔" میں جھجکنے لگا۔ وہ پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی "گھبرائیے نہیں جیسا کچھ بھی آپ جانتے ہیں، لکھ دیجیے۔ بہت خراب لکھ دیجیے۔" میں نے اُلٹے سیدھے لفظوں میں ظہیر خاں لکھ دیا۔ اُس نے بڑے غور سے میری تحریر کا معائنہ کیا۔ "ہوں نہہ" وہ فکرمندی سے بولی "ابتدا سے کام کرنا پڑے گا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں کل آپ کے لیے کاپیوں اور کتابوں کا سیٹ لے آؤں گی۔ دیکھیے، ساری بات شوق کی ہے۔ شوق نہیں ہوگا تو میں کیا، کوئی بھی آپ کو کچھ نہیں سکھا سکے گا۔ بس اپنے اندر شوق پیدا کیجیے اور یہ خیال دل سے نکال دیجیے کہ آپ اب تک کچھ نہیں پڑھ سکے۔ لوگ پڑھ کے بھی تو بھول جاتے ہیں۔ آپ کو جو بھی پریشانی ہو، مجھ سے فوراً پوچھ لیجیے۔" وہ مجھے سمجھاتی رہی۔ میں منہ لٹکائے سُنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ راج کرشنا کو کس طرح سمجھاؤں؟ اتنی اچھی لڑکی کو پڑھانے کے لیے مامور کرنے پر اُس نے کتنا روپیہ خرچ کیا ہوگا؟ بالکل فضول۔ مس جولین نہ جانے کہاں رہتی ہوگی، روز آنے کی، جائے گی۔ میں نے طے کیا، میں راج کرشنا کو منع کر دوں گا کہ میں پڑھنا ہی نہیں چاہتا۔ میں کچھ نہیں چاہتا مگر پھر وہ بہت ناراض ہوگا۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ جولین نے اپنی شستہ اور مہذب آواز میں مجھے پکارا۔

"مسٹر ظہیر! کیا آپ میری باتیں توجہ سے سُن رہے ہیں؟"

"جی۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا "جی سُن رہا ہوں۔"

"صرف سُننا نہیں، سُن کے دماغ میں کھپانا بھی ہے۔"



"جی۔" میں نے چستی سے کہا۔

"آپ صحت مند آدمی ہیں، نوجوان ہیں۔ بس صرف ایک چیز کی کمی ہے آپ میں۔ جب یہ کمی دُور ہو جائے گی تو دیکھیے کیسی تبدیلی آئے گی۔ لوگ ہر جانب سے آپ کے قریب ہونے کی کوشش کیا کریں گے۔ آپ کی بات میں وزن پیدا ہو جائے گا۔ لوگ آپ سے مشورے لیا کریں گے۔ آپ کی عزت میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ بڑے بڑے لوگوں سے آپ کے تعلقات ہوں گے۔ بس یہ سب آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنی یہ کمی کتنی تیزی سے دُور کرتے ہیں۔ میں آپ کے شوق میں ہر لمحے، ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیتی رہوں گی۔"

مس جولین اُس دن جلد واپس چلی گئی۔ میں دن بھر راج کرشنا سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ رات کو وہ مجھے گھمانے بھی لے گیا، کھانا بھی ساتھ کھایا مگر راج کرشنا نے اپنی طرف سے جولین کا کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا۔ وہ مجھے دن بھر کی روداد سناتا رہا کہ رستانہ کو جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے اور دو ایک روز میں اُن شہریوں کو بھی منتقل کر دیا جائے گا جو رستانہ کے ساتھ گرفتار کیے گئے تھے۔ راج کرشنا اس بات پر بہت خوش تھا کہ گزشتہ دو دنوں کے اندر شہر کے جرائم میں حیرت انگیز کمی واقع ہوگئی ہے۔

دوسرے دن جولین کتابوں سے لدی پھندی آئی۔ سب ابتدائی کتابیں تھیں۔ وہ اُس نے میرے سامنے رکھ دیں پھر ایک ایک حرف بہت انہماک سے مجھے شناخت کراتی رہی۔ حرفوں سے لفظ بنانا، لفظوں کے معنی، سی اے ٹی کیٹ، کیٹ معنی بلی، آر اے ٹی ریٹ، ریٹ معنی چوہا۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ ایک مرتبہ جی میں آئی کہ اُسے پوری کتاب سُنا کے مطمئن کر دوں تاکہ وہ آرام سے اپنے گھر چلی جائے اور روز روز آنے کی تکلیف سے بچ جائے مگر میں یہ نہ کر سکا۔ سبق پڑھانے کے بعد وہ باتیں کرنے لگی۔ اُس کی باتوں کا انداز بہت دل کش تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اُس کی پلکیں تھرکتی رہتی تھیں اور پتلیاں تیزی سے حرکت کرتی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے دفعتہً وہ پوچھنے لگی "آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ خوابیدہ لہجے میں کہنے لگی "اچھا ہوا کہ آپ نے ہاں کہہ دیا ورنہ میں بہت اداس ہوتی۔ جسے موسیقی کی تمیز نہ ہو، وہ مجھے ادھورا آدمی لگتا ہے۔ میں سوچتی ہوں، سنگیت نہ ہوتا تو دنیا کیسی ہوتی۔"

"آپ گانا جانتی ہیں؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔
"ہاں تھوڑا بہت آتا ہے اور آپ کو؟"
"مجھے بالکل نہیں آتا لیکن مجھے بہت اچھا لگتا ہے، میرا ایک دوست تھا شوبی۔ وہ ستار خوب بجاتا تھا اور بھی لوگ تھے۔ میں تو ستار سنتا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ خود گانے کی بہ نسبت گانا سننا اور لطف اٹھانا زیادہ سچی بات ہے۔"
"وہ کیسے؟" وہ تجسس سے بولی۔
"وہ ایسے کہ بنیادی طور پر گانا گانے اور سننے والے دونوں میں موسیقی کا جذبہ ہوتا ہے مگر گانا گانے والا آدمی کسی نہ کسی قدر پابند ہو جاتا ہے جب کہ سننے والا اس پابندی سے آزاد ہوتا ہے۔ گانے والے کو ریاضت کرنی پڑتی ہے اور گانے کے آداب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ کون زیادہ سچا ہو سکتا ہے؟ کان گانے کے آداب سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور وہی سننا چاہتے ہیں جس میں رس ہو۔ گانے والا رس پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور جہاں کوشش اور ارادہ شامل ہو جائے، وہاں۔۔۔" میں فوراً سنبھل کے چپ ہو گیا۔ جولین مجھے تک رہی تھی۔
"کہیے نا۔ بات پوری کیجیے۔" وہ بے چینی سے بولی۔
"بات ختم ہو گئی۔ مجھے خیال آ گیا میں اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا ہوں۔"
"آپ نے بڑی عجیب بات کہی۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولی۔ "کرشنا جی آپ کے بارے میں سچ کہتے تھے۔"
"وہ کیا کہتے تھے؟" میں نے گھبرا کے پوچھا۔
"وہ کہتے تھے کہ ظہیر تمہارے لیے ایک دل چسپ شاگرد ثابت ہو گا۔ تم ایک تجربہ کرو گی۔ وہ اپنے دل میں آپ کے لیے بہت ارمان رکھتے ہیں اور آپ کو ہر لحاظ سے ایک مکمل نوجوان دیکھنا چاہتے ہیں۔"
جولین اس دن زیادہ دیر تک ٹھہری رہی۔ چمپا نے اس کی بڑی خاطر کی۔ وہ دونوں بنگلے کے مختصر لان میں بیٹھی ہوئی باتیں کرتی رہیں۔ جولین ابھی گئی نہیں تھی کہ راج کرشنا آ گیا۔ اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ جولین کو اس کے گھر پہنچا آئے۔ جب وہ کپڑے بدل کے اور چائے پی کے اطمینان سے بیٹھا تو میں نے ہمت کر کے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" وہ اچھل سا پڑا اور ایک دم سنجیدہ ہو کے بولا۔ "کہو؟"
"میں مس جولین کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"
میں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ اس نے سر ہلایا تو مجھے کچھ اور کہنے کا حوصلہ ہوا۔ "آپ پیسے کیوں ضائع کر رہے ہیں؟"
"کیا مطلب؟" وہ ترشی سے بولا۔
"مطلب یہ کہ" میں نے تیزی سے کہا۔ "میرا دل پڑھنے میں نہیں لگتا۔ ان کا وقت خراب ہو گا اور آپ کا پیسہ۔ آپ انھیں منع کر دیجیے۔ جب میرا جی چاہے گا، میں آپ سے خود کہہ دوں گا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "پڑھنے میں کس کا جی لگتا ہے۔ جی لگانے کی تو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ کوشش کرو۔ مس جولین تو باتیں بھی بہت مفید کرتی ہے۔ پڑھا کم کرو، سُنا زیادہ کرو اور پیسے ویسے کا خوف چھوڑ دو۔ آئندہ ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔"
"مگر سب بے سود ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔
"تعلیم کبھی بے سود نہیں ہوتی۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "میری خاطر سہی مگر تم تھوڑی دیر کے لیے یہ جبر ضرور کر لیا کرو۔ مس جولین بہت اچھی لڑکی ہے۔"
"یہ میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ بری ہیں۔"
"دیکھو ظہیر! تمھیں ان سے پڑھنا ہے۔ یہ میرا حکم ہے، بس میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا۔" اس نے تند و تیز لہجے میں کہا۔
مس جولین تیسرے دن بھی آئی، چوتھے دن بھی، پانچویں دن بھی اور کتابوں میں کم باتوں میں زیادہ وقت صرف کرتی رہی۔ اس نے طرح طرح کی باتیں کیں۔ اس کا لہجہ شیریں اور انداز نفیس تھا۔ روز نیا لباس بدل کے آتی تھی، صاف ستھرا، گو وہ بہت بھڑکیلا اور شوخ نہیں ہوتا تھا، اس کی باتوں کی طرح نکھرا ہوا، صاف اور اُجلا ہوتا تھا۔ میں نے راج کرشنا کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ جس وقت وہ آتی، میں کمرے میں چلا جاتا اور کتابیں کھول کے بیٹھ جاتا، اسے کل کا سبق سناتا، کاپی دکھاتا۔ وہ اس پر گڈ لکھتی، شاباش دیتی اور نیا سبق پڑھاتی۔ یہ تماشا کرتے ہوئے مجھ پر جب اداسی غالب آ جاتی تو وہ باتیں کرنے لگتی۔ میرے کان اس کی باتوں کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ میری زبان سے کوئی جملہ نکل جاتا تو وہ اسی جملے کے موضوع پر گفتگو کرنے لگتی۔ چھٹے دن وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "مس! کیا بات ہے؟ آج آپ کچھ فکرمند نظر آتی ہیں؟"
کچھ تذبذب کے بعد وہ بولی۔ "ہاں ظہیر! میرے باپ بہت بیمار ہیں۔"
"کیا ہو گیا انھیں؟" میں نے افسردگی سے پوچھا۔
"انھیں دق ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔
"دق ہے؟ سنا ہے یہ تو بہت برا مرض ہوتا ہے؟"
"ہاں! بہت برا ہوتا ہے اور وہ اپنی بیماری کے آخری درجے میں ہیں، ان کا سینہ کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اب وہ زندہ نہیں رہیں گے۔"
"کیوں نہیں رہیں گے۔ آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ ان کا علاج نہیں ہو رہا ہے کیا؟ اور آپ انھیں بیماری میں چھوڑ کے یہاں کیوں آ گئیں؟ آپ کو ان کی تیمارداری کرنی چاہیے تھی۔"
"میں ان کی تیمارداری اور علاج کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ شاید ایسی کوئی دوا ہی نہیں بنی جو میرے ڈیڈی کو شفا دے سکے۔" اس کی آواز پھٹنے لگی۔
"یہ تو آپ نے بہت بری خبر سنائی۔ آپ کہتی تھیں کہ آپ اپنے

ماں باپ کی اکلوتی لڑکی ہیں' آپ کو تو اُن کے پاس رہنا چاہیے۔ کل سے آپ نہ آیئے گا اور میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ میں کرشنا جی سے کہوں گا' وہ کسی بہت بڑے ڈاکٹر کو جانتے ہوں گے۔"

اُس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لرزنے لگے۔ "کرشنا جی سے کچھ مت کہیے گا۔ میں ہر بڑے ڈاکٹر کو دکھا چکی ہوں اور یہاں آنے میں کُل دو ڈھائی گھنٹے ہی تو لگتے ہیں' اس طرح کچھ دیر کے لیے مجھے اُس ماحول سے دُور ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ اچھا اب آپ اپنا کام کیجیے۔" اُس نے اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا۔ "آپ نے کتنا یاد کیا؟" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

میں نے کتاب بند کر دی۔ "نہیں مِس! اب پڑھائی نہیں ہوگی۔ اب آپ جا کے اپنے باپ کو دیکھیے۔ ممکن ہے' وہ آپ کو پکار رہے ہوں۔"

"میں اسی لیے آپ سے نہیں کہہ رہی تھی۔ نہیں' میں اپنا وقت پورا کر کے جاؤں گی۔ وہ ٹھیک ہی ہوں گے۔ چلیے آپ شروع کیجیے۔"

وہ نہیں مانی' میں نے اُس دن جلدی جلدی سبق پڑھ لیا اور اُس کی کسی بات پر بحث نہیں کی لیکن اُس نے اُسی وقت اُٹھنے کا ارادہ کیا جب شام ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ "مِس! آپ کے ساتھ میں بھی آپ کے ڈیڈی کو دیکھنے چلتا ہوں۔"

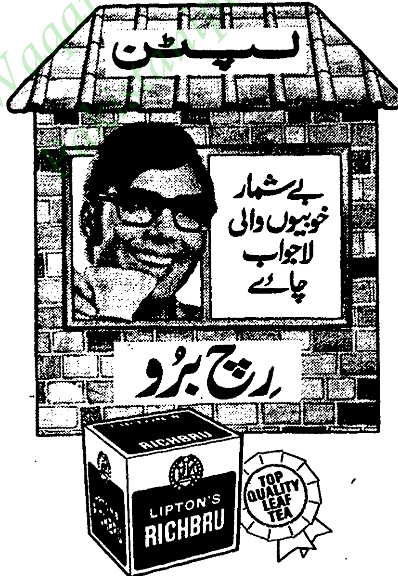
"نہیں' وہاں آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم بھی بہت احتیاط کرتے ہیں' وہ دق کے مریض ہیں۔" میں نے بہت اصرار کیا تو وہ کسی اور دن ساتھ لے چلنے کا کہہ کے چلی گئی۔

رات کو راج کرشنا مجھے کلب لے گیا۔ وہاں بہت سے لوگ ہمارے اِردگرد اکٹھے ہو گئے۔ اُن دنوں اخبارات میں روز بائی کلّا کے علاقے میں پڑنے والے چھاپوں کے متعلق کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا تھا اور ہر خبر کے ساتھ راج کرشنا کا نام بھی آتا تھا۔ میں بھی روز بہت توجہ سے اخبار دیکھتا تھا کیونکہ گھر کرنے والے فونوں پر راج کرشنا کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بمبئی پولیس کے پُرانے افسر اُس سے خوش نہیں ہیں' وہ تو اخبارات نے حکومت پر زور ڈالا کہ مجرموں کے ساتھ کوئی رعایت کی گئی تو لوگ پولیس کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ معلوم نہیں' اخبار والوں کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ چند با اثر لوگ راج کرشنا کو نرمی اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہیں' بمبئی کے ایک رئیس گوپال دتّا نے حوالات میں خودکُشی کر لی تھی اور باقی معزز لوگ جیل بھیج دیے گئے تھے۔

اُس رات کلب میں ہر شخص راج کرشنا کے قریب بیٹھنے اور اُس کی زبانی کوئی نہ کوئی بات سننے کی فکر میں تھا۔ نورین بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ تھوڑی دیر بعد آ گئی اور مجھے دیکھ کے تقریباً بھاگتی ہوئی سیدھی میرے پاس آئی۔ اُس نے نیلی اسکرٹ پہن رکھی تھی۔ "ارے آپ؟ آج آپ کیسے آ گئے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"جیسے آپ آ گئیں۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

"ہم تو روز آتے ہیں' میں روزانہ سوچتی تھی کہ شاید آپ آج آ جائیں'



آج آجائیں۔ سب سے مجھے آپ سے شکایت ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔ "آپ نے ہم لوگوں کو اپنے گھر نہیں آنے دیا۔"

"کرشنا جی کہہ رہے تھے کہ وہ کسی دن آپ کو بلائیں گے۔"

"دیکھیے، وہ دن کب آتا ہے، اچھا یہ بتائیے۔ ابھی آپ نے اپنے گھر جانے کا پروگرام تو نہیں بنایا؟" وہ میز پر جھکتی ہوئی بولی۔

"ابھی تو ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے، ہمارا جہاز آنے ہی والا ہے اب کے ہم نے سوچا ہے کہ بہت سے لوگوں کے ساتھ بہت دور سمندر میں نکل جائیں گے اور کئی دن بعد واپس آئیں گے۔ آپ ہوں گے تو اور مزہ رہے گا۔ جہاز بھی ایک طرح کا کلب بن جائے گا۔ ہم عرشے پر بیٹھ کے خوب باتیں کریں گے۔ اتنا بڑا وقت پڑا ہوگا۔ چلیں گے نا؟"

"جی مگر کرشنا جی۔۔۔۔"

"کرشنا جی کیسے نہیں جائیں گے، اُن کے ہاتھوں میں ہم ہتھکڑی ڈال کے لے جائیں گے۔ وہ دوسروں کو بہت ہتھکڑیاں لگاتے ہیں۔ وہ بھلا اتنی اچھی سیر نہیں کریں گے، اتنا کام کرنے کے بعد انہیں کچھ آرام ملنا چاہیے۔"

ہم جب تک کلب میں موجود رہے، وہ میرے ہی پاس بیٹھی رہی اور مجھے مس جولین کا خیال آتا رہا۔ کاش اُس کا باپ ٹھیک ہو۔ راج کرشنا لوگوں کے درمیان گھرا رہا۔ پھر جب ناچ شروع ہوا تو وہ مسز روپ پٹیل کے ساتھ ناچنے لگا اور نورین ناچ کی دھن پر اپنے پاؤں تھرکاتی رہی اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں بھی اُس کے ساتھ راج کرشنا اور دوسرے لوگوں کی طرح ناچوں۔ میں نے صاف کہہ دیا: "مجھے ناچ نہیں آتا۔"

"میں آپ کو ناچ سکھاؤں گی۔" وہ مچلتی ہوئی بولی۔ "دیکھ لیجیے پھر آپ کو ایک عجیب لطف آئے گا۔ آپ بے خود ہو جائیں گے جیسے آپ نے کوئی نشیلی چیز پی لی ہو۔"

نورین اور میں تنہا ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں کئی لڑکیاں اور عورتیں بھی آ کے وہاں بیٹھ گئیں۔ مجھے حبس محسوس ہونے لگا۔ میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر نورین نے میز کے نیچے میرے گھٹنے پر ٹھوکا مارا اور اپنا پیر میرے پیر پر رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُن کے آنے کے بعد اس طرح اچانک اُٹھنا بدتہذیبی ہے۔ اُن سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں اور وہ سب مسکرا رہی تھیں۔ مجھے ان کی مسکراہٹ زہر لگی۔ اسی اثنا میں ناچ ختم ہو گیا اور راج کرشنا مسز روپ پٹیل کے ساتھ ہماری میز پر آ گیا۔ سب کھڑے ہو گئے اور اس افراتفری میں مجھے راج کرشنا کے قریب پہنچنے کا موقع مل گیا۔ پھر میں، نورین، راج کرشنا اور مسز روپ چاروں ایک دوسری میز پر بیٹھ گئے۔ مسز روپ کے گلے میں وہی ہار لٹک رہا تھا۔ کورا کی امانت جس کا آنجہانی نے خیال نہیں کیا۔ میری نظریں اُس کے گلے سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس دوران میں نورین نے جو باتیں کیں وہ میں نے نہیں سنیں۔ میں اس فکر میں تھا کہ مسز روپ پٹیل کے گلے سے یہ ہار کس طرح چھینوں۔ کہ اسی وقت راج کرشنا میرے کان میں چپکے سے بولا: "چلیں؟"

"ہاں چلیں۔" میں نے دفعتہً اُٹھتے ہوئے کہا۔

سب ہمیں روکتے رہے۔ نورین پہلے کی طرح کلب کی عمارت کے خاص دروازے تک ہمیں پہنچانے آئی۔ اس بار اُس کے ساتھ کلب کے بہت سے مرد تھے اور عورتیں بھی۔ راج کرشنا نے باری باری سب سے معانقہ کیا اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ سب واپس ہو گئے مگر نورین واپس نہیں گئی۔ وہ ہمارے ساتھ دروازے سے باہر آگئی اور اُس نے اس وقت تک راج کرشنا کو آگے نہیں بڑھنے دیا جب تک اپنے گھر آنے کا وعدہ نہ لے لیا۔

عمارت سے باہر نکل کے ہم کلب کے وسیع سبزہ زار میں آگئے۔ دور لان اور درختوں کے پرلی طرف پختہ فرش پر گاڑیاں کھڑی تھیں جسے کلب سے جانا ہوتا، وہ دربان کے ذریعے موٹر پورٹیکو میں طلب کر لیتا۔ ہم نے دربان کو یہ زحمت نہیں دی کیونکہ ہمارے ساتھ ڈرائیور ہی نہیں تھا۔ باہر آکے میں نے گہری گہری سانسیں لیں۔ سبزے پر چاندنی سو رہی تھی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اونچے اور گھنے درختوں کے نیچے کہیں کہیں گہرا اندھیرا تھا۔ ہوا نرم اور ٹھنڈی تھی۔ سوئمنگ پول کا پانی دور سے چمک رہا تھا۔ اتنا اچھا موسم اور منظر چھوڑ کے یہ لوگ عمارت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا، میں یہیں سبزے پر لیٹ جاؤں۔ ہم آہستہ قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی ہم درمیان ہی میں تھے اور ایک درخت کے سائے میں گزر رہے تھے کہ مجھے کچھ آہٹ ہوئی، میں نے چونک کے اِدھر اُدھر نظر ڈالی مگر چونکنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ ایک سایہ بجلی کی طرح درخت کی اوٹ سے نکلا اور راج کرشنا پر جھپٹا۔ میں نے اچانک راج کرشنا کو زور سے دھکا دے دیا۔ وہ شخص جھونک میں کچھ آگے بڑھا مگر ایک لمحے میں پلٹ کے مجھ پر لپکا۔ میں اچھل کے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور کسی نو مشق کی طرح اِدھر اُدھر تھرکنا شروع کر دیا۔ اُس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر مجھ پر حملہ کر دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو چاقو اُس کے شانے اور سینے پر کئی انچ کی لکیر کھینچتا ہوا گزر جاتا مگر اُس کا ہاتھ جیسے ہی اُٹھا، میں نے پھرتی سے بائیں جانب سمٹ کے اُسے اپنے پنجے کے قبضے میں لے لیا۔ یہ لمحہ ایسا ہی تھا کہ وہ مجھے چاقو بازی سے نابلد کوئی شخص سمجھے اور سیدھا براہِ راست وار کرے۔ میرا تاثر کامیاب رہا۔ اُس نے کسی تردد کے بغیر پوری توقع سے حملہ کیا، اُدھر اُسے راج کرشنا کے اُٹھ جانے اور شور مچانے کا خطرہ ہوگا، اِدھر وہ میری غیر متوقع مزاحمت سے بوکھلا گیا ہوگا۔ جو کچھ اُسے کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ اس کے نتیجے میں اُس کی کلائی میرے پنجے کی گرفت میں تھی اور وہ اسے آزاد کرانے کے لیے پوری جدوجہد

کر رہا تھا۔ اُس نے کئی پینترے بدلے میں نے اپنا دوسرا ہاتھ آزاد کر رکھا تھا اور اُس کے پیٹ پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے میرے چہرے پر مکے مار کے میرا ارتکاز ختم کرنے اور مجھے بدحواس کرنے کی فکر میں تھا تین چار مکے اُس نے میرے چہرے پر لگا ہی دیئے۔ شاید میری بھوں پھٹ گئی مگر میں نے اُس کا پیٹ اُدھیڑ ڈالنے کی کوشش جاری رکھی۔ اُس نے اپنا جسم کسی قدر پیچھے کر لیا تھا چنانچہ میری ضربیں پھسلتی ہوئی پڑ رہی تھیں۔

اِدھر میں نے راج کرشنا کو اُٹھ کے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا، میں نے چیخ کر اُسے دُور رہنے کی ہدایت کی۔ اب میری توجہ چاقو والے ہاتھ پر زیادہ نہیں تھی کیونکہ وہ پوری طرح میرے پنجے کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ حملہ آور خاصا پھرتیلا شخص تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ایک بار ہاتھ میں آئی ہوئی کلائی چھوٹ جائے تو حملہ آور کا غضب سوا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نئے عزم سے حملہ کرتا ہے۔ راج کرشنا نے میری ہدایت پر عمل کیا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے اُس کے پیٹ پر ضربیں لگانے کے بجائے اُس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اُسے چھڑانے کے لیے کچھ آگے بڑھا، میرا گھٹنا پہلے ہی اُٹھا ہوا تھا لیکن اُسے جلانے کا موقع نہیں ملا۔ اُس نے اچانک اپنے چاقو والے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور چاقو اس طرح چھوڑا کہ وہ دُور جا کے گرے۔ میں نے اپنا ارادہ ترک کر کے اُس کے دونوں ہاتھ آزاد کر دیئے۔ اُس نے چاقو کی طرف جست لگانے کا ارادہ کیا مگر وہ مجھے دھوکا دے رہا تھا، وہ پینترا بدل کے ایک طرف بھاگ پڑا۔ میں نے اُس کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی۔ وہ آناً فاناً کلب کی باؤنڈری پھلانگ گیا، میں بھی باؤنڈری پکڑ کے اُسے عبور کرنے کے لیے جست لگانے والا ہی تھا کہ راج کرشنا کی چیختی ہوئی آواز نے میری ہمت پست کر دی۔

اُس نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے مجھے پکڑ لیا اور میرے گلے میں جھول گیا۔ اُس کی چیخ پکار پہ دربان اور گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ لان میں اِدھر اُدھر منتشر ہوئے اور ہم تک پہنچ گئے۔ راج کرشنا اپنے رومال سے میری بھوں صاف کر رہا تھا۔ خون نے پورا چہرہ بھگو دیا تھا۔ "ڈاکٹر ملہوترا اندر ہیں صاحب!" ایک دربان نے مشورہ دیا۔

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔ "چلیے! ایک ذرا بھوں پھٹ گئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ انھیں یہاں سے دُور کیجیے۔"

راج کرشنا نے ڈرائیوروں اور دربانوں کو اپنی اپنی جگہ واپس ہونے کا حکم دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا گاڑی تک لانے لگا۔ میں راستے میں حملہ آور کا چاقو اٹھانا نہیں بھولا۔ میں نے کرشنا کا رومال بھوں پر رکھ کے خون روک لیا تھا۔ راج کرشنا کی بھی خواہش نہیں تھی کہ کلب کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں تک بات پہنچے۔ اُس نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی تیز رفتاری سے بھگاتا ہوا گھر لے آیا۔ چمپا نے میرے چہرے پر جما ہوا خون صاف کیا۔ زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی۔

ایسے نشانات تو عام ہوتے ہیں مگر چمپا اور راج کرشنا اس طرح برتاؤ کر رہے تھے جیسے میری جان نکل گئی ہو۔ میں نے کوئی دوا نہیں لگائی۔ خون راستے ہی میں رُک گیا تھا۔

وہ میرے پہلو میں بیٹھا مجھے حیرت سے گھور رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ مجھے خوشی تھی کہ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچی۔ اگر ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو اس وقت نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ بھاگ گیا۔ اگر راج کرشنا میرے پیر نہ جکڑتا تو میں اُسے ضرور ڈھونڈ لیتا۔ اُس نے بروقت فیصلہ کر لیا تاکہ کہیں بھاگنے کا وقت بھی نہ نکل جائے۔ اس پورے معاملے میں صرف چند منٹ صرف ہوئے ہوں گے، شاید تین چار منٹ۔ وہ ذرا سی ہٹ کر لیتا تو جن لوگوں نے اُسے بھیجا تھا، انھیں نصیحت ہو جاتی۔ "مجھے اس کا پہلے سے خطرہ تھا۔" راج کرشنا نے تلخی سے کہا۔ "لیکن یہ تو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کلب میں آدمی بھیج دیں گے۔"

رِم جھم

گجرات سے ظفر ذی شان بٹ کی خوشہ چینی

- دل ایک ہاتھی کے مانند ہے، اِسے آنکس لگا لگا کر قابو میں رکھنا چاہیے۔ ——— بھگت کبیر
- خاموشی دل کا سکون ہے اور روح کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو جسم کے لیے نیند۔ ——— ڈبلیو پینے
- سب سے قابلِ قدر ساتھی کتاب ہے لیکن وہ کتاب جو خوب غور سے منتخب کی جائے۔ ایسی کتاب آدمی کی بہترین دوست اور صلاح کار ہوتی ہے۔ ——— سر ڈگلڈ زھیرلنڈ
- شاید تیر ہوا سے گزرتا ہوا اپنا نشان نہ چھوڑتا ہو مگر ایک بُرا خیال اپنا نشان اس طرح چھوڑتا ہے جیسے سانپ اپنی لکیر۔ ——— چارلس میکلے
- خوشی وہی انسان حاصل کر سکتا ہے جو اپنی خواہشات قابو میں رکھے۔ ——— مہاتما بدھ
- جو قوم بھی لالچ میں پڑی، وہ ذلت کے گڑھے میں جا گری۔ ——— جلال الدین رومی
- بڑا آدمی وہ ہے جو اپنا مٹی کا پیالہ بلوریں جام سمجھتا ہے اور بلوریں جام کو مٹی کے پیالے سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ ——— ایل۔ اے۔ سینیکا
- اہلِ دانش کو خوشی کے لیے معمولی چیزیں بھی کافی ہوتی ہیں مگر بے عقلوں کو کسی بھی چیز سے طمانیت حاصل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے زیادہ تر لوگ دُکھی رہتے ہیں۔ ——— ڈاکٹر ڈی لا اوچے فوکالڈ
- جو لوگ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے ہیں، انھیں بہت کم کبیدہ خاطر پایا جاتا ہے۔ ——— ایل۔ ای۔ لینڈن
- بدقسمتی جاہلوں کے حصے میں آتی ہے۔ ——— جے ایڈیسن
- جس نے قرض لیا، وہ ہمیشہ رنج میں مبتلا ہوا۔ ——— بنجمن فرینکلن
- سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے انسانوں کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ ——— سر ولیم جونز

کیا یہاں کسی نے فون کر کے پوچھا تھا کہ میں کہاں گیا ہوں؟" اُس نے چمپا سے پوچھا۔

"ہاں آپ کے جانے کے بعد کئی فون آئے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ کلب گئے ہیں، دیر سے واپس آئیں گے۔" چمپا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب آئندہ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے راج کرشنا کو مشورہ دیا۔ "وہ آپ کو اس شہر میں دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"لیکن ظہیر! میں خود نہیں جاؤں گا۔ مجھے موت کا خوف نہیں ہے۔" اُس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "میں نے پستول نکال لیا تھا ظہیر! لیکن اندیشہ تھا کہ نشانہ چوک نہ جائے۔ بہرحال تم نے حیرت انگیز پھرتی کا ثبوت دیا — یہ دوسری بار ہے جب تم نے ایک ماں کو اُس کا بیٹا واپس کر کے اُس کی زندگی کا عرصہ بڑھا دیا ہے۔ تم نے دو جانیں بچائی ہیں۔"

"آپ اس بارے میں کچھ نہ کہیے۔" میں نے شکایت کی۔

"کیسے نہ کہوں کہ میں جو اس وقت تم سے بات کر رہا ہوں، یہ ایک عجوبہ ہے۔" وہ منتشر لہجے میں بولا۔ "تم کلب میں کتنے بور تھے مگر جیسے ہی وقت آیا، تمھارے اندر گویا بجلی بھر گئی۔ تم نے ایک لمحے کی بھی چوک نہیں کی۔" اُس نے زور سے مجھے بھینچ لیا۔

"بس یہی تو سیکھا ہے۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

چمپا اور وہ آدھی رات تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ چمپا بار بار چائے بنا بنا کے لاتی رہی اور بار بار میری بھوں ٹٹولتی رہی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ فون آنے لگے۔ کلب کے دربانوں اور ڈرائیوروں نے لوگوں کو بتا دیا ہوگا کہ راج کرشنا صاحب لان میں بھاگ رہے تھے اور اُن کا ساتھی خون آلود چہرے کے ساتھ باؤنڈری کے پاس کھڑا تھا۔ نورین کا فون بھی آیا۔ راج کرشنا نے ریسیو کیا۔ نورین نے تشویش سے میری خیریت دریافت کی۔ راج کرشنا نے اُسے اطمینان دلایا مگر نورین نے راج کرشنا کی بات پر یقین نہیں کیا۔ مجھے خود فون پر بلایا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس کا یہ ثبوت کافی ہے کہ میں اُس سے بات کر رہا ہوں۔ راج کرشنا فون کا تار بھی نہیں نکال سکتا تھا کیونکہ وہ ایک پولیس افسر کے گھر کا فون تھا۔ کسی وقت بھی کوئی اہم فون آسکتا تھا۔

یہ سلسلہ صبح ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ جواب دیتے دیتے، وضاحت کرتے کرتے اوسان بولا گئے تھے۔ پھر صبح ہی صبح نورین اپنے باپ کے ساتھ بنگلے پر موجود تھی۔ "کیا ہوا تھا؟" اُس نے آتے ہی اضطراب سے پوچھا۔ میں نے اُسے سرسری طور پر پورا واقعہ سنایا۔ "تو گویا یہ کلب بھی اب محفوظ جگہ نہیں رہی۔" وہ تشویش سے بولی۔ "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" اُس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔

نورین دیر تک ٹھیری رہنا چاہتی تھی مگر پولیس افسروں اور کلب کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اس لیے وہ جلد ہی واپس چلی گئی۔ اُس دن کرشنا دفتر نہیں جا سکا۔ میں نورین کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ یہ راج کرشنا ہی کی ہمت تھی کہ وہ اتنے لوگوں کو جواب دے رہا تھا، کبھی فون پر کبھی بالمشافہ۔ اُسے دوپہر کا کھانا کھانے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ ڈرائنگ روم سہ پہر تک پولیس کے اور دوسرے محکموں کے افسروں اور ممبئی کے شہریوں سے بھرا رہا۔ بنگلے کے باہر موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ پولیس کے اعلا حکام کے حکم سے بنگلے پر پہرے داروں کی تعداد میں فوراً اضافہ کر دیا گیا تھا۔ کل رات اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ راج کرشنا درمیان میں کود پڑے گا تو مجھے چیخنا نہ پڑتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ راج کرشنا کو باؤنڈری عبور کرنے سے روکنے کے لیے مجھے آوازیں لگانی پڑی تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو چند منٹ کی بات تھی، کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔



سہ پہر کو مجھے جولین کا انتظار ہی رہا۔ وہ وقت کی بڑی پابند تھی مگر وقت گزر رہا تھا اور جولین نہیں آئی تھی۔ یقیناً اُس کے باپ کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہوگی۔ میرے دل میں ہزار وسوسے اُٹھنے لگے۔ میں نے بنگلے کے باہر گلی میں جا کے بھی دیکھا۔ اُس کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور وہ نہیں آئی۔ مجھ سے ایک جگہ نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ جب اُس کے آنے کی اُمید بالکل ختم ہو گئی تو میں نے راج کرشنا سے پوچھا کہ اُسے کہیں جانا تو نہیں ہے؟ اُس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا، میں کچھ دیر کے لیے موٹر لیے جا رہا ہوں۔ وہ بگڑنے لگا کہ تم پوچھ کیوں رہے ہو؟

ڈرائیور کو جولین کے گھر کا پتہ معلوم تھا۔ میں نے اُسے ساتھ لیا۔ موٹر شہر کی وسیع سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک گنجان اور تنگ و تاریک علاقے میں داخل ہو گئی۔ یعنی جولین اس قدر دُور سے روز مجھے پڑھانے آتی تھی۔ ڈرائیور نے کار ایک نسبتاً کشادہ جگہ کھڑی کر دی اور مجھے ساتھ لیے ہوئے تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ دونوں اطراف چھوٹی بڑی بلڈنگیں کھڑی ہوئی تھیں۔ کائی لگی اور سر پر گرتی ہوئی عمارتیں، یہ آبادی اینگلو انڈین لوگوں پر مشتمل تھی۔ نچلی منزلوں کے کمروں میں سامان کم تھا، صفائی زیادہ نظر آتی تھی۔ اسکرٹ پہنے ہوئے بوڑھی رنگ برنگی عورتیں ہاتھوں میں کنڈیاں لٹکائے گلی میں متحرک تھیں۔ فلیٹوں کے باہر بوڑھے کرسی بچھائے اخبار بینی میں مصروف تھے۔ گلی میں زرد روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ میں نے حیرانی کے ساتھ ڈرائیور سے پوچھا کہ کہیں وہ پتہ تو نہیں بھول گیا؟ اُس نے انکار میں سر ہلایا اور بڑی گلی سے دائیں جانب کی ایک اور تنگ گلی میں مُڑ گیا۔ ہمارے سامنے لکڑی کی بالکونیوں سے بنی ہوئی ایک تین منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے وہیں رُک کے ایک فلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا مس جولین یہیں رہتی ہیں؟" میں نے مشتبہ انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں! وہ تیسرے مالے کے کونے والے فلیٹ میں رہتی ہیں۔"

مجھے عمارت میں قدم رکھتے ہوئے جھجک ہوئی۔ میں کئی لمحوں تک کش مکش میں گھرا رہا پھر ایک ارادے سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ڈرائیور گلی میں رہ گیا۔ سب سے اُوپر والی منزل پر پہنچ کے میں نے اندازے کے مطابق دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ جولین ہی نے کھولا۔ "آپ؟" اُس کی پُتلیاں لرز کے ساکت ہوگئیں اور وہ پتھر کی سی بن گئی۔

"آپ کے ڈیڈی کیسے ہیں؟" میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اُس نے ایک گہری سانس لی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ہونٹ بدبدانے لگے "وہ پہلے سے بہتر ہیں لیکن انھیں اپنی سدھ بدھ نہیں ہے۔" اُس نے نقاہت سے کہا۔

"میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر... مگر آپ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔"

"میں پروا نہیں کرتا۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔

اُس نے سراسیمہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "ٹھیریے۔" یہ کہہ کے اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی۔ "آئیے۔" اُس نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ مجھے ایک مختصر کمرے میں لے گئی۔ وہاں چارپائی پر ایک بوڑھا شخص منہ کھولے پڑا تھا۔ اُس کے جسم کا گوشت سوکھ گیا تھا، بس ہڈیوں کا پنجر تھا جس میں سانس باقی تھی۔ کمرے میں دواؤں کی بُو بسی ہوئی تھی اور میز پر کئی شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمرہ صاف ستھرا اور روشن تھا مگر جا بجا پرانی چیزوں سے پٹا ہوا تھا۔ پرانی میزیں، کرسیاں، الماریاں، در و دیوار پر عجب اُداسی طاری تھی۔ میں فوراً کھڑا ہو گیا۔ جولین مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اس بڑے کمرے میں بستر بھی تھا، کرسیاں بھی تھیں۔ ایک کونے میں چھوٹی سی گول ڈائننگ ٹیبل تھی۔ ایک کونے میں موٹی موٹی کتابوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ ایک طرف صندوق کے اوپر صندوق رکھے ہوئے تھے۔ فرش صاف تھا اور دیوار پر شیشے کے فریموں میں مختلف مناظر کی رنگین تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک جانب ستار رکھا ہوا تھا، درمیان میں دیوار پر لکڑی کی ایک بڑی صلیب نصب تھی۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جولین بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں آ کے غلطی کی ہے لیکن اب فوراً واپسی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ "کرشنا جی اور چمپا دیدی کے کیا حال ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں اور آپ کی ممی کدھر ہیں؟"

"وہ ابھی آتی ہیں۔" جولین نے آہستہ سے جواب دیا۔ "یہ گھر بہت مختصر ہے۔ جب ڈیڈی بیمار ہوئے تو ہم یہاں آ گئے۔ پہلے ہم باندرے میں رہتے تھے۔ یہاں ڈیڈی کے کئی پرانے دوست ہیں، آتے رہتے ہیں، اس طرح ان کی طبیعت بہلی رہتی ہے۔"

"گھر مختصر ہے مگر آپ نے اسے بڑے سلیقے سے سجا رکھا ہے۔ ہر جگہ آپ ہی آپ نظر آتی ہیں۔ آج آپ نہیں آسکی تھیں اس لیے مجھے الجھن ہونے

لگی اور میں یہاں چلا آیا۔"

"مجھے فون کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس گھر میں کسی کو بلاتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" وہ کمزور آواز میں بولی۔ "ڈیڈی کی بیماری سے سب کچھ تلپٹ ہو گیا ہے۔"

"میں تو آپ کے ڈیڈی کو دیکھنے اور آپ سے ملنے آیا ہوں گھر دیکھنے نہیں آیا۔ گھر تو مکینوں سے ہوتے ہیں۔"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ ایک اُجلی زرد ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں بوجھل تھیں۔ صرف ایک دن میں وہ کچھ اور لمبی ہو گئی تھی۔ میں نے پہلی بار اُسے اس شکل میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ میری نظریں بار بار اُس کی جانب اُٹھتی تھیں اور گھبرا کے جھک جاتی تھیں۔ "آپ گھبرائیے نہیں۔" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

"حوصلہ رکھیے۔" مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔ "میں... میرے لائق کوئی کام ہو تو بتائیے۔ دوائی وغیرہ لانی ہو یا ڈاکٹر کے پاس جانا ہو تو بتائیے اور میرے جسم میں بہت خون ہے اگر خون کی ضرورت پڑے تو میں... میں۔"

وہ سسک پڑی۔ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی اب میں اس سے کیا کہوں؟ اسے کس طرح چپ کراؤں؟ "میں آپ کے بہت کام آسکتا ہوں مس! مجھے دُنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ اگر آپ نے مجھے کوئی کام سونپا تو میرا جی خوش ہو گا۔"

وہ اور سسکنے لگی۔ "نہیں۔" اُس نے وحشت سے کہا۔ "آپ کا یہی احسان بہت ہے کہ آپ میرے ڈیڈی کو دیکھنے آگئے۔ بس اُن کے لیے دعا کیجیے۔"

"میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں مس!" میں نے مایوسی سے کہا۔ "میں آپ کے ڈیڈی کے لیے کوئی دعا نہیں کروں گا۔"

وہ سَر اُٹھا کے مجھے لرزتی ہوئی پلکوں سے دیکھنے لگی۔ "آپ چلے جائیے آپ چلے جائیے۔ یہ گھر آفت زدہ ہے، یہاں کی ہوا خراب ہے، یہ گھر بہت خراب ہے اور آپ کے لیے نہیں ہے، آپ چلے جائیے۔"

"میرے لیے۔" میری آواز بھاری ہو گئی۔ "یہاں آپ اور آپ کی ممی بھی تو رہتی ہیں۔ پڑوس کے فلیٹ میں بھی لوگ رہتے ہیں اور آپ کو کیا معلوم کہ میں کس گھر میں رہتا تھا۔" میں نے سوچا، میں اُسے جیل کا حال بتا دوں۔ "مجھے تو کرشنا جی اپنے پاس لے آئے تھے ورنہ میرے پاس تو سر کے سے گھر ہی نہیں ہے۔ آپ یہ خراب اور اچھے کی بات کیا لے بیٹھیں۔"

اُس کی آنکھیں بجھنے اور چمکنے لگیں، شاید اُسے میری بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔ "آپ ..... آپ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اندر دروازے سے ایک لمبی دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت برآمد ہوئی۔ اُس نے آہستگی سے چائے کا سامان میز پر رکھا۔ میں نے اُٹھ کے اُسے سلام کیا۔ اُس نے مجھے انگریزی میں دعائیں دیں مگر جلد ہی اُردو میں بات کرنے لگی۔ چائے کے دوران میں وہ اپنے شوہر کا حال بیان کرتی رہی۔ وہ ایک خوش گفتار اور سنجیدہ عورت تھی۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں رُکا۔ میں نے جولین سے اصرار کیا کہ وہ کچھ دنوں تک مجھے پڑھانے نہ آئے۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چلتے وقت اُس نے مسکرا کے مجھ سے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کرشنا جی اور چمپا دیدی کو میرا سلام کہیے گا۔" میں زینے پر اُترتے اُترتے رُک گیا۔ وہ بھی لکڑی کے جنگلے پر ٹھہر گئی۔ "کیا... کیا آپ کچھ بھول گئے ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے سَر ہلا کے کہا۔ "مس جولین! آپ کو کوئی بھی پریشانی ہو تو جھجکیے گا نہیں، مجھ سے ضرور کہیے گا۔ آپ نہیں کہیں گی تو میرے دل پر بوجھ رہے گا۔" میں نے اُسے مُڑ کے نہیں دیکھا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا۔



رات کو میری آنکھیں کھلی رہیں۔ راج کرشنا نے سیر کے لیے پوچھا مگر میں نے منع کر دیا۔ مس جولین کے فلیٹ میں بسی ہوئی دواؤں کی بُو رات بھر میرے دماغ پر چھائی رہی۔ اسی طرح صبح ہو گئی۔ راج کرشنا دفتر چلا گیا اور چمپا گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اب وہ اپنے کام میں گم رہتی تھی۔ تمام ملازم اُس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اُس نے وعدے کے مطابق اپنی زبان پر تالا ڈال لیا تھا۔ راج کرشنا نے اُس سے یا مجھ سے اُس کے ماضی کے متعلق کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اُس کے ساتھ اس طرح پیش آتا تھا جیسے دونوں برسوں کے شناسا ہوں اور جیسے چمپا اُس کی بہن ہو یا ماں ہو۔ وہ ہر وقت اُس کا مزاج پوچھتا رہتا تھا اور چمپا نیچی نظروں سے جی اور اچھا کہتی رہتی تھی۔ وہ میرے کپڑے نکال کے دیتی، دن میں کئی بار مجھے کبھی لیموں کا شربت، کبھی بادام کا اور کبھی گرم دودھ پلاتی تھی۔ چمپا نے بھگو سے جانماز منگوا کے نماز بھی شروع کر دی تھی۔ وہ سب سے پہلے جاگ جاتی اور جب ہم لوگ اُٹھتے تو ہمیں مصلّے پر بیٹھی ہوئی ملتی۔ صرف چند دنوں میں چمپا کا چہرہ بدل گیا تھا۔ وہ باہر بہت کم نکلتی تھی۔ بس ایک یا دو بار ڈرائیور کے ہمراہ گھر کی چند چیزیں خریدنے گئی تھی۔

صبح ہوئی، دوپہر ہوئی۔ میں بنگلے کے مختلف کمروں میں گھومتا رہا، اخبار پڑھتا رہا یا راج کرشنا کی کتابیں اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ جولین کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں بار بار گھڑی دیکھنے لگا حالانکہ آج مجھے اُس کے آنے کی اُمید نہیں تھی کیونکہ میں خود اُسے منع کر آیا تھا مگر جولین عین وقت پر مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ بہت تازہ نظر آرہی تھی۔ اپنے اُسی نکھرے لباس میں۔ "آپ پھر آگئیں؟" میں نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

"ڈیڈی کی طبیعت رات سے کچھ بہتر ہو گئی ہے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "ممی انھوں نے آنکھیں کھولیں اور بات بھی کی۔ میں اطمینان کر کے آئی ہوں۔

"آئیے، اپنا کام شروع کریں۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کا حرج ہوگا۔"

چمپا سے چند باتیں کرکے وہ کمرے میں آگئی اور کتابیں کھول کے بیٹھ گئی، پھر رک رک کے کہنے لگی۔ "کل آپ کے جانے کے بعد ممی کہتی رہیں کہ وہ آپ کی کچھ خاطر نہیں کرسکیں۔ آپ ممی کو بہت پسند آئے۔"

"مجھے بھی وہ بہت اچھی لگیں۔"

"اور میں آپ کو دیکھ کے بہت حیران ہوئی تھی۔ دیر تک تو مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ آپ آئے ہیں یا آپ آسکتے ہیں۔ پھر بعد میں مجھے یہ احساس ہوا کہ آپ کو میری کوئی بات گراں نہ گزری ہو؟"

"یہ احساس مجھے بھی رہا۔ ویسے بھی میں اطلاع کے بغیر پہنچ گیا تھا۔ ایسے موقعوں پہ بات کس طرح کی جاتی ہے یہ بھی مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"آپ نے بہت عجیب باتیں کیں۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی "میں تمام وقت یہی سوچتی رہی کہ آپ کی باتوں میں کوئی ایسی بات کیوں ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ میں نے شاید آپ کو بتایا ہو کہ کرشنا جی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ سے آپ کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں اور میں اس ہدایت پر پوری طرح کاربند ہوں مگر کیا آپ خود کچھ نہیں بتائیں گے؟"

"کیا بتاؤں؟" میں نے اضطراری آواز میں کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ بھی۔"

"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر رہنے دیجیے کسی اور وقت سہی، یہ بتائیے کہ آپ نے کام کتنا کیا؟ کل کی غیر حاضری کا مجھے افسوس ہے بہرحال ہم کل کی کسر آج پوری کرلیں گے۔"

"آج پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اچھا!" اس نے تعجب سے کہا۔ "مگر کیوں؟"

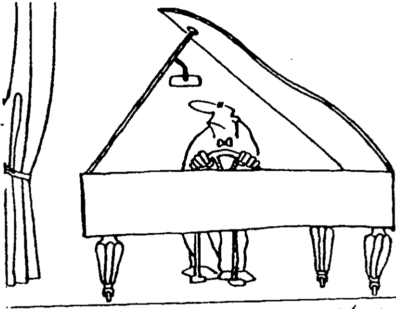
"بس آپ باتیں کیجیے۔"

اس کی پتلیاں پارہ بن گئیں۔ "کیا باتیں کریں؟" وہ کچھ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی مگر فوراً اس کی آواز پرسکون ہوگئی۔ "آئیے، میں آپ کو بڑے لوگوں کے اقوال سناؤں، یہ اقوال زندگی میں بہت کام آتے ہیں۔"

"خاک کام آتے ہیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ آپ ہی بتائیے، کیا آپ کے ڈیڈی کسی قول سے ٹھیک ہو جائیں گے؟"

"ہاں۔" وہ آہ بھر کے بولی۔

وہ اچھی خاصی آئی تھی مگر میری باتوں سے اداس ہوگئی اور پڑھانا لکھانا بھول گئی، کہیں کھو سی گئی، ساڑی کا پلو اس کے کندھے سے ڈھلک گیا لیکن اسے خیال ہی نہیں رہا۔ مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ "مس! آپ نے کرشنا جی کے ریکارڈ سنے ہیں؟ آئیے



میں آپ کو سنواؤں۔"

وہ جھجکی مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اٹھالیا۔ "آئیے مس!"

"سنیے،" آپ مجھے مس نہ کہا کیجیے۔" اس نے کرب سے کہا۔

"کیوں مس؟" میری زبان سے نکل گیا۔ "پھر کیا کہوں؟"

"جولین کہا کیجیے۔ گھر میں سب مجھے جولین کہتے ہیں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ راج کرشنا نے میرے کمرے میں گراموفون اور ریکارڈ رکھ دیے تھے مگر میں نے گراموفون کبھی نہیں بجایا تھا جب وہ آتا تھا تو خود کوئی نہ کوئی ریکارڈ لگا دیتا تھا۔ اسے صرف دھنوں کا شوق تھا۔ ہلکی مدھم دھنیں جیسے چشمہ بہتا ہو۔ میں نے گراموفون پر اس کا پسندیدہ ریکارڈ رکھ دیا، کمرے میں موسیقی گھل گئی۔ پھر جولین خود ریکارڈ منتخب کرکے سننے لگی۔ اس طرح اس کی طبیعت کچھ بہل گئی۔ جب وہ جانے لگی تو میرا جی چاہا اسے اور روکوں مگر شام ہو رہی تھی۔ راج کرشنا ابھی واپس نہیں آیا تھا، اس کی موٹر ہوتی تو میں ڈرائیور سے کہہ کے جولین کو اس کے گھر پہنچوا دیتا۔ گیٹ سے باہر میں نے دبے لہجے میں کہا۔ "میں چلوں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ روز ہی جاتی ہوں؟"

"میں چلتا ہوں۔" میں نے ضد کی۔

"واپسی میں رات ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا، میں آجاؤں گا۔"

وہ منع کرتی رہی مگر میں اس کے ساتھ ساتھ بس اسٹینڈ تک پہنچ گیا۔ ہم دونوں ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ بس نے ہمیں اس کے گھر سے کچھ دور اتار دیا۔ آگے جانے سے پہلے میں نے اسے ایک جگہ روک لیا۔ سامنے پھل والے کی دکان تھی، میری جیب میں راج کرشنا روز کچھ روپے ڈال دیتا تھا۔ میں نے بہت سے پھل خریدے۔ "یہ یہ کیا ہے؟"

"یہ آپ کے ڈیڈی کے لیے ہیں، میری طرف سے۔"

"اوہ نہیں، یہ بہت زیادتی ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"کیوں؟ کیا میں انھیں کوئی چیز پیش نہیں کرسکتا؟"

وہ کسمسا کے چپ ہوگئی۔ میں اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو مجھے

اُس کے باپ کی طبیعت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا، مس جولین نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں چند منٹ بیٹھ کے واپس آ گیا۔

جولین کے باپ کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا مگر وہ روز مجھے پڑھانے آتی رہی اور میں روز اُس کے ساتھ اُس کے گھر جاتا رہا اور ایک دن ایک ڈاکٹر کو بھی لے گیا۔ ڈاکٹر نے کوئی خاص اُمید ظاہر نہیں کی، چند دوائیں لکھ کے دے دیں۔ میں نے نسخہ جولین کو نہیں دیا بلکہ خود دوائیں خرید کے لایا مگر بوڑھے نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اُس کی حالت روز بہ روز گرتی گئی۔ میں چونکہ جولین کے ساتھ روز شام کو وہاں جانے لگا تھا اس لیے گلی کے بعض آدمی ہماری جانب نگاہیں اُٹھانے لگے تھے، ہمارے گزرتے وقت اُن کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ اُبھر آتی تھی۔ میں نے اُن کی پروا نہیں کی۔ نکڑ کے ہوٹل پر لڑکے ہمیشہ آگے کی طرف بیٹھے رہتے تھے، انھوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دی تھیں۔ پھر کھانس کھنکار ہونے لگی، ایک دوسرے سے اشارے کیے جانے لگے۔ جولین بھی یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور سہم جاتی تھی۔ آخر ایک روز اُس نے مجھ سے کہہ ہی دیا کہ "یہ بہت بُرے لوگ ہیں، بہتر ہے کہ آپ اِدھر نہ آیا کریں۔ ان کی یہی عادت ہے۔"

"ہونے دیجیے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"مگر مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔"

"اُن کی طرف توجہ ہی مت دیا کیجیے۔"

"مگر آپ کو پتہ نہیں ہے، اُن سے پورا محلّہ نالاں ہے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، ہمیں احتیاط رکھنی چاہیے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں، یہ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔"

"ایسے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، اِن کا بس ایک ہی علاج ہے کہ ان کی طرف دیکھا ہی نہ جائے۔ نظر چُرانا بھی توجہ دینا ہے یا پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی جائیں۔"

"یہ ہمیشہ چاقو رکھتے ہیں اور محلّے میں آئے دن لڑتے رہتے ہیں۔"

جولین روز صبح ایک اسکول میں پڑھانے جاتی تھی اور سہ پہر کو مجھے پڑھانے آتی تھی پھر شام کو تھکی ہاری گھر پہنچتی تھی۔ میں نے راج کرشنا کی نظر میں اُس کی وقعت بڑھانے کے لیے انگریزی کی پہلی کتاب صرف پندرہ دن میں ختم کر لی۔ راج کرشنا نے خوش ہو کے اُسے کافی کا ایک سیٹ پیش کیا۔ یہ گیارھویں یا بارھویں روز کی بات تھی۔ مجھے اُس کے ساتھ جاتے ہوئے گیارہ بارہ ہی دن ہوئے ہوں گے۔ گیارھویں بارھویں دن حسبِ معمول شام کو میں اُس کے ہمراہ جانے کے لیے بس اسٹینڈ پر گیا تو اُس نے مجھے بس میں نہیں بیٹھنے دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے خوف زدہ لہجے میں بتایا کہ صبح اسکول جاتے ہوئے لڑکوں نے مجھ پر جملے کسے تھے کہ شام کو آپ میرے ساتھ اُس علاقے میں نظر نہ آئیں ورنہ بُرا ہو گا۔ انھوں نے اور بھی بہت گندی گندی باتیں کی تھیں۔

بس آئی تو وہ مجھے چھوڑ کے جلدی سے چڑھنے لگی مگر میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ میں بھی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ راستے بھر واپس ہونے کے لیے میری منت کرتی رہی اور سہمی رہی۔ میں نے اُسے ہمت دلائی کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میں اگر آج نہ گیا تو پھر کبھی اُس کے گھر نہیں آ سکوں گا۔

بس سے اُترنے کے بعد میں نے پھل خریدے۔ پھلوں کا ایک تھیلا اُس نے سنبھال لیا، ایک میں نے، پھر ہم گلی میں داخل ہو گئے۔

نکڑ کے ہوٹل پر لڑکے شاید ہمارے انتظار میں تھے۔ ایک دم سیٹیاں بجنے لگیں۔ "اوئے بُڈّے!" ایک لڑکے نے آواز بلند کی۔ "چھوکری پھر چھوکرے کے ساتھ آ رہی ہے۔"

"سالا صبح اپن نے کیا بوم مارا تھا کہ اب ادھر یار نہیں آئیں گا۔" ہوٹل کے اندر سے ایک صحت مند لڑکا تیزی سے باہر نکلا۔ "ماسٹر! سالا ادھر اپن کے کنٹری میں کیا سب لوگ مر گیا ہے؟ سب نامرد ہو گیا ہے؟" ایک اور لڑکا طیش میں بولا۔

جولین نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "چلو چلو، اِن کی بات مت سنو، سیدھے چلے چلو۔" میں نے جھٹکا دے کے اُس سے اپنا بازو چھڑایا اور وہیں جم کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے پھلوں کا تھیلا جولین کے سپرد کیا اور اُن پانچوں لڑکوں کو گھورنے لگا۔

"ماسٹر! دیکھتا ہے؟" ایک لڑکے نے ہنس کے کہا۔ "سالا آنکھیں دکھاتا ہے، ابھی بہت ہو گیا ماسٹر! اسٹارٹ، ایک دم اوپننگ۔"

ماسٹر ہوٹل سے اُتر کے گلی میں آ گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے باقی لڑکے بھی کسل مندی سے اُترے۔ راہ گیر یہ منظر دیکھتے ہوئے چپ چاپ گزر گئے۔ جولین نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں کہتی ہوں، یہاں سے چلو۔" اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

"ابھی یہ ادھر سے نہیں جائیں گا۔ اپن نے تم کو پہلے ایڈوائز کر دیا تھا کہ ہم ادھر اس کو گلی میں دُور دُور تک دیکھنا نہیں مانگتا۔ سالا تمھارے لیے ادھر چھوکرا لوگ کی کمی ہے؟ اپن کے جونی میں کیا ڈفیکٹ ہے؟ ایک دم پرفیکٹ ہے۔ کوتن! اپن ایک چانس اور دے گا۔ اس کو بولو، ابھی فنش ہو جائے۔" وہ براہِ راست جولین سے مخاطب ہوا۔ جولین اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرا شانہ کھینچنے لگی۔

"تم چپ ہونے کا کیا لے گا؟" میں نے تحمل سے کہا۔

"تم سالا کیا دیں گا پیٹی! یہ کیا بوم مارتا ہے۔"

"ماسٹر چھوکری کے سامنے تگڑم کرتا ہے۔ سالا کو پانی کر دو۔"

"ماسٹر! ابھی سچ بتا دو کہ ادھر کا لوگ بھی سالا دل رکھتا ہے۔ کوتن کو کنٹری کا گنگ ہی لے جائیں گا۔"

"کوتن! تم نے بولا نہیں، اپن کون ہے؟"

"بولا" میں نے جواب دیا۔ "اس نے ہمیں بولا کہ تم کون ہے"۔ "تم بالکل چالو ہے اور جب تک تمھاری زبان نہیں کاٹی جائے گی، تمھیں آدمیوں میں رہنے کی تمیز نہیں آئے گی۔ میں ادھر روز آؤں گا تم سب سن لو، تم نے اگر آئندہ مس جولین کو کچھ کہا یا ادھر گلی سے گزرتے ہوئے ہمارے کان میں تمھاری کوئی آواز پڑی تو تم سب یہاں نظر نہیں آؤ گے سمجھا؟ جا کے سیدھی طرح ہوٹل میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنی آواز پرسکون ہی رکھی۔

اُن سب نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اچانک اُن کے منہ سے ایسی ہنسی پھوٹ پڑی جیسے ٹائر پھٹ جائے۔ "ماسٹر! چھوکرا تھوڑا بہت جان رکھتا ہے۔ اپن کی کوئن نے ایلسیشن کے گلے میں پٹا باندھا ہے۔ بھونکتا بیون میں ہے۔"

"او سالا اپن سالا جوا ایدر بلڈاگ پڑا ہے"۔ ماسٹر تیور سے بولا۔ "اے چھوکرا! ایدر تم نیا نیا ہے، ایدر تم جانتا نہیں کیا ہوتا ہے۔ اپن بولتا ہے فلش ہو جاؤ۔ گن"۔ وہ دونوں ہاتھ جھٹک کے گرجا۔ "اپن کا کوئن باہر نہیں جائیں گا۔"

جولین نے مجھے دھکا دے کے بھاگ جانے کی تلقین کی مگر میں نے گلی میں جولین کے مکان کی جانب عمداً قدم بڑھائے، میری توقع کے مطابق ماسٹر نے میرے گریبان پر جھپٹا مارنے کے انداز میں ہاتھ ڈال دیا۔ "اودر کا راستہ بند ہے"۔ وہ میرا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ "ایدر جاؤ، اودر صرف جونی جا سکتا ہے۔ کوئن! اینڈ چینج کر دو۔ اپن ایدر تمھارے لیے بیٹھا ہے۔ بٹ جونی از نمبر ون۔ اِف یو . . . ."

میں نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی، جس ہاتھ سے اُس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا، میں نے اُس پر ترچھے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ ماسٹر کا ہاتھ نیچے جھول گیا۔ میں کئی دن سے انھیں دیکھ رہا تھا اور اس لیے اُلجھنے سے گریزاں تھا کیونکہ وہ مجھے زیادہ ضرر رساں نظر نہیں آتے تھے وہ شہدے تھے، اُچکے۔ ماسٹر کی گردن پر جب دوسرا ہاتھ پڑا تو وہ نیچے بیٹھ گیا۔
"کیوں ماسٹر!" میں نے ہاتھ روک لیا۔ "ٹھیک ہے؟"

اس سے پہلے کہ ماسٹر جواب دیتا، اُن میں سے ایک نے دائیں جانب سے میرے شانے کو دھکا دیا۔ اُس کا نام پیٹی تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ماسٹر کے فرش بوس ہونے کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے اس لیے اس سے پیشتر کہ پیٹی کے ساتھ کوئی دوسرا مجھ پر لپکے اور خواہ مخواہ معاملہ مزید اُلجھے، میں نے مشتعل انداز میں اُلٹے ہاتھ سے ایک سوچی سمجھی ضرب لگائی۔ پیٹی ہوٹل کے چبوترے سے جا ٹکرایا، اُس کا ماتھا کھل گیا، یہ سب چشم زدن میں ہو گیا۔ اس طرح باقی تین سورماؤں کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ میں نے دانستہ اُن کی طرف دعوتی نگاہ سے دیکھا۔ اُدھر ماسٹر نے چاقو نکال لیا تھا۔ جولین بے تحاشا چیخنے لگی "نو، نو"۔ اُس نے ماسٹر کا ہاتھ پکڑ لیا، ماسٹر نے اُسے دور دھکیل دیا اور چاقو ہاتھ میں لیے ہوئے

ایسی خوشی سے دور رہو جو بعد میں غم کا کانٹا بن کے چبھے۔ ـــ ہربرٹ
* نصیحت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ اُسے غور سے سُنو اور سُن کے آگے بڑھا دو ـــ آسکر وائلڈ
* نا اُمید ہونے سے عمر گھٹتی ہے ـــ ارسطو
* شکست کا ایک ہی جواب ہے: فتح ـــ چرچل

شہباز احمد چودھری

میرے سامنے ناچنے لگا جب کہ میں ایک جگہ جما کھڑا تھا لیکن میری آنکھیں جمی ہوئی نہیں تھیں، ماسٹر کے ہاتھ میں چاقو کی گرفت اور اُس کا انداز دیکھ کے مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ میں نے آواز لگائی "جولی! پیچھے ہٹو"۔ ماسٹر نے غیر اختیاری طور پر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ میرے قبضے میں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ ماسٹر کی آنکھیں پھٹ گئیں، دوسری ضرب پر چاقو پر اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور تیسری ضرب پر وہ نیچے گر گیا، فرش پر گرتے ہی میں نے اُلٹے ہاتھ سے اُسے اُٹھا لیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی اُس کے ساتھی دُور ہو گئے۔ وہ ماسٹر کا اشارہ پانے کے لیے پہلے ہی تیار کھڑے تھے اور پیٹی کے انجام سے محتاط ہو گئے تھے۔ میں نے پھل کا لہراتے ہوئے اُن سب پر نظر ڈالی اور آہستہ سے اُسے بند کر کے ماسٹر کی طرف اُچھال دیا۔ ماسٹر سکتے میں پڑ گیا۔ میں نے جولین کے ہاتھ سے تھیلا لیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ابھی میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ میں جولین کا بازو زور سے پکڑے ہوئے اچانک پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ اُچکے ماسٹر سے ایسا اوچھا پن بعید نہیں ہے۔ میرے کان اور آنکھیں پیچھے کی طرف لگی ہوئی تھیں جیسے ہی ماسٹر کے چاقو کھولنے کی آہٹ اور اُس کے اُٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی، میں اُس کے نشانے سے ہٹ گیا۔ ماسٹر غضب میں آگے نکل گیا۔ میں نے جولین کو چھوڑ کے اُس کی پشت پر جست لگائی۔ ماسٹر چند ثانیے بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ میں نے اتنی شدت سے مروڑا کہ اُس کی دردناک کراہیں گلی میں ہر سمت گونجنے لگیں۔ چاقو گرنے کے بعد بھی میں نے اُسے چھوڑا نہیں۔ مجھ سے جتنی ضربیں لگ سکتی تھیں میں نے اُس پر لگائیں اور جتنی وہ برداشت کر سکتا تھا، اُس نے برداشت کیں۔ میں اُسے بالوں، بازوؤں اور گدی سے پکڑ پکڑ کے اُٹھاتا اور فرش پر پھینکتا رہا۔ اُس کا جسم جگہ جگہ سے کھل گیا۔ درمیان میں اُس کے ایک ساتھی نے پیچھے سے اچک کے میری گردن میں ہاتھ ڈالا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے ماسٹر پر لوٹ دیا۔ پھر اُس کا کوئی ساتھی نہیں پلٹا۔ یا تو وہ کہیں چھپ گئے ہوں گے یا دوسروں کو خبر کرنے کے لیے دوڑ پڑے ہوں گے۔ جولین نے میرے بازو سے لپٹ کے مجھے روک لیا۔ ماسٹر زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے جولین کی منت پر اُسے دوبارہ نہیں اُٹھایا۔ ماسٹر کا چاقو اُس کے پاس ہی زمین پر پڑا تھا مگر اُس میں اُسے اُٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ گلی میں سناٹا طاری تھا، کھڑکیوں اور بالکونیوں میں کھڑے ہوئے لوگ، عورتیں اور مرد اب گلی میں نکل آئے تھے۔ میں جولین کو لے کے اُس کے گھر کی جانب چلنے لگا۔ فلیٹ پہ پہنچ کے میں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔



یہ معاملہ شروع ہونے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی آگے بڑھ جائے گی۔ وہ ایک تنگ گلی تھی، اُس کے نکڑ سے ذرا اندر ہوٹل تھا، گلی موڑ کاٹ کے دوسری گلی سے مل جاتی تھی، میں محلِ وقوع کا جائزہ لے کے ہوٹل سے چند قدم اِدھر اندر کو گلی میں کھسک آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ سب سے پہلے ماسٹر آگے بڑھے "تاکہ فیصلہ فوراً ہوجائے اسی لیے میں نے ماسٹر کو اکسایا تھا۔ میری خواہش کے مطابق ماسٹر ہی نے پہل کی مگر اُسے پہلے ہی مرحلے پر خاموش ہوجانا چاہیے تھا۔ شہدے عام طور پہ اُسی وقت علاقے کے مکینوں کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں جب انھیں اپنی طاقت پہ اعتماد ہو، بصورتِ دیگر معاملہ ٹال جاتے ہیں۔ میں نے ماسٹر کو یہ موقع دیا تھا مگر اُس نے توجہ نہیں دی۔ یہ اُس کی گلی تھی اور یہاں کے مکین اس منظر کے گواہ تھے، اُسے کچھ خیال ہونا چاہیے تھا مگر خیال تو اُسے ہوتا جسے کسی نے یہ باتیں ذہن میں رکھنے کی تربیت دی ہوتی، اُسے تو چاقو پکڑنا تک نہیں آتا تھا۔ نتیجتہً جس بات سے میں بچنا چاہتا تھا، وہی ہوئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ لوگ فضول بحث کریں گے۔ ماسٹر کے بعد پپّی کا آنا اور پپّی کے بعد ایک دوسرے شخص کا میری گردن میں ہاتھ ڈالنا بہت چھوٹے پن کی بات تھی۔ بٹھل ہوتا تو مجھ پر بہت ناراض ہوتا کہ اس موقع پر تیرا ہاتھ اُٹھا ہی کیوں؟ تیری بات ہی نے انھیں کیوں نہ روکے رکھا مگر میں نے انھیں باز رکھنے کی پوری کوشش کی تھی، اُن کے پلّے نہیں پڑی تو میں کیا کرتا۔

جولین بہت حواس باختہ تھی، اُس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ مجھے اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اب وہ بالکل مطمئن رہے، اطمینان سے گلی میں نکلا کرے، اب کسی جانب سے کوئی رکیک آوازہ اُس کے کان زخمی نہیں کرے گا مگر جولین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہیں۔ وہ مجھے کمرے میں بٹھا کے دوسرے کمرے میں چلی گئی، شاید اُسے سکون کی ضرورت تھی۔ اُس کی ماں نے مجھے سنگترے کا عرق پلایا اور آئے دن، گلی کے غنڈوں کے کرتوت سنانے لگی۔ جولین جب کمرے میں آئی تو اُس کے چہرے پہ پہلے جیسا اضطراب نہیں تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے مطمئن ہو کے واپس ہونا چاہا لیکن جولین نے مجھے روک لیا۔ اُس کی آنکھیں ہانپ رہی تھیں، نتھنے پھڑک رہے تھے اور نچلا ہونٹ کبھی اُبھر آتا تھا، کبھی چھپ جاتا تھا، گال دھوپ چھاؤں سے تھے۔ سُرخ اور سفید رنگ جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ "آپ ابھی سوچ رہی ہیں؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں یہ میں نے کیا دیکھا تھا؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"بھول جائیے جیسے .... جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"اور اگر .... اگر آپ کو کچھ ہوجاتا؟"

"تو کیا ہوتا! میرا رونے والا کون ہے۔"

اُسی لمحے جولین کی ممی دہشت زدہ انداز سے کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے گلی میں پولیس کی آمد کی خبر سنائی۔ یہ بالکل غیر متوقع خبر تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے کرسی چھوڑ دی۔ جولین نے مجھے روکا اور خود بالکونی سے نیچے جھانک کے دیکھا۔ وہ بدحواسی سے واپس آئی۔ "نیچے پولیس موجود ہے۔"

"مجھے نیچے جا کے دیکھنا چاہیے۔"

"نہیں نہیں۔ ابھی ٹھہریے۔ کرشنا جی آتے ہی ہوں گے۔"

"کرشنا جی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔" اُس نے کہا۔ "مجھے اندیشہ تھا کہ بات اور نہ بگڑ جائے۔ آپ کو واپس اُسی راستے سے گزرنا ہے، آپ نے دیکھ ہی لیا، پولیس آگئی۔ ابھی کچھ دیر ہوئی، میں نے نچلے ملے کی ایک لڑکی مارتھا سے کہا تھا کہ وہ کہیں سے فون پہ کرشنا جی کو مطلع کردے۔ بس وہ آ ہی رہے ہوں گے۔"

"اوہ! آپ نے یہ کیا کیا؟" میں نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ جولین نے مجھے منع کیا، میں نے آگے بڑھ کے کنڈی کھول دی۔ ایک انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ "مس جولین کا فلیٹ یہی ہے؟" اُس نے نیم گرم نیم نرم لہجے میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور درشتی سے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

انسپکٹر نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ اُسے شاید میرا لہجہ ناگوار گزرا تھا پھر یکا یک زینے میں کھلبلی سی مچی، انسپکٹر نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور راکڑ کے کھڑا ہوگیا۔ راج کرشنا کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اُس نے آتے ہی میرا بازو پکڑ لیا۔ "کیا ہوا؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کچھ نہیں کہا، بس جولین کی طرف ناراضی سے دیکھا۔ وہ راج کرشنا کو اندر لے گئی۔ انسپکٹر باہر ہی کھڑا رہا۔ جولین جب تک راج کرشنا کو رُوداد سناتی رہی، میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کے اُس کے ڈیڈی کو دیکھنے گیا۔ اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں بالکونی میں کھڑا ہوگیا۔ گلی میں سپاہی منتشر تھے اور دروازوں، چھتوں، بالکونیوں پہ ہر طرف لوگ موجود تھے۔ پولیس سے کچھ دُور ایک بڑا ہجوم دائرہ بنائے کھڑا تھا۔ سب کی نظریں جولین کی بلڈنگ پر مرکوز تھیں۔ میں بالکونی میں نمودار ہوا تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں وہاں سے ہٹ آیا۔ راج کرشنا جولین کو تسلی دے رہا تھا۔ نیچے اُترنے سے پہلے میں اُسے جولین کے بیمار باپ کے کمرے میں لے گیا۔ وہ اُس کی حالت دیکھ کے گُنگ رہ گیا۔

ہمارے ساتھ جولین بھی نیچے آتری سپاہیوں نے بوٹوں کی گرج کے ساتھ راج کرشنا کو سیلوٹ کیا۔ گلی میں چند لمحوں کے لیے ایسا سکوت چھا گیا تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ ہر طرف پتھر کے آدمی نظر آرہے تھے۔ انسپکٹر اور سپاہی مؤدبانہ راج کرشنا کے نزدیک کھڑے تھے۔ راج کرشنا نے جولین کی کمر تھپتھپائی اور انسپکٹر سے آہستہ لہجے میں کچھ کہا اور میرا ہاتھ تھام کے واپس ہونے لگا۔ گلی کے موڑ پر میں نے پلٹ کے دیکھا، جولین کا اُٹھا ہوا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ راج کرشنا نے مسکرا کے جواباً ہاتھ ہلایا۔ ہم تین گلی میں آ گئے اور اُس ہوٹل کے پاس پہنچ گئے جہاں ماسٹر نے میرا گریبان پکڑا تھا۔ نہ جانے وہاں کے لوگوں کو کیا ہوا؟ ہمارے گزرتے وقت تالیاں بجانے لگے۔ ایک ستر اسّی سالہ خمیدہ کمر سُوٹڈ بُوٹڈ بوڑھا اچانک ہمارے راستے میں مزاحم ہو گیا۔ "ٹھیرو، ٹھیرو۔" وہ انگریزی میں بولا۔ اُس نے میری کلائی پکڑ کے کھینچا، میں آگے جھک گیا تو اُس نے میرے بال پکڑ لیے، میں نے سر جھکا دیا۔ اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ جہاں جہاں لوگ کھڑے تھے دوبارہ تالیاں بجانے لگے۔ پولیس کا دستہ موٹر میں بیٹھنے تک ہمارے ساتھ رہا۔

راج کرشنا کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماسٹر اور اُس کے ساتھیوں کا دوبارہ ہوٹل میں بیٹھنا اور گلی میں دندنانا ممکن ہی نہیں تھا۔ جولین نے خواہ مخواہ ایک تماشا بنا دیا۔ بہرحال اُس کی تشفی ہو گئی اور محلّے کے لوگوں کی ہمت بھی بندھی کیونکہ پولیس کا محکمہ ایسے ہی موقعوں اور ایسے ہی لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے اور کچھ نہ سہی راج کرشنا کے سامنے جولین کا وقار ہی بڑھ گیا۔

راج کرشنا نے دوسرے دن جولین کے باپ کو سینی ٹوریم میں داخل کرا دیا۔ جب وہ مقررہ وقت پر مجھے پڑھانے آئی تو ایک بدلی ہوئی لڑکی نظر آرہی تھی۔ وہ ہماری واپسی کے بعد گلی میں ہونے والے چرچے سنانے لگی۔ محلّے کی عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم اُس کے گھر اُمڈ پڑا تھا جیسے ماسٹر کے ہاتھ سے چاقو اُسی نے چھینا ہو۔ باتیں کرتے وقت جولین کو خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اپنے شاگرد کے سامنے گفتگو کر رہی ہے۔ وہ سارا وقار بھول گئی تھی اور کسی الھڑ لڑکی کی طرح آنکھیں پٹ پٹا کے تیز تیز باتیں کر رہی تھی، میں نے اُسے ٹوکا "آج آپ پڑھائیں گی نہیں؟"

وہ شرما کے دُہری ہو گئی "اوہ ہاں، میں ڈیوٹی پر ہوں۔"

"یہ کیسی بات کی آپ نے؟" میں نے تنکا ٹیا کہا۔

"اچھا جی! معاف کر دیجیے، غلطی ہو گئی۔"

"کوئی استاد اپنے شاگرد سے معافی مانگتا ہے؟"

"اچھا استاد وہی ہے جو اپنی غلطی کا اقرار کر لے۔ لوگ، لوگوں کو چھپا رستم کہتے ہیں، میں آپ کو کہوں گی کہ آپ چھپے استاد ہیں اور آپ سے درخواست کروں گی کہ مجھے شاگردی میں لے لیجیے۔"

"مجھے آتا ہی کیا ہے۔"

"آپ کو۔" وہ جھرجھری لے کے بولی۔ "آپ کو وہ آتا ہے جو کسی کو نہیں آتا۔ بتائیے، آپ مجھے شاگرد بنائیں گے؟"

"کس بات کی شاگرد؟"

"کتابوں نے مجھے ڈرپوک بنا دیا ہے، آپ مجھے حوصلے کی تعلیم دیجیے۔"

"حوصلہ۔" مجھے ہنسی آگئی۔ "لوگ تو خود مجھے بار بار حوصلے کی تلقین کرتے ہیں، احساس دلاتے ہیں کہ تم ایک مرد ہو۔"

"کون لوگ ہیں وہ؟"

"بہت سے لوگ ہیں۔"

"تعجب ہے۔"

"ہاں مجھے خود تعجب ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔ "میرا خیال ہے، زندہ رہنا ہی ایک حوصلہ ہے۔ حوصلہ کہیں بے غیرتی کو تو نہیں کہتے؟"

"ہاں۔" وہ بھی افسردہ ہو گئی۔ اُس کی پلکیں سمٹ گئیں کورا کی بھی یہی کیفیت ہوتی تھی، کورا۔ جولین کی پلکیں کورا کی پلکوں سے بہت مشابہ تھیں، اُنھی کی طرح گھنی اور کھنچی ہوئی۔ اب تو اور گھنی ہو گئی ہوں گی میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ پھر جولین نے بے وقت موسیقی سننے کا اشتیاق ظاہر کر دیا۔ گو اُس نے کتاب کھول کے مجھے پڑھانا شروع کر دیا تھا لیکن آج اُس کے پڑھانے میں ہمیشہ والی روانی اور سنجیدگی نہیں تھی۔ میں نے اُس کی فرمائش پوری کر دی۔ وہ ریکارڈ سنتی رہی اور مجھے دیکھتی رہی پھر معمول کے مطابق میں اُسے پہنچانے کے لیے اُس کے گھر گیا حالانکہ اُس کے ڈیڈی سینی ٹوریم میں داخل ہو گئے تھے۔ ہوٹل سنسان پڑا تھا۔ گلی میں مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میرا استقبال کیا گیا۔ لوگ مجھے اور جولین کو ساتھ دیکھ کے اشارے کرنے لگے لیکن یہ اشارے ویسے نہیں تھے جیسے ماسٹر اور اُس کے ساتھی کرتے تھے۔

راج کرشنا نے ایک ہفتے کے اندر جولین کے لیے اپنے علاقے ہی میں ایک مختصر اور ستھرا مکان کرائے پر لے کے اُسے منتقل کر دیا۔ جولین اس پر تیار نہیں ہوتی تھی، اِس کی صورت راج کرشنا نے یہ نکالی کہ اپنے اثر سے جولین کی موجودہ ملازمت چھڑوا کے اُسے انگریزوں کے اسکول میں ملازمت دلوا دی، جہاں سینئر کیمبرج تک تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں پہلے سے دگنی تنخواہ تھی جولین قریب آگئی تو اُس نے میری پڑھائی کے لیے زیادہ وقت دینا شروع کر دیا۔ ہم جب سیر کے لیے جاتے تو جولین کو ساتھ لے لیتے۔ چمپا کی اُس سے بہت گھٹتی تھی۔ سینی ٹوریم میں اُس کے باپ کی حالت نسبتہً بہتر ہو گئی تھی۔

لیکن وہ نہیں ملی جس کی مجھے تلاش تھی۔ جب میری طبیعت بہت گھبراتی تو میں سڑکوں پر نکل جاتا اور ایک ایک چہرہ گھور کے دیکھتا رہتا اور ایک ایک آدمی کا جائزہ لیتا رہتا۔ میں گھنٹوں کسی چوراہے پر کھڑا رہتا اور راہ گیروں کی شکلیں تکتا رہتا۔ کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ہر آدمی کا چہرہ مختلف تھا۔ نہ مولوی صاحب جیسی شکل کا کوئی آدمی ملا، نہ کورا جیسی شکل کی کوئی لڑکی دکھائی دی۔ نہ ابا جان نظر آئے نہ گھر کا کوئی دوسرا فرد۔ رات کو کمرے میں بند ہو کے میں اپنی مالا کے دانے چہرے پر بکھیر لیتا تھا۔ اس سے بہت بے قراری ہوتی تھی مگر یہ بے قراری ہی تو میرا سکون تھی مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے کورا کو ایک خط لکھ دیا ہے اور بس اب اُس کا جواب آتا ہی ہوگا۔ مالا کے دانے میری آنکھوں سے مَس ہوتے تو مجھ پر غنودگی طاری ہو جاتی۔

راج کرشنا کی مصروفیت بڑھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ رات گئے گھر واپس آتا۔ چمپا اُس کا انتظار کرتی رہتی۔ جب تک وہ نہ آ جاتا ہم دونوں میں سے کوئی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ آ کے ہمیں ڈانٹتا تھا۔ راج کرشنا کے تبادلے کی بہت سی کوششیں ہوئیں مگر کوئی کوشش بار آور نہیں ہوئی کیونکہ مرکزی حکومت نے اُسے بمبئی شہر کی ناگفتہ بہ صورتِ حال کے سدِباب کے لیے خاص طور پر یہاں بھیجا تھا۔ مستانہ کے کئی آدمی ایک ڈیڑھ مہینے کی جیل کے بعد چھوٹ گئے تھے۔ اُن کا تعلق اندرونی گروہ سے نہیں تھا۔ مستانہ کا مقدمہ چل رہا تھا اور شہر کے رئیسوں کے مقدمات بند کمروں میں جاری تھے۔ اخبارات راج کرشنا کے ساتھ تھے۔ وہ جہاں جاتا اُسے عزت دی جاتی، لوگ اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ پولیس کے پرانے اعلا حکام اُس کے اچانک فیصلوں سے خاصے ناراض ہوتے تھے مگر جب اُن پر عمل درآمد کے بعد کامیابی ہو جاتی تو راج کرشنا کو مبارک باد دینے کے لیے گھر آتے تھے۔ بعض اہم چھاپوں اور کارروائیوں میں راج کرشنا بذاتِ خود شریک ہوتا تھا، وہ ایک بے باک اور صاف گو شخص تھا۔ چمپا کی وجہ سے گھر پر ہونے والی میٹنگوں میں کمی ہو گئی تھی لیکن پولیس افسر اُس سے مشورے کرنے کے لیے روز آتے تھے۔

مجھے اُس کے ساتھ رہتے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ اِن چار مہینوں میں کئی بار میں نے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا مگر راج کرشنا کے خیال سے میرے قدم خود بخود مجھے اُس کے گھر واپس لے گئے۔ میں نے اُسے زیادہ پریشان نہیں کیا یا ایسا تھا کہ وہ میری پریشانی کا عادی ہو گیا تھا۔ کئی مرتبہ میرے جی میں آئی کہ میں زرّیں کو اپنی خیریت کا خط لکھ دوں، وہ مطمئن ہو جائے گی کہ میں زندہ ہوں، بجّھل کو بھی قرار آ جائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک بے پتہ خط لکھوں گا مگر میں نے کوئی خط نہیں لکھا کیونکہ اس طرح وہ اور پریشان ہو سکتی تھی۔ راج کرشنا کہتا تھا کہ زندگی میں مایوسی زندگی کی عملی موت ہے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ تو میں ہوں ہی نہیں، یہ تو کوئی اور شخص ہے جو راج کرشنا کے پاس رہتا ہے، اسے دنیا کا کوئی کام نہیں ہے۔ اگر راج کرشنا اس شخص سے خوش ہوتا ہے تو میرا کیا حرج ہے۔ مجھے اور کہاں جانا ہے؟ کس کے پاس جاؤں گا؟ ہر جگہ یکساں ہے۔ کسی بھی جگہ چلا جاؤں، وہاں کورا تو نہیں ہوگی۔

نورین کئی بار گھر آئی اور دیر تک بیٹھی رہی۔ اُس نے مجھے رقص سکھانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر ایک دن ہم اُس کے گھر گئے۔ ممیا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ رستم جی نے انواع واقسام کے تکلفات میز پر چن دیے تھے۔ ایک دن مسز روپ پٹیل نے بھی ہمیں مدعو کیا۔ اُس کا گھر کیا تھا، ایک محل تھا۔ مسز روپ نے پھر وہی ہار پہنا۔ شاید وہ مجھے چڑانا چاہتی تھی۔ مجھ سے وہاں کھایا نہیں گیا۔ میں گھر آکے دوسرے دن تک کمرے میں بند رہا۔ جولین نے مجھے بستر سے اٹھایا۔ جولین کی آنکھوں میں ایک عجیب بات آگئی تھی۔ پہلے ایسی بات نہیں تھی اب وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتی تو مجھ پر لرزہ سا طاری ہو جاتا۔ اُس کی آنکھوں پر مجھے اپنی کورا کی آنکھوں کا گمان ہوتا جیسے جولین کی آنکھیں بدل رہی ہوں۔ گھبرا کے میں نے اُس کی طرف دیکھنا ہی کم کر دیا۔

ایک دن شام کی بات ہے۔ جولین مجھے پڑھا کے واپس جا چکی تھی۔ دو باوردی پولیس افسر راج کرشنا سے ملنے کے لیے بنگلے آئے۔ میں اُن میں سے ایک کو خوب جانتا تھا۔ وہ بھی مجھے جانتا تھا۔ اُس کا نام جسونت راؤ تھا۔ میں نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کے اُن کے لیے ناشتہ پانی منگوایا اور خود ذرا دور اُن کے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ انگریزی میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ گفتگو کا موضوع وہی تھا، شہر کے جرائم۔ نئے پولیس افسر نے جسونت راؤ سے سرگوشی میں میرے متعلق پوچھا۔ جسونت راؤ نے انگریزی میں اُسے طنزیہ جواب دیا کہ "یہ راج کرشنا صاحب کی پخ ہے۔ پتہ نہیں کون شخص ہے۔ راج کرشنا اس کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ مشہور ہے کہ مستانہ کیس میں اِسی نے اُس کے اڈے میں گھس کے راج کرشنا کے لیے مخبری کی تھی۔ اس نے ایک موقع پر اُس کی جان بھی بچائی تھی۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔" سب کی طرح جسونت راؤ بھی یہ سمجھتا تھا کہ میں انگریزی سے نابلد ہوں اس لیے وہ اطمینان سے بات کرتا رہا۔ وہ راج کرشنا سے ملنے آیا تھا اور اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا پھر بھی راج کرشنا کے متعلق اُس کا لہجہ بہت گستاخانہ اور طنز آمیز تھا۔ میں ضبط کرتا رہا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دونوں راج کرشنا کو ایک پاگل پولیس افسر کا خطاب دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کسی دن اُس کے متعلق کوئی بہت بُری خبر آسکتی ہے کیونکہ مقامی پولیس کے تمام بڑے افسر اُس کی یہاں موجودگی اپنی توہین سمجھتے ہیں اور راج کرشنا نے بارہا اُن کی توہین کی بھی ہے۔ میں بُت بنا بیٹھا رہا۔ میں نے کسی طور یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اُن کی گفتگو مجھ تک منتقل ہو رہی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر راج کرشنا کا فوراً ہی تبادلہ نہ کیا گیا تو ہمیں جلد ہی اُس کا سوگ منانا پڑے گا۔ "شمبھو گروپ بہت ناراض ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "اور شمبھو گروپ کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ ایک حملہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے! مجھے شبہ ہے کہ وہ راج کرشنا کو زندہ مدراس واپس جانے دیں گے۔ بمبئی کی پولیس کا ایک بڑا سرکٹ بھی سکون کی سانس لے گا۔ یہ نہ تو مدراس ہے، نہ ہندوستان کا کوئی اور شہر



ہے، یہ بمبئی ہے۔ راج کرشنا اسے ایک معمولی شہر کی طرح برتتا ہے۔"

جسونت کا لہجہ مخاصمانہ تھا۔ اُس کے دل میں راج کرشنا کے متعلق بڑا کینہ بھرا ہوا تھا۔ بدخواہ ہی اس انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ راج کرشنا کے سامنے وہ بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ اُن کی باتیں سن کے میرے جسم میں انگارے سے بھر گئے۔ اتنی وحشت ہوئی کہ مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کمینے کو راج کرشنا سے برطرف ضرور کراؤں گا۔ مجھے اُس کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ خاصی دیر سے آیا مگر جسونت اُس کے انتظار میں بیٹھا رہا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے وہ گرگٹ کی طرح بدل گیا۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کھانا بھی میں نے یونہی سرسری کھایا۔ جیسے ہی ممیا مجھے دودھ کا گلاس پلا کے اپنے کمرے میں گئی، میں نے راج کرشنا کے دروازے پر دستک دی۔ وہ طمنچہ تانے برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے طمنچہ جیب میں رکھ لیا۔ "کیا بات ہے ظہیر؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"آؤ، آؤ، اندر آؤ، مگر دیکھو اچھی بات کرنا۔"

"آپ بمبئی چھوڑ دیں، اپنا تبادلہ کرا لیں۔"

"کیوں؟" وہ چونک کے بولا۔ "کیا تمھیں یہ شہر پسند نہیں آیا؟"

"میرے لیے ہر شہر یکساں ہے۔ میں آپ کے لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ مدراس چلے جائیے یا کسی اور شہر میں تبادلہ کرا لیجیے۔ یہاں مت رہیے۔"

"مگر کیوں، ایسی بھی کیا بات ہے؟" وہ میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔ "میں اپنا تبادلہ کبھی خود نہیں کراتا، اوپر سے حکم آتا ہے تو میں اُسے بدلوانے کی کوشش بھی نہیں کرتا مگر تم بتاؤ تم آخر کس سبب سے یہ مشورہ دے رہے ہو۔"

"بس میری بات مان لیجیے۔"

"ضرور مانوں گا، یقیناً کوئی خطرناک قسم کا فون آگیا ہوگا۔" وہ میری بات سنجیدگی سے نہیں سن رہا تھا۔ ہنس کے کہنے لگا۔ "پولیس کی ملازمت میں ایسی دھمکیاں اور کوششیں عام ہوتی ہیں۔"

"لیکن آپ انھیں محض دھمکیاں کہہ کے نہیں ٹال سکتے، ابھی کچھ دن ہوئے اُس دھمکی کو حقیقت میں بدلنے کے لیے پورا زور لگایا گیا تھا؟ آپ کو کلب کا واقعہ یاد نہیں رہا۔"

"میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا اور تم جانتے ہو میں پہلے سے خاصا محتاط

ہوگیا ہوں، ضروری کاموں کے سوا باقی تمام مصروفیات میں نے تقریباً ختم کردی ہیں ظہیر، بگڑی ہوئی چیزیں درست کرنا، اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پولیس والے اگر ان دھمکیوں سے متاثر ہونے لگے تو پولیس نے کاروبار کرلیا۔ میری زندگی کئی مرتبہ بال بال بچی ہے، تو کیا مجھے پولیس کی ملازمت ترک کردینی چاہیے؟"

"مگر میں ملازمت چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا ہوں میں تبادلے کے لیے کہہ رہا ہوں اور شہروں میں بھی بہت سے بگڑے ہوئے معاملے ہیں آپ وہاں جاکے کام کیجیے جہاں کام کی قدر ہو جہاں آستین میں سانپ نہ پلتے ہوں جہاں اپنے ہی لوگ جڑ کاٹنے کی فکر میں لگے ہوں، وہاں سے دست برداری ہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔"

"اپنے ہی لوگ!" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں وہی یہی آپ کے ساتھی۔"

"اوہ" وہ جیسے میری ساری بات سمجھ گیا ہنس کے بولا۔ "ظہیر ہر جگہ ایسا ہوتا ہے کوئی ادارہ اس برائی سے بچا ہوا نہیں ہے۔ انھی لوگوں میں کام کرنا پڑتا ہے تم نے ضرور کہیں میری برائی سن لی ہے۔"

"برائی ہوتی تو ٹھیک تھا مگر آپ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ لوگ آپ کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتے، وہ آپ سے نفرت کرتے ہیں" میں نے جھلا کے کہا۔

"بے شک" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے اس کا احساس ہے لیکن مجھے انھی لوگوں سے کام لینا ہے انھیں نظر انداز کرکے کام کرتے رہنا چاہیے۔"

"بہر حال میں نے بات آپ کے گوش گزار کردی ہے۔"

"اوہ نہیں" اس نے اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا۔ "میں اور احتیاط برتوں گا۔ کچھ ایسے ضروری کام نمٹانے ہیں کہ میری موجودی لازم ہے تم آخر اتنے پریشان کیوں ہوگئے ہو آخر تم نے کیا دیکھ لیا۔"

"ابھی ابھی جو لوگ آئے تھے آپ سے ملنے" میں نے جھجک کے کہا۔

"وہ آپ کے سامنے تو بہت ادب کر رہے تھے لیکن وہ آپ سے خوش نہیں ہیں، خوش کیا، وہ بہت برے لوگ ہیں، ان میں ایک، جسونت تو بہت کمینہ ہے۔"

"کیا انھوں نے تم سے کچھ کہا؟" وہ برہمی سے بولا۔

"کاش وہ مجھ سے کچھ کہہ دیتے۔"

"پھر۔۔۔؟"

"وہ آپ ہی کے متعلق باتیں کرتے رہے" میں نے اسے وہ تمام باتیں بتادیں جو جسونت اور اس کے ساتھ آنے والے افسر کے درمیان ہوئی تھیں۔

راج کرشنا کا چہرہ بجھ گیا۔ "مگر، مگر کیا وہ یہیں یہ سب کہہ رہے تھے؟" وہ تمتماتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں!"

"تمھارے سامنے؟"

"ہاں میرے سامنے" میں نے تندی سے کہا۔ میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اپنی ہی بات سے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

"مگر، مگر یہ کیسے ممکن ہے!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

ایک لمحے کے لیے میرا سارا وجود سرد پڑ گیا۔ اسے کیا بتاؤں کہوں کہ وہ بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اتنے بیوقوف تھے کہ ہمارے گھر اور ہم لوگوں کی موجودی میں تندومد سے ہماری برائیاں کر رہے تھے وہ گویا پاگل ہوگئے تھے۔ ہر چند میں نے اسے چمپا والی بات بتانے سے گریز کی تھی جسونت کو معلوم تھا کہ چمپا ایک طوائف ہے جسے راج کرشنا نے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ راج کرشنا کی بے احتیاطی کا یہی انجام ہونا تھا۔ میں پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ بلاواسطہ اس کا ایرانی جوکر کے ہوٹل میں چمپا کا سامان لینے کے لیے جانا مناسب نہیں ہے مگر میں نے جسونت سے سنی ہوئی باقی تمام باتیں اسے بتادی تھیں اور اس کا یہ سوال کرنا بالکل جائز تھا کہ جسونت کو میری موجودی میں اس ہرزہ سرائی کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ میری زبان پتھر ہوگئی کہ میں اسے کیا بتاؤں۔ کوئی معمولی بات ہوتی تو میں کچھ بھی بہانہ کردیتا لیکن اس کا تعلق راج کرشنا کی زندگی سے تھا، اسے یقین آنا چاہیے تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے کانوں کا بھیانک خواب نہیں ہے۔ "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں ویسے مجھے جسونت سے کوئی دشمنی نہیں ہے" میں نے دل کڑا کیا۔ "وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔"

"انگریزی میں!" وہ سٹ پٹا کے بولا۔

"میں نے آپ سے چھپایا تھا، میں انگریزی جانتا ہوں۔"

"کیا۔۔۔؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ اچھل کے بولا۔

"میں اسی لیے آپ سے کہتا تھا کہ آپ مس جولین پر پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ بس وہ باتیں کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

اس نے مجھے دبوچ لیا۔ "ظہیر! کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں" میں نے گردن جھکا کے کہا۔

"اوہ! تم نے دو متضاد خبریں سنائی ہیں" اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "میں بتا نہیں سکتا" وہ بہکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم نے مجھے کتنا چونکایا ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں میں نے آپ سے بہت چھپایا۔"

"مجھے حیرت تھی کہ تم کتابوں کے بغیر اتنی عجیب باتیں کیسے کر لیتے ہو تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"یہی ایم اے کیا ہے۔"

"اور یقیناً فرسٹ کلاس لی ہوگی؟" میں نے نظریں نیچی کرلیں۔ "اوہ

میری جان" اُس نے کھڑے ہو کے مجھے گلے لگا لیا۔"تم نے مجھ پر اعتبار کیا۔ مجھے بتا دیا۔"

"اب آپ کچھ اور مت پوچھیے۔"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں، میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ میں تمھیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گا، مجھے یقین ہے، ایک دن تم سب کچھ مجھے بتا دو گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر آپ تبادلہ کرا لیجیے، میں نے اچھی باتیں نہیں سُنی ہیں۔"

"میں اپنا کام جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش کروں گا، بے فکر رہو۔ ابھی میں کچھ اور زندہ رہوں گا، ابھی مجھے تمھارے ساتھ بہت سی سیر کرنی ہے۔"

میں اُس کی اور بہت سی باتوں سے بچنے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ وہ مجھے روکتا رہ گیا۔ میں نے غلطی کی تھی، اِس کا احساس مجھے فوراً ہی ہو گیا۔ میں نے ظہیر خاں کے نام سے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ ڈگری بھی ابھی جیل میں پڑی تھی، راج کرشنا کے لیے ہندوستان کی گنتی کی چند یونیورسٹیوں سے یہ پتہ چلا لینا کون سا مشکل تھا کہ ظہیر خاں نامی طالب علم نے کب ایم اے کیا ہے اور جب اُسے پتہ چلتا کہ میں نے جیل سے امتحان دیا تھا اور میں قتل کے الزام میں سات سال کی سزا کاٹ رہا تھا اور بُھل نامی شخص میرا کفیل تھا مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے گناہ کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اپنی مالا گلے سے اُتار کے چہرے پر ڈال لی، تب کہیں مجھے کچھ سکون ہوا۔

صبح میں اُس سے آنکھیں ملانے سے گریز کرتا رہا۔ ناشتے کی میز پر وہ بہت خوش تھا جیسے میرے امتحان کا نتیجہ آج ہی نکلا ہے، وہ انگریزی میں مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ آج سے اپنی رپورٹ تیار کرنے میں زیادہ وقت صرف کرے گا۔ "میں ایک لمبی چھٹی کی درخواست دوں گا اور ہم گھومتے رہیں گے۔" چمپا بھی حیران تھی کہ آج وہ مجھ سے دوسری زبان میں کیوں مخاطب ہے، میں کوئی جواب دیے بغیر ناشتے کی میز سے جلد ہی اُٹھ آیا، اُس کی ہنسی نے کمرے تک میرا تعاقب کیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے چمپا سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ باورچی خانے میں موجود تھی۔ میں نے سوچا وہ باہر آ جائے تو اُس سے کہوں کہ وہ کہیں اور چلی جائے کیونکہ اس کی موجودگی راج کرشنا کی رُسوائی کا سبب بن رہی ہے۔ وہ باہر آ کے کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ اُس نے پہلے غلاف بدلے، چادریں تبدیل کیں، ڈرائنگ روم کی میز پر تازہ پھول سجائے راج کرشنا کے کمرے میں جا کر اُس کا بستر درست کیا۔ میں سوچتا ہی رہا اور بنگلے سے باہر چلا آیا۔ شہر کی سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ آج بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ جب میں گھر آیا تو خلافِ معمول جولین موجود تھی۔ ہری ساڑی میں اُس کا رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میرے ساتھ سینی ٹوریم چلو۔ میں نے کہا، چلو مجھے کیا کام ہے۔ واپس آ کے بھی وہ دیر تک رُکی رہی اور کہیں رات کو واپس گئی۔

رات بہت ہو گئی، راج کرشنا گھر نہیں آیا۔ ہم لوگوں نے اُس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ رات کو کوئی ایک بجے کے قریب موٹر رُکنے کی آواز آئی، میں بھاگا ہوا گیا مگر وہ راج کرشنا کی موٹر نہیں تھی۔ ایک پولیس افسر تیزی سے اُترا، میں اُسے جانتا تھا، وہ ایس پی شکلا تھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اُس نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔

"کہاں ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آؤ، کرشنا جی کے پاس۔"

"وہ کہاں ہیں ؟"

"وہ کرسچین اسپتال میں ہیں، زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے، جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" وہ مجھے موٹر میں دھکیلتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے، آپ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے ؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"کرشنا جی زخمی ہو گئے ہیں۔"

"زخمی! کہاں، کیسے ؟" میری آواز دہل گئی۔

"ان پر حملہ کیا گیا ہے۔" شکلا نے مختصر جواب دیا۔

میرا سینہ بند ہونے لگا۔ اسپتال میں پولیس افسروں کا ہجوم تھا۔ مجھے فوراً ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا، سامنے راج کرشنا پڑا تھا، اُس کے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے چکر آنے لگا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور راج کرشنا کی آنکھیں کھول کے دیکھنے لگا۔ پھر مجھے اپنے پاس بُلایا، میں بے جان قدموں سے اُس کے پاس گیا اور راج کرشنا کے جسم سے لپٹ گیا۔ میری آہ و بکا سے اُس کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اُس نے کراہ کے میرا نام لیا، اپنی لرزتی ہوئی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور اُکھڑی ہوئی ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا "وقت کم ہے لاڈلے۔ تم، تم سچ کہتے تھے، مجھے افسوس ہے میں تمھارے کام نہ آ سکا۔ میں نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے، میں، میں نے تمھارے بابا صفدر زماں خاں کو تلاش کرنے کے لیے ہر جگہ سرکلر بھیج دیا ہے۔ میں خود تمھیں اُن کے پاس بھی لے چلتا مگر ــ سب ٹھیک ہو جائے گا، ہمت رکھنا لاڈلے !"



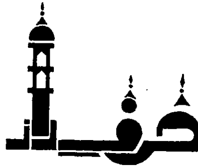
بازی گر

سینہ فگاروں کے لیے
ایک نوجوان کا فسانۂ عبرت
بابر زماں خاں کی
آپ بیتی ، جگ بیتی
باقی آیندہ شمارے میں
ملاحظہ فرمائیں

اِس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

شیخ عبدالقدوس گنگوہی	لطائفِ قدوسی	اخبار الاخیار	خزینۃ الاصفیا
اعجاز الحق قدوسی	شیخ رکن الدین	عبدالحق محدث دہلوی	غلام سرور لاہوری

ابوالمنصور سرمدی



فجر کی نماز ہو چکی تھی۔ نمازیوں کے حلقے میں ایک باریش بزرگ سرمستی سے وحدت الوجود کے رموز بیان کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "لوگو! وحدت الوجود کا تعلق وجودِ مطلق کے اسرار سے ہے۔ اس حقیقت کا علاقہ باطنی سرفرازی اور مخفی مرتبے سے ہے اور ہر شخص ہر مرتبے کا سزاوار نہیں ہوتا۔ پورا درخت ایک ہی تنے سے وابستہ ہوتا ہے لیکن پھول صرف پھول سے، پتا صرف پتا ہے اور خار صرف خار۔ چونکہ وحدت الوجود، وجودِ مطلق کے اسرار میں شامل ہے لہٰذا اس کا اظہار کفر ہے۔ یاد رکھو، جب بھی کوئی منصور کہیں نعرہ زن ہو گا کہ انا الحق انا الحق تو اس کا سر تختۂ دار پر ضرور پہنچے گا، تاہم یہ بھی جان لو کہ مسائل کی نوعیت مختلف ہے۔ معذور کا مسئلہ کچھ اور ہوتا ہے، تن درست کا کچھ اور۔ شریعت علیحدہ ہے، طریقت علیحدہ ہے اور حقیقت علیحدہ۔ شریعت لا معبودَ الاّ اللہ، طریقت لا مقصودَ الاّ اللہ اور حقیقت لا موجودَ الاّ اللہ۔"

مجمع میں اس بزرگ کے تین بیٹے بھی موجود تھے۔ انھوں نے اپنے باپ سے دریافت کیا: "بابا جان! وحدت الوجود کے باب میں آں حضرتؐ اور اُن کے صحابہ کی جانب سے کوئی تصریح نہیں ملتی اور نہ شارع کے نزدیک اس مسئلے پر دین کا مدار ہے، نہ اس کے متعلق کوئی وضاحت ہے۔ اس کے باوجود وحدت الوجود پر شدت اختیار کی جاتی ہے اور اسے عقیدے کا ایک جزو تصور کیا جاتا ہے۔ ہمیں آنکھیں دیجیے کہ کہیں اس روش پر جزا و سزا کے روز مواخذہ تو نہیں ہو گا؟"

بزرگ نے تحمل سے جواب دیا: "فرزندو! بے شک یہ مسئلہ شریعت میں صراحت سے نہیں ملتا تاہم اشارت النص اور دلالت النص سے اس کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے، علمائے ظاہر اسے متشابہ سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ تبع تابعین کے زمانے میں پیدا ہوا ہے مگر وہ زمانہ بھی خیرالقرون میں شامل ہے۔ جو بزرگ یہ مسئلہ روشنی میں لائے تھے، وہ اپنے دور کے مجتہد اور دین کے صالح مقتدی تھے۔ علمائے ظاہر ہر معاملے میں انھی سے رجوع کرتے تھے۔ اگر یہ مسئلہ شریعت کے خلاف ہوتا تو امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابویوسف، امام محمد اور دوسرے ائمہ، مشائخ اور موحدین یقیناً کہتے کہ یہ مسئلہ شریعت کے خلاف ہے، وہ اس پر سکوت اختیار نہ کرتے بلکہ اس کے بطلان اور رد پر شدت اختیار کرتے۔ حق پر سکوت اختیار کرنے والا گونگا شیطان ہوتا ہے۔ البتہ اس مسئلے میں اختلاف ضرور ہے۔ بعض زہاد کثرتِ وجود کے اور بعض وحدتِ وجود کے قائل ہیں۔ جو لوگ کثرتِ وجود کے قائل ہیں، وہ حق کی ذات کو ماورا الوجود کہتے ہیں جس کا ہماری عقل ادراک نہیں کر سکتی اور جو لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں، وہ حق کی ذات کو وجودِ مطلق قرار دیتے ہیں۔"

اس گفتگو نے اتنا طول کھینچا کہ فجر سے دوپہر کا وقت ہو گیا اور جب مجلس برخاست ہوئی تو اس بزرگ کو یک بارگی جلال آ گیا۔ اس نے اپنے بیٹوں سے کہا: "تمھارے دریچے بند ہیں۔ تم معرفت میں ناقص اور وحدت الوجود کے منکر ہو۔ ثابت ہوا کہ تمھارا مسلک علیحدہ ہے اور ہمارا مسلک علیحدہ۔ اب ہمارا اور تمھارا ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تمھارے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں۔ استغفار، استغفار، استغفار۔"

یہ کہہ کے وہ بزرگ جوش و مستی کے عالم میں پیدل وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جلال کے باعث کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ سب لوگ خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ پیچھے پیچھے چلنے والوں میں اس کے بیٹوں اور معتقدوں کے علاوہ شہر گنگوہ کا داروغہ امیر شاہ بھی شامل تھا۔

سب رنگ

بزرگ آدھے کوس تک بے تکان چلتا رہا۔ اُس کا رُخ کسی دوسرے شہر کی طرف تھا۔ آدھے کوس کی مسافت کے بعد اُسے ایک گھوڑا پیش کیا گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہونے سے انکاری تھا لیکن بیٹوں اور ارادت مندوں کے اصرار پر اُسے سوار ہونا پڑا۔ گھوڑے کی باگ تھامتے ہی اُس نے کہا: "اچھا الوداع۔ اب ہم تھانیسر جا رہے ہیں۔ تھانیسر پہنچ کے ہم جلال سے پوچھیں گے کہ وہ کیا مسلک رکھتا ہے؟ اگر اُس کی بصارت بھی زائل ملی تو دیکھ لینا ہم اُس سے بھی کنارہ کش ہو جائیں گے۔" جلال اُس بزرگ کے ایک خاص اور محبوب مُرید کا نام تھا۔ اُس کی اقامت تھانیسر میں تھی۔

گھوڑا میانہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ بیٹے اور معتقد اُس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے، کچھ لوگ پیدل بھاگ رہے تھے اور سب کی مکمل توجہ صرف بزرگ کی طرف تھی اس لیے کسی کو نہ تھکن کا احساس ہو رہا تھا نہ مسافت کا۔ یہاں تک کہ قصبہ لکھنوتی آیا اور وہ بھی گزر گیا۔ اب گنگوہ کے لوگوں میں لکھنوتی کے لوگوں کا اضافہ بھی ہو گیا تھا لیکن بزرگ کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں چنانچہ کسی کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اُس کے گھوڑے کی باگ تھام لیتا یا اُس سے رُکنے کی درخواست کرتا۔ قافلہ لشتم پشتم آگے بڑھتا رہا۔ چلتے چلتے جب دریا قریب آنے لگا تو داروغہ کے اشارے پر بعض لوگوں نے تیز رفتاری سے آگے بڑھ کے ملاحوں کو متنبہ کر دیا کہ وہ کوئی کشتی کنارے پر نہ لائیں۔ ملاحوں نے اُن کی بات مان لی لیکن یہ پیش بندی بھی کارگر نہیں ہوئی۔ بزرگ کے تیور بدستور بدلے رہے۔ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنا گھوڑا بے دریغ دریا میں ڈال دیتا۔ اس نازک مرحلے پر گنگوہ کے داروغہ نے جرأت کی اور آگے بڑھ کے بزرگ کے گھوڑے کے پاؤں پکڑ لیے اور الحاح وزاری سے کہنے لگا: "حضرت کا گنگوہ سے ناراض ہو جانا معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہ خبر ظلِ الٰہی شہنشاہ ہمایوں کو پہنچے گی تو وہ یہ خیال فرمائیں گے کہ شاید اُن کے داروغہ سے حضرت کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی ہے اور ممکن ہے اِس جرم کی پاداش میں مجھے اپنا سر دینا پڑے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھوں سے اس بے قصور کی زندگی نچوڑ لیجیے۔ غلام کی گردن حاضر ہے۔"

داروغہ کی فریاد بارآور ثابت ہوئی۔ بزرگ کی پیشانی ہموار ہو گئی اور آنکھوں میں شعلوں کے بجائے چاندنی چھلکنے لگی۔ داروغہ نے اب دیدہ ہو کے گھوڑے کی باگ تھامی اور اُس کا رُخ گنگوہ کی طرف کر دیا۔

گنگوہ پہنچ کے بھی ناراض بزرگ اپنے بیٹوں کی طرف ملتفت نہیں ہوا۔ وہ اُن کی امامت میں نماز بھی نہیں پڑھتا تھا۔ کہتا تھا: "ان کا مسلک علیحدہ ہے ہمارا مسلک علیحدہ۔ اِن کے پیچھے نماز کیسے درست ہو سکتی ہے۔"

بیٹوں نے معذرت خواہی کی ہر تدبیر آزمائی لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اسی کشمکش میں تین روز گزر گئے۔ آخر تھانیسر سے اُس بزرگ کے خاص مرید جلال کو گنگوہ بلوایا گیا کہ شاید اُس کی سفارش کام آئے اور ماند پڑے ہوئے ستارے پھر چمک اُٹھیں۔ جلال نے گنگوہ پہنچ کے اپنے شیخ کی قدم بوسی کرنی چاہی لیکن اُسے آگے بڑھتے دیکھ کر بزرگ نے دبدبے سے کہا۔ "جلال! اپنی جگہ کھڑا رہ اور یہ بتا کہ وحدت الوجود کے سلسلے میں تیرا نقطۂ نظر کیا ہے؟"

جلال نے ادب سے جواب دیا: "حضور! کیا شعاع اپنے آفتاب سے ہٹ کے کوئی سمت متعین کر سکتی ہے؟ کیا مرشد کے ہوتے ہوئے مرید کا کوئی نقطۂ نظر ہو سکتا ہے؟" یہ کہہ کے جلال نے وحدت الوجود کی تائید میں مشائخ کے بہت سے اقوال دُہرائے۔

بزرگ نے اُٹھ کے اپنے سعادت مند مرید کو سینے سے لگا لیا۔ اس موقع پر بزرگ کے ایک بیٹے علی نے وحدت الوجود کے متعلق کچھ اشعار پڑھے۔ محفل پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور بزرگ کی زبان سے عشق و توحید کا چشمہ بہنے لگا۔



اُس بزرگ کا نام عبدالقدوس تھا۔ وہ ۸۶۰ ہجری میں ردولی کے ایک مشہور صاحبِ ارشاد عالم شیخ اسمٰعیل کے گھر پیدا ہوا۔ شیخ اسمٰعیل نے ابتدا ہی سے اُس کی پتلیوں پر نظر رکھی اور اُسے مختلف سمتیں سمجھانے کے لیے خصوصی توجہ صرف کی۔ اُن کی توجہ رائگاں نہیں گئی۔ قدوس نے اس امر کا پورا ثبوت دیا کہ وہ اُن کا سب سے ہونہار بیٹا ہے۔ وہ طالب علمی ہی میں دن دن بھر کتابوں سے کھیلتا اور رات رات بھر عبادت کے گہوارے میں جاگتا رہتا۔ اُس کی زندگی کا پرکار علم کے نقطے سے شروع ہو کے عبادت کے نقطے تک پہنچتا اور عبادت کے نقطے سے شروع ہو کے علم پر ختم ہوتا۔ وہ علم و عبادت کے دائرے میں پھولتا پھلتا اور پھیلتا رہا۔ اُسے دیکھ کے شیخ اسمٰعیل کی آنکھیں منور ہو جاتی تھیں۔ اہلِ خانہ قدوس پر رشک کرنے تھے۔

شیخ اسمٰعیل کی عمر اٹھتر سال کی ہوئی تو ایک روز انھوں نے اپنے چاروں بیٹوں کو جانشینی کے سلسلے میں اپنے گرد جمع کیا۔ قدوس اُن کا پہلا نہیں، دوسرا نہیں بلکہ تیسرا بیٹا تھا پھر بھی ہر نگاہ اُسی پر جمی ہوئی تھی اور تمام ہونٹ اُس کی دست بوسی کے لیے مچل رہے تھے۔ شیخ اسمٰعیل نے نحیف آواز میں اپنے بیٹوں کو مخاطب کیا: "فرزندو! تم اپنے بوڑھے باپ کا عصا ہو اور اُس کے دست و بازو ہو۔ جانتے ہو آج ہم نے تمھیں کیوں یک جا کیا ہے؟"

سب کی نظریں بے اختیار قدوس کی طرف اُٹھ گئیں۔ قدوس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شیخ اسمٰعیل نے باری باری سب کی طرف دیکھا پھر اپنی سجادگی کے لیے قدوس کے بجائے یک لخت اپنے سب سے بڑے بیٹے کے نام کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اتنا غیر متوقع تھا کہ مبارک سلامت کی آوازیں حاضرین کے سینوں میں گھٹ کے رہ گئیں اور وہ سب حسرت سے قدوس کا چہرہ تکنے لگے۔ قدوس نے پہلی بار سر اُٹھایا۔ لوگوں نے اُس کے چہرے پر اضطراب و

تذبذب کے بجائے سکون و بشاشت کا مشاہدہ کیا۔ شیخ اسماعیل شفقت سے بولے "قدوس! بیٹے قریب آؤ۔"

قدوس نے آگے بڑھ کے اُن کے ہاتھ چومے۔ انھوں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہا "سنو! دل غنی رکھنا۔ تمھارا حصہ ہمارے پاس نہیں ہے، کسی اور کے پاس ہے۔"

قدوس نے کہا "باباجان! یہی حصہ کیا کم ہے کہ میں آپ کا بیٹا اور آپ کے سجادہ نشین کا بھائی ہوں۔"

شیخ اسماعیل نے نصیحت کی "بیٹا! صرف کسی کا بیٹا اور کسی کا بھائی ہونا کافی نہیں ہوتا، جو حصہ تمھارا مقسوم ہے، خود کو عملاً اُس کے لیے تیار کرو۔"

قدوس نے باپ کی نصیحت فراموش نہیں کی اور اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کی سُجھائی ہوئی راہ پر اس طرح گام زن رہا جیسے وہ اُس کی اُنگلی تھامے ہوئے ہوں۔ تعلیمی دور ہی میں اُس نے صَرف کے علم پر سوال و جواب کی صورت میں ایک کتاب تصنیف کی اور اُس کا نام "بحرالانشعاب" رکھا۔ یہ اُس کی پہلی تصنیف تھی۔ کتاب دیکھ کے وقت کے کاملِ فن اساتذہ نے یہ تبصرہ کیا کہ "علمِ صَرف میں یہی ایک کتاب کافی ہے۔" پھر قدوس نے اپنے اساتذہ کی دقیق تقریریں جمع کر کے اُنھیں شرح کی صورت میں مدوّن کیا۔

یہ سلسلہ تشفی بخش طور پر جاری تھا کہ ایک روز اچانک قدوس کے متلاطم سینے میں آگ بھڑک اُٹھی۔ اُس پر جذب کی غیر معمولی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس نے بے اختیار گریبان چاک کیا، کتابیں پھاڑیں اور مدرسے کی حدود پھلانگ گیا۔ وہ مستانہ نعرے بلند کرتا ہوا دیوانہ وار کسی طرف چلا جا رہا تھا۔ راستے میں اُس کے ایک پرانے اُستاد شیخ فتح اللہ نے اُسے حیرت سے دیکھا اور روک لیا۔ "قدوس! یہ تم ہو؟" قدوس کے جسم پر خرقہ جھول رہا تھا اور وہ چمڑے کا ایک تکیہ لیے ہوئے تھا۔ شیخ فتح اللہ نے پوچھا "یہ کیا مداریوں کا سا لباس پہنا ہے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے قدوس؟"

قدوس نے مختصراً جواب دیا "میں اُن مداریوں میں سے نہیں ہوں۔" وہ آگے بڑھنے لگا۔ اُستاد نے پھر روک لیا۔

"خوب۔" شیخ فتح اللہ بے یقینی سے اُسے دیکھ رہے تھے "بھئی ہم تو تمھاری قابلیت، جودت اور طبّاعی کی سب سے تعریفیں کرتے ہیں اور تم نے یہ حلیہ بنا رکھا ہے۔ کیا ہمیں جھٹلانے پر تُل گئے ہو۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہو یا نہیں؟" قدوس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شیخ فتح اللہ نے دریافت کیا "آج کل کون کون سی کتابیں ہیں مطالعے میں؟"

قدوس نے لہرا کے کہا "حیرانی کی کتاب۔" یہ کہہ کے وہ دوڑتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔ پھر اُسے مدرسے جاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔

ماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ اُس کے بیٹے نے کتابیں پھاڑ دی ہیں اور مدرسہ چھوڑ دیا ہے تو بیوگی کا صدمہ از سرِ نو تازہ ہو گیا۔ وہ روتی ہوئی اپنے بھائی قاضی دانیال کے پاس پہنچی۔ قاضی دانیال ردولی کے حاکم تھے۔ قدوس کی ماں نے اُن سے کہا "بھیا! کچھ سُنا؟ آپ کے بھانجے صاحب ہاتھوں سے گئے۔ انھوں نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا ہے۔"

قاضی دانیال ششدر رہ گئے۔ یہ خبر اُن کے لیے بھی صدمے کا باعث تھی۔ اُنھوں نے اُسی وقت اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ "قدوس جہاں کہیں بھی ہو اُسے تلاش کر کے ہمارے سامنے لاؤ۔"

کارندوں نے کچھ دیر کی دوڑ دھوپ کے بعد قدوس کو اُس کے ماموں کے سامنے پیش کر دیا۔ قاضی دانیال نے اُسے دیکھتے ہی کسی تمہید کے بغیر تعلیم ترک کرنے کے سلسلے میں باز پرس کی اور کہا کہ "اگر تم پڑھو گے نہیں تو ہم تمھیں سزا دیں گے۔"

قدوس مچل گیا "ہم سزا لیں گے، سزا لیں گے۔ تاخیر نہ کیجیے ہم سزا لیں گے۔"

قاضی دانیال گو مگو میں مبتلا ہو کے غور سے اپنے بھانجے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ اسی اثنا میں دفعتاً کہیں سے گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ آوازیں سُن کے قدوس کی حالت غیر ہو گئی۔ اُس پر وجد و حال کا غلبہ ہونے لگا۔ قاضی دانیال نے اُس کا یہ عالم دیکھا تو اپنی بہن سے کہا "ہمشیرہ! قیس کو صحرا ہی راس آتا ہے۔ آبادیاں اُس کے لیے زنجیر نہیں بن سکتیں۔ اپنے بیٹے کو اُس کے حال پہ چھوڑ دو۔ تردّد کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔"

قدوس مستقلاً مجذوبوں اور قلندروں میں گھومنے لگا۔ ردولی میں ایک مجذوب تھے، اُنھیں یونس دیوانہ کہا جاتا تھا۔ وہ جب بھی قدوس کو دیکھتے "یا زاہد! یا زاہد" کہہ کے اُسے پکارتے اور کہتے "دیکھو مقلا اِس قدر بلند کرو جیسا ابراہیم اَدھم نے کیا تھا۔" ایک دن یونس دیوانہ نے اُس سے پوچھا "زاہد! خدا اگر جنت و دوزخ پیدا نہ کرتا تو شاید بندے اُس کی عبادت نہ کرتے۔ ہے نا؟"

قدوس نے عاقلانہ انداز میں جواب دیا "جنت خدا کا فضل ہے اور دوزخ اُس کا عدل۔ اگر اُس نے بندے پر فضل کیا تو اُسے جنت میں لے جائے گا اور اگر عدل کیا تو دوزخ میں لے جائے گا۔" یونس دیوانہ یہ جواب سُن کے رونے لگے۔

ردولی کے ایک اور مجذوب میاں تاجن ہوش و خرد سے عموماً بیگانہ رہتے تھے لیکن وہ قدوس سے تنہائی میں جب بھی ملتے تو اُن میں جذب و دیوانگی کے آثار باقی نہ رہتے۔ پھر جیسے ہی کوئی دوسرا شخص پہنچتا، وہ دوبارہ جذب و دیوانگی میں چلے جاتے۔ گویا مجذوبوں کی نظر میں قدوس کو شرع سے دوسروں کی نسبت امتیاز حاصل تھا۔

ایک دفعہ قدوس نے شیخ بہاالدین زکریا اور بابا فرید گنج شکر کی زیارت کے لیے ملتان کا سفر کیا۔ چلتے چلتے وہ دیپال پور پہنچا۔ دیپال پور میں ابراہیم نامی ایک مجذوب مقیم تھے۔ وہ علمائے ظاہر کے ساتھ نہایت سختی

سے پیش آتے تھے۔ اُن کی دہشت کے باعث علما اُن کے پاس جانے سے کتراتے تھے مگر جب قدوس سے اُن کا سامنا ہوا تو وہ اُس کے استقبال کے لیے اُٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ قدوس اُن کے قدموں پہ گر گیا۔ ابراہیم نے گھبرا کے اُسے قدموں سے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں اُٹھا۔ ابراہیم بولے "استغفراللہ! استغفراللہ!" انھوں نے قدوس کو پہلو میں دبا کے زبردستی قدموں سے اُٹھایا اور کہنے لگے "حق یہی ہے حق یہی ہے خدا خوب جانتا ہے"۔

قدوس نے اُن سے درخواست کی "حضرت! دُعا!"

ابراہیم نے لرز کے جواب دیا "شیخ! خدا خوب جانتا ہے۔ میں تو خود دُعا کا محتاج ہوں!"



عشق دیوانہ وار سفر کرتا رہا۔ ایک روز قدوس بیخودی میں ردولی سے نکل کے کسی دوسری طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک شخص نے اُسے روک کے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟"

قدوس نے اُسے اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا "خدا کے شہر کا"۔

"اچھا" وہ شخص مسکرایا "شیخ عبدالحق کی درگاہ میں جا"۔ شیخ احمد عبدالحق صابری چشتی سلسلے کے مشہور بزرگ تھے۔ اُن کی درگاہ ردولی ہی میں تھی۔ وہاں اُن کے پوتے شیخ محمد سجادہ نشین تھے۔

راہ گیر کی بات نے قدوس پر غیر معمولی اثر کیا۔ وہ یک بہ یک مڑا اور پھر اُس کے قدم شیخ عبدالحق کی درگاہ میں جا کے ٹکے۔ وہاں درگاہ کا ایک خادم ایک درویش شاعر مسعود بک کا دیوان پڑھ رہا تھا۔ قدوس کو دیکھتے ہی اُس نے دیوان چھپا لیا۔ قدوس نے نرمی سے کہا "میاں! ہم سے کیا پردہ داری۔ ہماری آنکھیں دیکھ رہے ہو؟"

قدوس کی آنکھوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ خادم نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً اُٹھ کے اُس سے مصافحہ کیا اور کہا "سچ کہا بھائی! سچ کہا دوستی پردے خاطر میں نہیں لاتی۔ بھلا آپ سے کیا پردہ داری"۔

پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے سے اس قدر بے تکلف ہو گئے کہ قدوس اکثر وہاں جانے اور شیخ عبدالحق کی روح سے فیوض حاصل کرنے لگا۔ وہ اپنا بیشتر وقت درگاہ میں گزارتا اور دل کی تپش بڑھنے لگتی تو ویرانوں، جنگلوں اور بیابانوں کی طرف نکل جاتا یا مختلف مقبروں کی زیارت کرتا۔ اس آبلہ پائی میں جب اُس پر بیخودی طاری ہوتی اور تہجد کا وقت آتا تو شیخ عبدالحق بہ نفسِ نفیس نمودار ہو کے اُسے غفلت سے بیدار کرتے اور اُس کی سماعت "حق حق حق" کی صداؤں سے لبریز ہو جاتی۔

سجادہ نشین شیخ محمد، قدوس کے ہم عمر تھے۔ نیز قدوس اُن کے دادا سے براہِ راست فیض یاب ہو رہا تھا اس لیے اُسے شیخ محمد سے وہ عقیدت نہیں تھی جو کسی طالب کو مطلوب سے ہوتی ہے۔ وہ کسی اور کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا خواہاں تھا لیکن اس سلسلے میں وہ جب بھی کوئی عملی قدم اُٹھاتا، شیخ عبدالحق کی آواز آتی "قدوس! ٹھیر جا۔ تو ہمارا ہے۔ جاتا کہاں ہے؟ تو ہمارا ہے"۔

جب یہ معاملہ بار بار پیش آیا تو ایک روز قدوس تڑپ اُٹھا "حضرت! بے شک میں آپ کا ہوں لیکن اگر میں کسی اور سے بیعت ہو جاؤں تو کیا وہ مجھے آپ سے چھین لے گا؟"

معاً شیخ عبدالحق مجسم ہو کے اُس پہ ظاہر ہوئے اور بولے "کسی اور سے بیعت کا کیا سوال ہے۔ کیا ہم مُردہ ہیں؟"

قدوس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اُس سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ شیخ عبدالحق نے اُس کا ہاتھ تھام کے اپنے سجادہ نشین پوتے شیخ محمد کے ہاتھ میں دے دیا۔ قدوس مضطربانہ اُن کے مُریدوں میں شامل ہو گیا۔ اُس نے اپنے مرشد کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور عاجزانہ کہا "شیخ! مجھے تھام لیجیے"۔

شیخ محمد اپنے دوسرے مُریدوں کے برعکس اُس کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آئے اور کہنے لگے "برادر! آپ تو خود شیخ ہیں۔ خود کو ہماری نگاہ سے دیکھیے۔ ہم آپ کا حال ہیں لیکن آپ ہمارا استقبال ہیں"۔

اس طرح شیخ قدوس اور شیخ محمد مرید و مرشد ہونے کے باوجود ہم رُتبہ رفیقوں کی طرح عبادت و ریاضت میں منہمک ہو گئے۔ شیخ قدوس نے بیعت کے ابتدائی زمانے میں سخت مجاہدے کیے۔ وہ شیخ عبدالحق کے روضے میں خود جھاڑو دیتے، خانقاہ کے درویشوں کی لکڑیاں لاتے اور مزار پر طویل طویل چلّے کھینچتے۔ چلّوں کے دوران میں وہ اپنے نفس کو دانے اور پانی سے قطعی محروم رکھتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پیٹ کی طلب اور اندرونی شورش کے باعث اُن کے دماغ سے نکلنے والی بھاپ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ سرما کے موسم میں برف منجمد ہوتا مگر اُن کی قلبی حدت میں کمی نہ آتی۔ اُن کے سر پر ٹھنڈے باسی پانی کی کئی مشکیں ڈالی جاتیں پھر بھی پانی میں برودت کی کیفیت پیدا نہ ہوتی۔ اُن کے سر پر ڈالا جانے والا پانی انھیں تو کیا ٹھنڈک پہنچاتا، خود گرم ہو جاتا تھا۔ اُن دنوں وہ ایسے مقامات پر بھی کثرت سے رہے جو حشرات الارض کے مرکز تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے جسم کو شدائد اور اذیتوں کا خوگر بنایا۔ اُن کے حجرے میں اکثر نہایت خطرناک سانپ دیکھے جاتے لیکن وہ بے خوفی سے عبادت میں مصروف رہتے۔

ایک جمعرات کا ذکر ہے۔ شیخ عبدالحق کی درگاہ زائرین سے بھری ہوئی تھی۔ شیخ محمد اور شیخ قدوس مجمع میں سب سے نمایاں تھے۔ اوراد و وظائف کا غلغلہ ہر آواز پہ محیط تھا ناگاہ حاضرین نے دیکھا کہ شیخ عبدالحق کا روضہ شق ہوا اور وہ ظاہری جسم کے ساتھ مزار سے برآمد ہوئے۔ کئی لوگ اس منظر کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو کے گر پڑے۔ شیخ محمد اور شیخ قدوس تعظیماً کھڑے ہو گئے شیخ عبدالحق نے شیخ قدوس کی طرف متوجہ ہو کے فارسی کا یہ شعر پڑھا ۔

مرا زندہ پندار چوں خویشتن
من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

شیخ قدوس لرزہ بر اندام ہو کے اُن کے قدموں پر گر پڑے۔ شیخ عبدالحق نے شفقت سے اُن کا ہاتھ تھاما اور کہا۔ ”قدوس! ہم نے تجھے خدا تک پہنچا دیا۔“

نہ صرف ردولی بلکہ اطراف و جوانب کی تمام آبادیوں میں شیخ قدوس کا شہرہ پھیل گیا تھا۔ لوگ تجسس اور اشتیاق سے آپس میں اُن کا ذکر کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ شیخ عبدالحق کی خانقاہ میں ایک عجیب درویش رہتا ہے۔ اُس کے گلے میں ایک گدڑی پڑی رہتی ہے اور گدڑی میں بیسیوں پیوند لگے ہوتے ہیں۔ سر پر جو ٹوپی ہے، وہ بھی مختلف پیوندوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ اپنی گدڑی میں روزانہ ایک نیا پیوند لگاتا ہے اور نیا پیوند دو تین بڑے بڑے ٹانکوں سے ٹانک لیتا ہے۔ پیوند لگانے کے لیے دھجیاں وہ گلی کوچوں سے بٹورتا ہے اور اُنھیں دھو کے پاک کر لیتا ہے۔

ردولی کے قریب کسی قصبے میں شیخ خواجگی نامی ایک عابد و زاہد بزرگ رہتے تھے۔ ایک دفعہ اُنھوں نے شیخ قدوس سے کہا۔ ”سالکوں کے لیے گدڑی بھی نفسانیت اور ریاکاری کا ذریعہ بنتی ہے۔“

یہ سُن کے شیخ قدوس بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے لوگوں سے کہا۔ ”لوگو! ہمیں کپڑے پہننے چاہئیں۔“

لوگوں نے آپس میں چندا کر کے دس گز کپڑا خریدا اور لباس سلوا کے اُنھیں دے دیا۔ شیخ قدوس نے وہ لباس پہن لیا اور اُسے پہنے رہے، یہاں تک کہ وہ لباس تار تار ہو گیا۔ اُنھوں نے اُسے نوچ پھینکا اور دوبارہ گدڑی پہننے لگے کیونکہ فقر و تنگ دستی کی وجہ سے وہ دوسرا کپڑا نہیں خرید سکتے تھے۔

شیخ قدوس خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ اساتذہ اور شیوخ کی خدمت بھی نہایت مشقت سے کرتے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے خود کہا ہے۔ ”میری عمر کا بڑا حصّہ پانی کھینچنے، مٹّی ڈھونے، لکڑی کاٹنے، جھاڑو دینے اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں صَرف ہوا ہے۔ حتّا کہ بعض اوقات ایسے موقعے بھی آئے کہ مجھے چٹائی کے لیے گارا بنانے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ میں اپنے کام میں اس قدر محو ہوتا تھا کہ میرے اساتذہ مجھے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا دیتے تھے۔ جمعے کو میں اپنے اور اپنے اساتذہ کے کپڑے دھونے کے لیے تالاب پر لے جاتا تھا۔ اساتذہ میرے لیے کپڑے دھونے کا وقت مقرّر کر دیتے تھے، اگر ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو مجھے ڈانٹ پڑتی تھی۔ میرے شیوخ نے میرے ہر عمل کے لیے وقت متعین کر دیا تھا۔“

ایک بار شیخ قدوس کے پاس کپڑے بالکل نہیں تھے۔ اُن کے بھائی نے انھیں اپنے کپڑے پہنا دیے۔ کپڑے قیمتی تھے مگر کچھ میلے تھے اس لیے شیخ قدوس نے سوچا کہ اگر انھیں دھو لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے استاد سے کپڑے دھونے کی اجازت طلب کی۔ استاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شیخ قدوس کو خیال ہوا کہ شاید اُنھوں نے سُنا نہیں ہے۔ شیخ قدوس نے دوبارہ اجازت طلب کی۔ استاد دوبارہ بھی خاموش رہے۔ شیخ قدوس نے تیسری بار ذرا بلند آواز سے اجازت مانگی۔ اس دفعہ اُستاد خاموش نہ رہ سکے، غصّے سے بولے۔ ”قدوس! ان کپڑوں نے تو تجھے میلا کر دیا۔ تیرا نفس موٹا ہو گیا ہے۔“ شیخ قدوس نے کپڑے دھونے کا خیال دل سے نکال دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

جمعے کو وہ اپنے پیر شیخ محمّد کے سارے گھر کے کپڑے دھونے کے لیے تالاب پہ لے جاتے تھے ایک بار وہ تالاب کے کنارے کپڑے دھونے بیٹھے ہی تھے کہ شیخ محمّد کی ملازمہ مریم دوڑی دوڑی پہنچی اور اُن سے بولی۔ ”میاں! میاں! مبارک ہو، تمھارے شیخ کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اُس کے کان میں اذان دینے کے لیے تمھیں بلوایا ہے، چلو۔“

شیخ قدوس نے ہاتھ پونچھے اور مریم کے ساتھ شیخ محمّد کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں مریم نے گردن موڑ کے سر سے پیر تک اُن پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہا۔ ”میاں! نامِ خدا جوان ہو، بیاہ کیوں نہیں کرتے؟“

شیخ قدوس کو ہنسی آ گئی۔ انھوں نے کہا۔ ”بی بی! تم میری زندگی سے واقف ہو، میرے مشاغل تمھیں معلوم ہیں۔ مجھے یہ زندگی بہت راس ہے، میں اہل و عیال کے جھگڑوں میں پڑ کے اس آزادی کی لذت کھونا نہیں چاہتا۔ میرا ارادہ ہے کہ عمر بھر مجرّد رہوں، ویرانوں اور جنگلوں میں زندگی بسر کروں اور گم نامی کے گوشے میں مر جاؤں۔“

مریم بولی۔ ”تم جانو، میں تو کہتی ہوں کہ تمھارے پیر کی چھوٹی بہن نا کتخدا ہے۔ ماشاء اللہ شادی کے قابل ہے، بہت اچھی جوڑی رہے گی۔ میری مانو تو اُس کے ساتھ گھر بسا لو۔“

شیخ قدوس خاموش رہے۔ شیخ محمّد کے گھر پہنچ کے انھوں نے نومولود کے کانوں میں اذان دی اور جس طرح سر جھکائے ہوئے پہنچے تھے، اُسی طرح سر جھکائے ہوئے لوٹ آئے۔ اُن دنوں وہ اپنے ایک مربّی کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے سامنے انھوں نے برسبیلِ تذکرہ مریم کی تجویز دُہرا دی۔ اُن کے مربّی نے اس تجویز میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ وہ شیخ قدوس کے عزائم سے واقف تھے پھر بھی انھوں نے مریم کی تائید میں انھیں قائل کرنا شروع کر دیا اور پوچھا کہ ”تم پر ہمارا بھی کچھ حق ہے یا نہیں؟“

شیخ قدوس نے کہا۔ ”کیوں نہیں، آپ کے حق سے کون منکر ہے۔ میں تو آپ کے ہاتھ میں ایک ڈھیلے کی طرح ہوں، خواہ رکھیے، خواہ

پھینک دیجیے۔"

اُن کے مربی نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو سنو۔ اس سے بہتر رشتہ اور اس سے مناسب موقع اور کون سا ہوگا۔ وہ لڑکی شیخ محمد کی بہن اور شیخ عبدالحق کی پوتی ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ تمھارے ہی لیے پیدا ہوئی ہے اور تم اُس کے لیے پیدا ہوتے ہو۔"

اس گفت گو کے چند روز بعد اُن کے مربی نے شیخ محمدؒ کے گھر شادی کا پیام دے دیا۔ پیام فوراً منظور کر لیا گیا۔ اس منظوری کا پس منظر یہ ہے کہ مذکورہ لڑکی کی بڑی بہن ایک عابدہ اور صالحہ عورت تھی مگر اتفاق سے اُس کی شادی سید شریف نامی ایک بداعمال شخص سے ہوگئی چنانچہ اُن کی ازدواجی زندگی میں ناموافقت رہی۔ اس تلخ تجربے کے بعد لڑکیوں کی والدہ امِ کلثوم نے یہ عہد کر لیا کہ چھوٹی لڑکی اُسی شخص کے عقد میں دوں گی جس کے متعلق شیخ عبدالحق کی تائید حاصل ہوگی۔

ایک رات امِ کلثوم نے اپنے بیٹے شیخ محمد کے مرید شیخ قدوس کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ شیخ قدوس سماع میں ہیں اور اُن کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا ہے۔ پھر شیخ عبدالحق خواب میں نمودار ہوتے۔ انھوں نے امِ کلثوم سے کہا۔ "بہو دلھن! اس بچے کو اپنے سائے میں لے لو اور اس کی پرورش کرو۔"

امِ کلثوم چونک کے بیدار ہوگئیں۔ اُن کا چہرہ مسرت سے تمتمانے لگا پھر انھوں نے آنکھیں ملتے ہوئے خواب کی تعبیر پر غور کیا تو معلوم ہوا شیخ قدوس کا پاؤں ٹوٹنا اس امر کی علامت ہے کہ یہ نوجوان کامل درویش ہوگا اور خدا کے دروازے کے سوا کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹائے گا اور دنیا سے بے نیاز ہو کے عبادت، صرف عبادت، صرف عبادت میں مشغول رہے گا اور اسے اپنے سائے میں لے کے پرورش کرنے سے یہ مراد ہے کہ میں اپنی لڑکی اس کے عقد میں دے دوں۔

جلد ہی شادی کی تاریخ طے ہوگئی اور شادی کا دن بھی آپہنچا۔ دستور کے مطابق دلھن والوں کی طرف سے دولھا کے لیے جوڑا بھیجا گیا۔ شیخ قدوس اپنی زندگی کے اس اہم موقع پر بھی حسبِ معمول مرشد کے گھر جھاڑو دے رہے تھے۔ مقررہ وقت پر اُن کے متعلقین وہاں پہنچ کے انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر لا کے انھیں غسل کے بعد کپڑے پہنائے گئے اور دولھا بنا دیا گیا۔ پھر برات کی شکل میں وہ دلھن کے گھر پہنچائے گئے۔ شہر میں یہ دلچسپ خبر اُڑ گئی تھی کہ "آج ایک دیوانے کی شادی ہو رہی ہے۔" یہ خبر سن کے لوگ جوق جوق وہاں جمع ہونے لگے۔ جب نکاح ہو چکا اور جلوے کا وقت آیا تو لڑکیوں اور عورتوں نے ہندی کا یہ گیت چھیڑ دیا ؎

کھو کہ کھول دینا شہ دیکھا لوری
اس گھونگٹ ری کارن شہ ہاتھ مروری

گیت سن کے شیخ قدوس پر اچانک وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ یہ بھول گئے کہ کہاں ہیں اور کس حیثیت سے ہیں۔ وہ وجد کے عالم میں رقص کرنے لگے اور نیا بیش قیمت لباس انھوں نے چیر پھاڑ کے پرزے پرزے کر دیا۔ عورتوں نے یہ دیکھا تو تاسف کے ساتھ امِ کلثوم سے کہا "اسے بہن امّی نے تو جان بوجھ کے اپنی لڑکی ایک دیوانے کے ساتھ باندھ دی اور اس طرح غریب کی قسمت پھوڑ دی۔" امِ کلثوم نے اطمینان سے مسکرا کے جواب دیا۔ "خدا کی مرضی یہی تھی۔"

شیخ عبدالقدوس پیدائشی ولی تھے۔ ولایت کے آثار اُن میں بچپن سے پائے جاتے تھے۔ وہ زبان سے جو کچھ کہہ دیتے تھے، وہ ہو جاتا تھا۔ دنیوی اشغال سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی لیکن ایک روایت کے مطابق وہ حلال روزی کمانے کے لیے زراعت کرتے تھے۔ جب اُن کے کھیت میں غلہ تیار ہو جاتا تو سب سے پہلے درویشوں کو حصے دیتے پھر صرف اپنی ضرورت کے مطابق غلہ رکھ لیتے۔ اگرچہ انھوں نے شادی کر لی تھی مگر ماسوا اللہ سے ترکِ تعلق کیے ہوئے تھے۔ آباؤ اجداد کی جو جائداد انھیں ورثے میں پہنچی تھی، انھوں نے اُس کے حصول کی طرف بھی کبھی توجہ نہیں دی۔ ہمیشہ فاقہ و فقر کے مصائب جھیلتے اور خدا کے ذکر میں مستغرق رہتے۔ ایک بار اُن کے گھر میں فاقہ کشی کا دَور دورہ تھا، نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ گھر والوں کو دو دو تین تین روز بعد جا کے کچھ کھانے کو ملتا تھا۔ بیوی بھی انھیں نہایت صابرہ ملی تھیں۔ وہ کبھی شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ لاتیں۔ شیخ قدوس کی بے نیازی اور بیگانگی کی بنا پر اُن کے احباب و اقربا قریب قریب انھیں فراموش کر چکے تھے۔ رشتے داروں میں اکثر مختلف دعوتیں ہوتیں اور تقریبات منعقد ہوتیں۔ ایسے موقعوں پر تمام اعزا کے ہاں شیرینی وغیرہ کے خوان پہنچتے لیکن شیخ قدوس کا گھر فراموش کر دیا جاتا۔ بعد میں یاد آتا تو افسوس کیا جاتا کہ "او ہو حضرت کے گھر حصہ نہیں گیا۔ کیسی بھول ہوئی کیسی بھول ہوئی۔"

شادی کے بعد شیخ محمدؒ نے انھیں خلافت کا خرقہ دے دیا۔ نیز اُن کے علاوہ شیخ قدوس نے مختلف طبقات اور مختلف خانوادوں کے مشائخ سے خلافت حاصل کی۔ اُنھی دنوں ایک رات انھوں نے شیخ عبدالحق کو خواب میں دیکھا۔ شیخ عبدالحق کی آنکھوں سے جلال برس رہا تھا۔ انھوں نے کہا۔ "قدوس! ہم نے تمھارا گھر جلا دیا، ہم نے تمھارا گھر جلا دیا۔"

شیخ عبدالقدوس کی آنکھ فوراً کھل گئی۔ انھوں نے دیکھا کہ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے اور ہر طرف شعلے لپک رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی حمائل لی اور گھر جلتا ہوا چھوڑ کے اطمینان سے باہر نکل آئے۔

۸۹۷ ہجری میں لودھی دربار کا ایک امیر عمر خاں سکندر لودھی سے بددل ہو کر جون پور چلا گیا لیکن بدقسمتی اُس کے ساتھ تھی، اِس لیے وہاں بھی اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ مایوس و پریشان ہو کے اُس نے سوچنا شروع کیا کہ اب کہاں جائے؟ اسی فکر میں اُسے خیال آیا کہ اب شہزادوں اور بادشاہوں کے بجائے کسی درویش کے پاس جانا چاہیے سکون کی دولت وہیں حاصل ہوگی۔ یہ سوچ کے وہ ردولی آیا۔ ردولی میں اُس کی آمد کا شہرہ پھیلا تو لوگ جوق در جوق اُس سے ملنے کے لیے پہنچے۔ اُس نے لوگوں سے پوچھا۔ "صاحبو! یہاں کوئی سالک یا مجذوب ایسا ہے جس سے ملنے کی سعادت حاصل کی جا سکے۔"

اُسے شیخ عبدالقدوس کا نام بتایا گیا کہ وہ ایک صاحبِ حال اور صاحبِ کمال بزرگ ہیں۔ عمر خاں شیخ قدوس سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ اُن کے علمی تبحر اور تقدس و تقوا نے اُسے بے حد متاثر کیا۔ وہ اُن کے قدموں پر گر کے بولا "حضرت! غریب الدیار ہوں۔ میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے مجھے اپنے دامن میں لیجیے اور جگہ دیجیے۔"

شیخ قدوس سرشاری کے عالم میں تھے۔ انھوں نے کہا "مولا! اللہ کی زمین پر اگر ہمارے لیے جگہ ہے تو تیرے لیے بھی ہوگی۔ فکر نہ کر تیرا کشکول خالی نہیں رہے گا۔"

اس جملے سے عمر خاں کو کامل یقین ہو گیا کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ مطمئن ہو کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ صرف چند روز بعد سکندر لودھی نے اُسے قیمتی تحائف روانہ کیے اور عزت و احترام کے قول و قرار کے دوبارہ اپنے پاس بلوا لیا۔

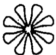
اُس زمانے میں ردولی کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ اس لیے شیخ قدوس ملول و دل گیر ہو کے وہاں سے نکل گئے۔ شہر سے نکل کے انھیں معلوم ہوا کہ سکندر لودھی اپنے امرا و مصاحبین کے ساتھ قریب ہی ایک مقام پر خیمہ زن ہے۔ یہ بات پہلے ہی شیخ قدوس کے علم میں تھی کہ عمر خاں دوبارہ سکندر لودھی کے امیروں میں شامل ہو گیا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک خاص خادم کو عمر خاں سے ملنے کے لیے شاہی خیموں کی طرف روانہ کیا اور اُس کے ذریعے ردولی کے تمام حالات عمر خاں کے کانوں میں پہنچوا دیے۔ عمر خاں نے اُن کا پیغام سُن کے نہایت اصرار اور اشتیاق سے اُنھیں یہ دعوت دی کہ وہ اُس کے پرگنے شاہ آباد ضلع کرنال میں قیام کریں۔ اُس نے کہلوایا تھا کہ یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی۔ شیخ قدوس نے اُس کی دعوت پر لبیک کہا اور مستقلاً شاہ آباد میں مقیم ہو گئے۔

شاہ آباد میں انھوں نے رشد و ہدایت اور علم و عرفان کی شمع نئے سرے سے روشن کی۔ دُور دُور سے طالبین پروانہ وار آ کے اُن کے گرد جمع ہونے لگے۔

شاہ آباد میں انھوں نے شیریں پانی کی جو نہر جاری کی تھی علم و ہدایت کے ہزاروں پیاسے پورے اڑتیس برس تک اُس سے سیراب ہوتے رہے۔ اُسی زمانے کا ذکر ہے۔ ایک رات شیخ قدوس کی اہلیہ نے کشف کے عالم میں دیکھا کہ خراسان کی طرف سے ایک آگ اٹھی ہے اور وہ آگ ہر خشک و تر کو جلاتی ہوئی مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ اِس کشف کے بعد انھوں نے اپنے متعلقین سے کہا کہ "جس قدر جلد ممکن ہو، یہاں سے کوچ کی تیاری کرو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان اس زمین سے ناراض ہو گیا ہے۔ یہاں کوئی بلا نازل ہونے والی ہے۔"

جلد ہی مغلوں کی تاخت و تاراج شروع ہو گئی۔ جہاں بھی مغل بادشاہ بابر کے پہنچنے کی خبر جاتی، لوگ بھاگ کھڑے ہوتے اور لوٹ مار شروع ہو جاتی۔ پوری پوری بستیاں بیوہ کی مانگ کے مانند اُجڑ جاتیں۔ ان حالات میں شیخ قدوس نے شاہ آباد کی سکونت ترک کر دی اور گنگوہ پہنچ کے محلہ سرائے میں مقیم ہو گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے دوستوں، مریدوں، معتقدوں اور دولت مندوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ وہ گنگوہ پہنچے تو پورے ہندوستان میں اُنھیں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ آج بھی اُن کا یہی نام معروف و مقبول ہے۔

گنگوہ کے محلہ سرائے میں ایک بار اتفاق سے زبردست آگ لگ گئی۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ تمام احتیاطی تدبیروں کے باوجود آگ تیزی سے پھیلتی رہی۔ بہت سے لوگ لپکتے ہوئے شعلوں کی زد پہ آ کے زندہ جل گئے اور بہت سے مال داروں کا قیمتی سامان انگاروں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آتش زدگی کے موقع پر شیخ قدوس کے ہاتھ میں ایک تسبیح تھی اور ایک رومال تھا۔ یہ دونوں چیزیں بھی جل گئیں۔ اُن کے جسم کے کپڑے بھی آگ سے متاثر ہوئے لیکن خود اُنھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ وہ اس حادثے سے بے حد متاثر اور افسردہ تھے۔ اُسی رات انھوں نے مراقبے کی حالت میں غیبی ندا سُنی کہ "قدوس! مصائب و حوادث کی فکر نہ کر کیونکہ آج سے تجھے قطب الاقطاب کے مرتبے پر سرفراز کیا جاتا ہے۔" شیخ قدوس کی پیشانی زمین بوس ہو گئی اور آنکھوں کی بارش آگ کا اثر زائل کرنے لگی۔



سکندر لودھی کے عہد میں شیخ حسام الدین ایک عالم گزرے ہیں۔ وہ شاہی ملازموں کے سلسلے سے منسلک تھے۔ ایک دن سکندر نے خسروانہ مرحمت کی بنا پر اُن سے کہا کہ "آپ جو کچھ آرزو رکھتے ہوں بیان کیجیے۔ اُس کی تکمیل کی جائے گی۔"

شیخ حسام الدین نے خواہش ظاہر کی کہ مدرسہ ممالک کا عہدہ

احتساب میرے سپرد کیا جائے اور میری مدد کے لیے ایک جماعت متعین کی جائے تاکہ میں آپ کی عمل داری سے بدعات و منکرات کا قلع قمع کرسکوں۔"

سکندر نے گرُز برداروں کی ایک جماعت، چند سلطانی ملازم، چند جیّد عالم اور کئی اونٹوں پر لدی ہوئی دا فر کتابیں اُن کے سپرد کیں اور ایک فرمان کے ذریعے یہ اعلان کر دیا کہ شیخ حسام الدّین اُس کی قلم رو کے اعلا محتسب ہیں۔ شیخ حسام الدین اُس سے رخصت ہو کے گجرات، دکن اور مالوے کی طرف روانہ ہوئے۔ ان صوبوں میں پہنچ کے انھوں نے شرعی منہیات کا انسداد کیا اور تمام علما و مشائخ اور مفتیان و شرفا سے اس مضمون کے مچلکے لیے کہ آج سے کوئی متنفس شرعی ممنوعات کا مرتکب نہیں ہوگا۔

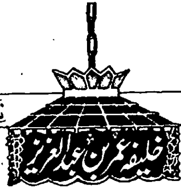
اس تفصیلی دورے کے بعد انھوں نے دہلی پہنچ کے شاہی دربار میں اپنی کارکردگی کا اطلاع نامہ پیش کیا اور مختلف لوگوں سے حاصل کیے ہوئے مچلکے بادشاہ کی نذر کیے۔ بادشاہ بے حد خوش ہوا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔

دہلی میں چند روز قیام کر کے شیخ حسام الدّین لاہور اور ملتان کے دورے پر روانہ ہوئے۔ ان صوبوں میں بھی انھوں نے غیر شرعی امور کے تدارک کے لیے بہت کچھ کیا۔ پھر وہاں سے وہ پانی پت پہنچے۔ پانی پت پہنچ کے انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا، "رفیقو! ہمیں پہلے گنگوہ چل کے عبدالقدّوس گنگوہی کو تائب کرنا چاہیے۔ سُنا ہے، وہ خود کو قطب الاقطاب کہتا ہے اور بعض غیر شرعی امور کا ارتکاب کرتا ہے معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی زندگی وجد و حال میں ضائع کرتا ہے اور وحدت الوجود کے مسلک پر قائم ہے لہٰذا پہلے گنگوہ چل کے اُس سے مچلکا لیتے ہیں پھر آگے روانہ ہوں گے۔"

قافلہ پانی پت سے گنگوہ پہنچ کے تالاب کے کنارے مقیم ہوگیا۔ شیخ قدّوس کو یہ پیغام بھجوایا گیا کہ وہ شریعت کی پابندی کریں اور سرود و وجد و حال سے تائب ہو جائیں۔ شیخ قدّوس کے پاس یہ پیغام پہنچا تو انھوں نے اسے خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے کہا، "واقعی شرع کے احکام سے رُوگردانی مناسب نہیں ہے۔ ہم استغفار کرتے ہیں۔"

انھوں نے اپنے معمول کے خلاف پورے چھ روز وجد و سماع کے بغیر گزارے۔ لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ "شیخ قدّوس نے سلطان سکندر لودھی کے اعلا محتسب سے خوف زدہ ہو کے وجد و سماع سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔"

لوگوں کا یہ خیال شیخ قدّوس کے کانوں تک پہنچا تو انھوں نے کسی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی، بس خاموش ہو گئے۔ اُسی زمانے میں



نثار احمد کھوسا کی بیاض سے

ایک متموّل آدمی تھے۔ اُن کے پاس اس قدر ساز و سامان تھا کہ پورے تیس اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے جسم کی تروتازگی رشک کے قابل تھی۔ وہ متنعم، اچھے لباس اور عطریات کے بے حد شائق تھے۔ نفاست پسندی کا یہ حال تھا کہ لوگ اُن کے جسم پر ایک دفعہ جو کپڑا دیکھ لیتے تھے، اُسے وہ دوبارہ نہیں پہنتے تھے اور بسا اوقات قیمتی سے قیمتی کپڑا خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ خلیفہ ولید کے وزیرِ اعظم کا بیان ہے کہ "ہماری سلطنت میں سب سے زیادہ خوش خرام شخص عمر بن عبدالعزیز تھے۔ وہ جس طرف سے گزرتے تھے، راستہ خوش بو سے مہک جاتا تھا۔"

لیکن جس دن وہ خلیفہ بنے، انھوں نے عطر و لباس، محلّات، کنیزیں، غلام اور سواریاں سب کچھ تج دیا۔ اُن کے پاس لباس کا صرف ایک جوڑا تھا۔ وہ میلا ہو جاتا تو اُسی کو دھو کر پہن لیتے۔ ایک بار اُن کے سالے نے اپنی بہن یعنی اُن کی بیوی سے کہا، "بہن! امیرالمومنین کی قمیص نہایت میلی ہو رہی ہے اور اس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ وہ بیمار ہیں، لوگ مسلسل عیادت کے لیے آ رہے ہیں۔ اُن کی قمیص تو بدلوا دو۔"

اُن کی بیوی خاموش رہیں۔ بھائی نے پھر اپنی بات دُہرائی۔ ان کی بیوی بولیں "قسم کھا کے کہتی ہوں کہ تمھارے بہنوئی اگرچہ خلیفہ ہیں اور مملکت کے مالک و مختار ہیں پھر بھی اُن کے پاس دوسرا جوڑا نہیں ہے۔"

ایک رات وہ تہجد کی نماز کے لیے اُٹھے۔ اتفاق سے کہیں قریب ہی کوئی کنیز جوار پیس رہی تھی اور ایک ہندی دوہا گا رہی تھی۔ شیخ قدّوس نے دوہے کے بول سُنے تو ضبط کا دامن یک لخت اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اُن پر بے اختیار وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسی حالت میں انھوں نے ایک نعرہ بلند کیا۔ اُن کا نعرہ پانچ چھ کوس دُور تک سُنا گیا۔ پھر جب یہ حالت کچھ اعتدال پر آئی تو انھوں نے شیخ حسام الدّین کو پیغام بھیجا کہ "مولانا! ہماری کیفیت ایک آتش زدہ لکڑی کی سی ہے اور آتش زدہ لکڑی جنگل میں نہ خشک چیز چھوڑتی ہے، نہ تر۔ ہر چیز جلا ڈالتی ہے اگر یہ کیفیت تم دُور کر سکتے ہو تو آؤ۔ خوش آمدید۔"

شیخ حسام کی طرف سے جواب آیا کہ "رات کے وقت میرا آنا مناسب نہیں ہے، صبح آؤں گا۔"

صبح شیخ حسام الدّین نے اپنا ایک مخبر شیخ قدّوس کی خانقاہ بھیجا اور اُسے ہدایت کی کہ دیکھ کے آؤ، شیخ قدّوس کی کیا حالت ہے۔ مخبر بھاگم بھاگ آیا اور واپس جا کے اُس نے اطلاع دی کہ شیخ قدّوس ابھی وجد کے عالم میں ہیں۔ شیخ حسام الدّین نے ایک دُرّہ ہاتھ میں لیا، علما، لشکریوں اور گرزبرداروں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ننگے پاؤں شیخ قدّوس کی خانقاہ کی طرف بڑھنے لگے۔

انھوں نے جیسے ہی خانقاہ میں قدم رکھا، دیکھا کہ شیخ قدوسؒ پر اب تک وجد کی کیفیت طاری ہے۔ یہ دیکھ کے شیخ حسام الدین میں دفعتہً ایک نئی تبدیلی پیدا ہوئی۔ دُرّا اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ شیخ قدوس کے سامنے جانے کے بجائے ایک طرف ہٹ کے کھڑے ہوگئے۔ شیخ قدوس جلال کے عالم میں تھے اس لیے شیخ حسام پر کھڑے کھڑے خوف اور لرزہ طاری ہوگیا۔ معاً شیخ قدوس وجد کرتے ہوئے اُن کے قریب پہنچے اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے رقص کرنے لگے۔ رقص کی وجہ سے اُن کا ہاتھ شیخ حسام کے کندھے سے بار بار ہٹ جاتا تھا مگر وہ دوبارہ اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے چھ بار اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ساتویں مرتبہ کندھے کے بجائے اُن کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ جیسے ہی اُن کا ہاتھ شیخ حسام کے سر سے مَس ہوا، شیخ حسام نے بے تابی سے اپنی دستار زمین پر پٹخ دی اور ایک دل دوز نعرہ مار کے پروانے کی طرح شیخ قدوس کے گرد گھومنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد شیخ قدوس کو کچھ افاقہ ہوا تو شیخ حسام نے اُن کے پاؤں چھو کے کہا "حضور! مجھے آج روشنی ملی ہے۔ اب تک میں اندھیرے میں تھا"

شیخ قدوس نے ملائم لہجے میں کہا "روشنی ابھی دور ہے لیکن اطمینان رکھو، ایک روز وہ تمھارا حصہ ہوگی" یہ کہہ کے وہ اپنے عبادت خانے میں چلے گئے۔

واپس پہنچ کے شیخ حسام کے حیرت زدہ ساتھیوں نے اُن سے پوچھا "یہ یک بیک آپ کو کیا ہوگیا تھا؟ آخر واقعہ کیا پیش آیا؟ ہم تو کچھ سمجھ نہیں سکے"

شیخ حسام نے بتایا "جب میں شیخ قدوس کی خانقاہ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دروازے پر دو خوف ناک شیر منہ کھولے ہوئے بیٹھے ہیں۔ میں خوف زدہ ہوگیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ شیخ نے وجد و رقص کے عالم میں اپنے ہاتھ دونوں شیروں کے منہ پر رکھ دیے ہیں اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ پھر جب اُن کی نظر مجھ پر پڑی تو میں کانپ اٹھا اور میرے ہوش و حواس رخصت ہوگئے۔ اسی اثنا میں انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ساری زمین میرے کندھے پر آگئی ہے، دوسری دفعہ انھوں نے ہاتھ رکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ساری زمین اپنے پہاڑوں سمیت میرے کندھے پر رکھی ہوئی ہے، تیسری دفعہ انھوں نے ہاتھ رکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے سارے آسمان میرے کندھے پر رکھ دیے گئے ہوں، چوتھی مرتبہ یہ معلوم ہوا، گویا زمین اور آسمان اور کرسی میرے کندھے پر ہیں۔ پانچویں مرتبہ کندھے پر اُن کا ہاتھ آیا تو میں نے دوزخ کا مشاہدہ اور چھٹی مرتبہ مجھے بہشت کا نظارہ ہوا۔ آخر ساتویں مرتبہ انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو میں نے بے اختیار اپنی دستار پٹخ دی اور دیوانہ وار اُن کے گرد گھومنے لگا"

اس واقعے کے بعد شیخ حسام الدین کے پاس جتنا بھی مال و متاع تھا، وہ سب انھوں نے اپنے ساتھیوں اور شہریوں میں تقسیم کر دیا پھر شیخ قدوس کی خانقاہ پہنچ کے حق کی طلب میں مشغول ہوگئے۔ یہاں تک کہ بے مثال مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد انھوں نے شیخ قدوس سے خلافت کا خرقہ حاصل کیا۔ یہ واقعہ سکندر لودھی کو معلوم ہوا تو اُسے بھی شیخ قدوس سے انتہائی عقیدت ہوگئی۔

شیخ قدوس اگرچہ اہلِ عشق و سماع میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے لیکن سنّت اور شریعت کے اتباع کا انھیں ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ دہلی میں تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ یہاں ایک خوش الحان واعظ مولانا شعیب رہتے ہیں اور اُن کے بیان میں غضب کا سحر ہے۔ شیخ قدوس یہ شہرت سُن کے مولانا شعیب کی مسجد میں پہنچے۔ مولانا شعیب اُس وقت منبر پر قرآن کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ شیخ قدوس نے اُن کی آواز میں واقعی سحر محسوس کیا لہٰذا اُن پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ مولانا شعیب کا بیان سنتے سنتے اچانک مستی میں ڈوب گئے اور اُن کی جگہ خود اسرارِ الٰہی بیان کرنے لگے۔ مولانا شعیب خاموش ہوگئے اور انتظار کرنے لگے کہ شیخ کو سکون ہو تو وہ دوبارہ تفسیر شروع کریں لیکن شیخ پر محویت اس قدر غالب تھی کہ ختم ہی نہ ہوئی۔ آخر مولانا شعیب منبر سے اُتر گئے۔ شیخ قدوس کو اُسی حالت میں گاڑی پر سوار کر کے وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ وہاں سے وہ عصر کی نماز کے لیے شیخ نصیر الدین دانش مند کی مسجد میں پہنچے۔ شیخ نصیر الدین نے اُن میں لرزے اور بے قراری کی کیفیت دیکھ کے لوگوں سے پوچھا کہ انہیں کیا بیماری ہے؟ جواباً بتایا گیا کہ انھیں کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ یہ کیفیت عشق کا وہ زخم ہے جو مولانا شعیب کی مسجد میں انھیں لگا ہے۔

شیخ قدوس اُسی سرمستی کے عالم میں وضو کر کے عصر کی نماز کے لیے تیار ہوئے اور انھوں نے باقاعدہ شریعت کے مطابق نماز ادا کی۔ سُکر و مستی کے باوجود اُن سے کوئی بے احتیاطی سرزد نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کے تمام حاضرین حیران رہ گئے۔

شیخ قدوس کا کہنا تھا کہ "ہم نے ابتدائی ریاضت کے زمانے میں ایک بار یہ خواب دیکھا کہ جبرئیل آئے ہیں اور انھوں نے ایک کتاب ہمارے سامنے رکھی۔ ہم نے سوچا کہ جبرئیل خاتم الانبیاؐ کے بعد کسی پر کچھ لے کے نازل نہیں ہو سکتے لہٰذا ممکن ہے، شیطان ہمیں فریب دے رہا ہو مگر اسی اثنا میں ہم نے رسول اللہؐ کو دیکھا وہ جبرئیل

سب تک

سے کلام فرمارہے تھے۔ ہمیں اپنے خطرے کا جواب مل گیا۔ شیطان کی مجال نہیں ہے کہ وہ رسولِ اکرمؐ سے ہم کلام ہوسکے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ جبرئیلؑ اور آں حضرتؐ روانہ ہورہے ہیں۔ ہم نے آں حضرتؐ کا دامن پکڑلیا اور عرض کیا کہ حضورؐ! جبرئیلؑ نے ہمیں ایک کتاب دی ہے، اُس کا ہم کیا کریں؟ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ وہ کتاب تو ہمارے اتّباع سے متعلق ہے، اُسے اپنے پاس رکھو۔"

اس خواب کی تعبیر یوں ظاہر ہوئی کہ شیخ قدوس، رسولِ اکرمؐ کے اتّباع میں عمربھر انتہائی راسخ رہے۔ ظاہر ہو یا باطن، وہ کسی صورت میں شرعی احکام سے تجاوز روا نہ رکھتے تھے۔ وہ یہ روش نہ اپنے لیے پسند کرتے تھے نہ دوسروں کے لیے۔ اگر وہ کسی کا کوئی فعل شریعت کے خلاف دیکھتے تو اُس سے بیزاری اور برأت کا اظہار کردیتے اور اُسے اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے۔

ایک رات شیخ قدوس کے ایک خلیفہ نے کشف میں دیکھا کہ شیخ اپنے حجرے میں کسی کتاب کا مطالعہ کررہے ہیں اور چراغ جل رہا ہے۔ صبح خلیفہ نے اُن سے کہا "سرکار! رات آپ نے بے حد مشقت اٹھائی کہ رات بھر چراغ سامنے رکھ کے کسی کتاب کا مطالعہ فرماتے رہے۔"

شیخ نے متبسّم ہو کے کہا "ایسا نہیں ہے۔ ہم تو تمام رات سوتے رہے۔ ہاں، تم نے ہماری روح کو دیکھا ہوگا۔" پھر کچھ توقّف کرکے انھوں نے کہا "اولیا بظاہر سوتے ہیں مگر اُن کی نیند حقیقت میں نیند نہیں ہوتی۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ علما کی نیند بھی عبادت ہے۔ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر انبیا سو جائیں تو اُن کا وضو ناقص نہیں ہوگا کیونکہ اُن کی نیند، نیند نہیں ہوتی۔ یہ حکم اگرچہ انبیا کے لیے مخصوص ہے لیکن انبیا کے اتّباع کی وجہ سے اولیا بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اُن کی نیند بھی نیند نہیں ہوتی پھر بھی شریعت کے حکم کی رُو سے وہ نیند کے بعد وضو کی تجدید ضرور کرتے ہیں اور اس حکم میں اپنے آپ کو شریک نہیں کرتے کیونکہ یہ انبیا کے لیے مخصوص ہے۔"

ایک بار شیخ قدوس کے بھانجے ایک درویش بہاالدین کے حجرے کی طرف سے گزرے۔ صبحِ صادق کا وقت تھا۔ شیخ قدوس کے بھانجے نے درویش بہاالدین کو سوتے ہوئے دیکھا اور حیرت سے سوچا کہ یہ کیسا درویش ہے جو صبحِ صادق کے وقت عبادت کرنے کے بجائے غافل سو رہا ہے۔ درویش بہاالدین نے اپنی کشفی قوت سے اُن کا یہ سوئے ظن محسوس کرلیا۔ انھیں سخت غصّہ آیا۔ اُن کے حجرے میں ایک چراغ روشن تھا۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ چراغ اٹھا کر زمین پہ دے ماریں اور اس طرح اپنے روحانی تصرف سے شیخ قدوس کے بھانجے کو ہلاک کر دیں۔ شیخ قدوس اُس وقت تین سو کوس کے طویل فاصلے پہ تھے مگر انھوں نے کشف کی کیفیت میں یہ ماجرا دیکھ لیا۔ وہ اُسی وقت درویش بہاالدین کے پاس پہنچے اور بولے "حضرت! یہ ہماری اولاد ہے۔ اسے معاف کردیجیے۔"

درویش بہاالدین نے جواب دیا کہ "شیخ! اب میں چراغ اٹھا چکا ہوں۔ مردانِ حق اپنا ارادہ نہیں بدلتے۔ تھی بتاؤ، اب میں یہ اُٹھا ہوا چراغ کس پر ماروں؟"

یکایک دہلی کے حاکم شیخ عمر کی جسمانی صورت ظاہر ہوئی۔ شیخ عمر نہایت ظالم و جابر شخص تھا۔ درویش بہاالدین نے اپنا چراغ اُس پر دے مارا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند دن بھی نہ گزرے تھے، شیخ عمر مغلوں کے ہاتھوں بُری طرح مارا گیا۔

پانی پت کا ایک شخص برسات کے موسم میں ایک رات بُو علی قلندرؒ کے مزار پہ گیا۔ وہ روضے میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ قلندر کا ئر تو روضے میں ہے لیکن وہ اپنا پاؤں ایک بزرگ کے زانو پر رکھے ہوئے ہیں اور وہ بزرگ اُن کے پائنتی بیٹھا ہوا ہے اور اُس کی پیشانی بے حد منوّر ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کے وہ شخص خوف و حیرت سے اپنی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد قلندرؒ کے پائنتی بیٹھا ہوا

حضرت ابو بکر صدیقؓ

چند چادریں شانے پر ڈالے ہوئے انھیں فروخت کرنے کے لیے جارہے تھے۔ راستے میں حضرت عمرؓ نے انھیں دیکھا تو آواز دی "یا اخی! کہاں جارہے ہیں؟"

جواب ملا "بازار۔"

حضرت عمرؓ بولے "مگر صدیق! اب تو آپ خلیفہ ہیں۔ اگر اب بھی تجارت میں لگے رہیں گے تو خلافت کا کام کیسے چلے گا؟"

حضرت صدیقؓ رُک گئے۔ انھوں نے کہا "یہ تو درست ہے لیکن اگر ہم تجارت جاری نہ رکھیں تو اپنے اہل و عیال کے پیٹ کیسے بھریں گے؟"

حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ "آیئے ابو عبیدہؓ کے پاس چلتے ہیں۔ انھیں خدا کے حبیبؐ نے بیت المال کا امین مقرر کیا تھا، ان سے مشورہ کریں گے۔"

دونوں حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس پہنچے۔ انھوں نے پورا ماجرا سُنا تو حضرت صدیقؓ کے لیے بیت المال سے کچھ وظیفہ مقرر کردیا۔ یہ وظیفہ اتنا ہی تھا، جتنا ایک عام آدمی کو ملتا تھا اور اس میں صرف انتہائی ضروری اخراجات پورے ہوسکتے تھے۔ فراخی یا معمول سے تجاوز کی گنجائش نہیں تھی۔

ایک روز حضرت صدیقؓ نے اپنی اہلیہ سے کوئی میٹھی چیز پکانے کے لیے کہا۔ وظیفے کی محدود رقم میں میٹھی چیز پکانا ممکن نہیں تھا چنانچہ اُن کی اہلیہ نے روزانہ کے خرچ میں سے تھوڑی تھوڑی بچت شروع کردی اور اس طرح کچھ رقم پس انداز کرکے ایک روز حضرت صدیقؓ کو بتایا "اب اتنی رقم جمع ہوچکی ہے کہ کوئی میٹھی چیز پکائی جاسکے۔"

حضرت صدیقؓ کے چہرے پر تشویش اُبھری۔ انھوں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا وظیفہ ہماری ضرورت سے زیادہ ہے۔" انھوں نے اہلیہ سے بچائی ہوئی رقم لی اور اُسی وقت جاکے بیت المال میں جمع کروادی اور ہدایت کی کہ آیندہ انھیں اتنی رقم کم دی جائے۔

بزرگ اٹھا۔ اُس نے اُس شخص کا ہاتھ پکڑ کے اُسے قلندر کے قدموں میں ڈال دیا۔ پھر وہ بزرگ اور قلندر دونوں اُس شخص کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ وہ شخص سوچتا ہی رہ گیا کہ یہ بزرگ کون تھے؟ بزرگ کی صورت اُس کے دل پر نقش ہو گئی۔

اس واقعے کے سات سال بعد اُسے کرنال میں پھر وہی صورت نظر آئی، وہ فوراً پہچان گیا۔ اُس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ قطب الاقطاب شیخ عبدالقدوس گنگوہی ہیں۔



شیخ عبدالقدوس گنگوہی فارسی اور ہندی شاعر کی حیثیت سے ایک خاص مقام کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ نثر میں اُن سے متعدد کتابیں منسوب ہیں۔ "لطائفِ قدوسی" میں اُن کی پندرہ کتابوں کے نام اور موضوعات درج ہیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں مغلوں اور افغانوں کے ہنگامے میں ضائع ہو گئی تھیں۔ اُن کے ایک مرید نے اُن کے ملفوظات بھی "اسرار العجائب" کے نام سے یک جا کیے تھے۔ نیز تصوّف کے تحریری سرمائے میں اُن کے مکاتیب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مکاتیب تصوّف کے رموز و نکات، علمی مسائل کی تشریحات، اعمال و عقائد کی توضیحات اور رُشد و ہدایت کے بلند پایہ ابواب پر مشتمل ہیں۔ ۱۹۹ خطوط کا ایک مجموعہ "مکتوباتِ قدوسیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ خطوط اُس دور کے سلاطین، اُمرا، صوفیا، عمّال، صاحب زادوں، خلفا، مریدوں اور دوستوں کے نام ہیں۔ ایک خط میں انھوں نے اِس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ مسلمان بادشاہ کو کن اوصاف سے متصف ہونا چاہیے۔ لکھتے ہیں۔

"تمھیں جاننا چاہیے، یہ اصول مقرّر ہے کہ عام لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں لہٰذا بادشاہوں اور عالموں کو چاہیے کہ وہ شرعی احکام ادا کرنے میں پوری پوری احتیاط برتیں تاکہ انھیں دیکھ کے عوام و خواص بھی شریعت کی پابندی کریں اور تمام لوگ شریعت سے آراستہ و پیراستہ ہوں اور اسلام کی رونق بڑھے اور علما و صلحا کی توقیر ہو۔"

عبادتوں میں شیخ قدوس نماز، ذکرِ الٰہی اور قرآن کی تلاوت سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ وہ چار سو رکعتیں رات کو اور چار سو رکعتیں دن کو ادا کرتے، اس کے علاوہ روزمرّہ کے وظائف پڑھتے۔ یہاں تک کہ اُن کا جبّہ نماز کی کثرت سے گھِس گھِس کے بہت جلد پھٹ جاتا تھا۔ شدید سردی میں برف باری ہوتی تھی۔ اس موسم میں اُن کے پاؤں اور پنڈلیاں پھٹ جاتی تھیں پھر بھی وہ نماز برابر پڑھتے تھے۔ نماز پڑھتے پڑھتے جب نفس کو گرمی کی طلب ہوتی تو وہ کہتے کہ بس یہ دوگانہ ادا کر لوں، اس کے بعد اپنے جسم کو آگ کی حرارت بہم پہنچاؤں گا مگر اسی طرح ساری رات گزر جاتی اور آگ تاپنے کی نوبت نہ آتی۔ بعض مرید کبھی کبھی انگیٹھی جلا کے اُن کے قریب رکھ دیتے تھے لیکن اُن کے خشوع خضوع کا یہ عالم ہوتا تھا کہ انھیں گرمی و سردی کی خبر ہی نہ ہوتی تھی۔

شیخ قدوس ایک صائم الدہر عابد تھے۔ اُن کے بیٹے "لطائفِ قدوسی" کے مؤلف شیخ رکن الدین کی روایت ہے کہ "مجھے چالیس سال کی مدّت میں یاد نہیں کہ انھوں نے ممنوعہ ایّام کے سوا کبھی دن میں کھانا کھایا ہو۔ وہ عیدین کے صرف پانچ ممنوعہ ایّام میں روزے نہیں رکھتے تھے، باقی ہمیشہ روزے سے رہتے تھے کبھی کبھی کھانے کے وقت وہ معرفت کے اسرار بیان کرتے تھے۔"

شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے چوراسی سال کی طویل عمر پائی اور ۲۳ جمادی الآخر ۹۴۴ ہجری کو مٹی کے سمندر میں تحلیل ہو گئے۔ اس طویل عمر میں طفولیت سے شروع ہو کے زندگی کی آخری سانس تک وہ کبھی اپنے مقصد، اپنے نصب العین سے غافل نہیں ہوئے۔ دنیا چھوڑنے سے تین سال پہلے انھوں نے دنیا والوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا کسی سے گفت گو نہیں کرتے تھے، ہمیشہ محویت اور بے خودی میں رہتے تھے۔ ایک روز اُن کے فرزندوں نے اُن سے سوال کیا "بابا جان! ہم آپ کے سکوت اور خلق سے انقطاع کا سبب سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہماری بصیرت کے لیے اس کا سبب بیان فرمائیے۔"

شیخ قدوس نے جواب دیا "جگر پارو! ہم نے اپنا دل وقف کر دیا ہے، نذر کر دیا ہے۔ اب ہمارا وجود ذکر کا ایک دریا ہے جس وقت یہ دریا موجیں مارتا ہے اور سب کچھ غرق کر لیتا ہے تو ہمیں شہادت کے عالم سے ہٹا کے ایک دوسرے عالم میں لے جاتا ہے۔ وہاں ہم حق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور مشاہدے کی لذت ہمیں اس عالم میں نہیں لوٹنے دیتی۔"

جب وہ آخری بار شہادت کے عالم سے ایک دوسرے عالم میں گئے تو اُن کا غیر متحرک خاکی جسم سفید جوڑے میں ملفوف کر دیا گیا۔ شیخ رکن الدین کا بیان ہے کہ "میں نے اس موقع پر بھی جب اُن کے سینے پہ ہاتھ رکھا تو ذکرِ الٰہی سے اُن کے قلب کی حرکت جاری محسوس کی۔"

اُن کا مزار گنگوہ ضلع سہارن پور میں آج بھی خاص و عام کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ انھیں خاموشی اختیار کیے ہوئے ساڑھے چار سو سال سے زیادہ کی مدّت گزر چکی ہے مگر تاریخ کی سماعت میں اُن کی یہ آواز اب تک محفوظ ہے کہ "شریعت لامعبودَ الّا اللّٰہ، طریقت لامقصودَ الّا اللّٰہ اور حقیقت لاموجودَ الّا اللّٰہ۔"





ابو الفضل صدیقی۔ دھاڑتے اور چنگھاڑتے ہوئے لفظوں کے ادیب، چنختے اور چرکتے ہوئے لفظوں کے ادیب، ان کے لفظوں کی خوش بو جدا ہے۔ سوندھی سوندھی سبزے اور مٹی کی ملی جلی خوش بو، ان کے بات کرنے کا انداز مختلف ہے، پہلودار، تیوردار،

اردو کے منفرد ادیب ابو الفضل صدیقی کی ایک مختصر کہانی ۔۔ ایک جنگلی کہانی

صبح سے بھاگتے بھاگتے دوپہر ہوگئی بہار کی دھوپ میں خاصی تمازت پیدا ہوگئی، پھر کپڑے بھی ذرا بھاری تھے، پارے ہلنے لگے۔ ستارہ کے بھی پاؤں بھاری اٹھ رہے تھے۔ تھکی تھکی سی چل رہی تھی۔ ایسے میں تو یوں بھی جی چھوٹ جایا کرتا ہے اور ویسے ہی تکان معلوم ہونے لگتی ہے۔ بڑے اچھے چانس ملے اور سب خالی گئے اور اب تو گرمی کا وقت تھا۔ پیاس لگ رہی تھی۔

جنگل کی بہاریں اور وسعتیں نیلے آسمان کے نیچے پوری تاب ناکیوں سے چمک رہی تھیں میں دُور دُور تک نظر کی کمندیں پھینک رہا تھا کہ ساتھیوں

کا پتہ چلے تو قریب کے راستے کا سراغ ملے مگر وہ تو لق و دق میدان سامنے تھا۔ تاحدِ نظر دریا کی چھوڑی ہوئی نم سیاہ چچوڑ مٹی کا میدان جس پر راستے کے نشان بن ہی نہ سکے تھے۔ خود ستارہ کے سُموں کے نشان بنتے ہی چچوڑ نم مٹی پر بگڑتے جاتے تھے میرے سیدھے ہاتھ اور پشت کی جانب دو سمت موڑ لے کر گنگا جھل ملا رہی تھی۔ نئے نئے برف کے پانی سے لبریز، چال میں موسم بہار کی مخصوص مستی لیے رواں دواں تھی، بائیں ہاتھ پر دو تین میل دُور قدِ آدم جھاؤ اور ناگ پھنی کے گھنے جنگل کی حدود تھیں جو دُور تک نہ معلوم کتنے طول و عرض میں پھیلا چلا گیا تھا اور سامنے افق سے کنارے ملائے ہوئے میدان تھا میری عقل صحیح راستے کی تمیز سے قاصر تھی۔ ایسے موقع پر بہترین صورت یہی ہوا کرتی ہے کہ راکب مرکب کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے بھی راسیں چھوڑ دی تھیں۔ اطمینان تھا کہ ستارہ چھوٹے سے چھوٹے فاصلے پر چل کر جائے قیام پر پہنچے گی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اُمید تھی کہ اپنی قوتِ شامہ سے کام لیتی شاید جنگل میں چھوٹے ہوئے ساتھیوں کا سراغ بھی چلاتی بڑھے گی۔

یہ علاقہ میرے لیے نامانوس تھا، یہاں عمر میں پہلی مرتبہ بڑی ہمت کر کے شکار کے بہانے کچھ سیاسۃً آیا تھا ویسے یہ مجھے میرے ایک کئی پشت دُور کے رشتے کے لاولد چچا سے وراثت کی کئی سیڑھیاں پھاند کر پہنچا تھا اور اپنے ساتھ توریث میں نزاع اور مقدمے بازی بھی لایا تھا۔ مدِمقابل سنگھ بالو تھا، اس علاقے کا ایک دیہاتی زور دار راج پوت جو دیانتے برار کے ذرا سے حق کی آڑ لے کر اس پر مخالفانہ قبضہ جمائے ہوئے تھا اور اپنے اثر اور قابو کے زور سے دیوانی عدالت کے کئی فیصلے اور پیمائش تو وہ بندی کی دو تین تجویزیں ٹھکرا چکا تھا۔ پولیس بھی مدد سے عاجز تھی اور نفاذ نہ کرا سکتی تھی۔ آدمی جتھے بند اور قاتل قسم کا تھا۔ شکار کا بڑا شوقین اور انتہا کا بے باک کہ خلاف قانون بلا لیسنسی ہتھیاروں سے دن دہاڑے کھیلتا پھرتا تھا۔ یہاں دُور دُور اس کے مقابلے پر شہادت کا ثبوت نہیں مل سکتا تھا۔ اس علاقے بھر میں اُس کی مرضی کے خلاف ایسے ویسے سرکاری حکام کے بھی گھٹتے ہوئے پر جلتے تھے اور ستم تو یہ تھا کہ جواب دہی اور عذر داری کے لیے شاذ و نادر ہی عدالت آتا اُلٹی سیدھی کسی دعوے نالش میں وکیل کی معرفت کبھی کرادی تو کرادی ورنہ وہ تو موقع پر قبضہ کیے ہوئے تھا۔ کئی مرتبہ دیوانی عدالت سے چچا مرحوم کو باضابطہ دخل ملے مگر قبضہ نہ کر سکے، پھر نالش کی ڈگری لی اور پھر یہی ہوا۔ یہاں تک کہ بارہ سال سے اُوپر ہو گئے اور اب اسے مخالفانہ قبضے کی ٹیک مل گئی میں نے دو سال کی مقدمے بازی میں بھی وہی کیا جو چچا نے کیا تھا تین مرتبہ دخل لیا اور جب قبضہ نہ ملا تو چچا کی طرح فوج داری اور فساد لام بندی کرانے کا انتظام کرنے کے بجائے ایک دوست کی رائے سے دوسری اسکیم بنائی، جس کی پہلی مد تو یہ تھی کہ اس علاقے کے زرخیز ترین حصے پر پاسیوں کا ایک گاؤں بسا دیا جائے اور یہ کام کچھ اونٹ کی چوری بنولے بنولے کے مصداق بڑی خوب صورتی اور سکون کے ساتھ انجام دیا۔

گاؤں بسانا تو درکنار وہاں میرے آدمی کا جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا اور بھلا سیدھے سیدھے وہ گاؤں بسنے ہی کیوں دیتا مگر پاسی نیم خانہ بدوش قوم ہے اور اُن کے بہت سے قبیلوں میں شکار کے سلسلے میں میرا رسوخ تھا۔ اُن کا رجحان شکار اور صحرائی زندگی کی جانب زیادہ ہے ویسے اُلٹی سیدھی کھیتی بھی کرتے ہیں بڑے جفاکش، دلیر اور طاقت ور اور ذرا سے سہارے پر جرائم کی جانب مائل ہو جانے والے شکار کھیلنے میں سر دھڑ کی بازی لگا کر سکتے ہیں اپنی اور دوسرے کی جان کی شکار سے زیادہ قیمت نہیں سمجھتے۔ میں اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور تھا کیونکہ میرے کان میں اس قسم کی افواہیں آ چکی تھیں کہ سنگھ بالو میرے قتل کرانے کی تاک میں ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ کچہری میں کوشش کی کہ کم سے کم سنگھ بالو کی شکل تو دیکھ لوں پھر ذرا اشتیاق بھی تھا، اُس کے قابو اور اثر کا تو مجھے اپنے مقابلے پر خوب ہی اندازہ تھا اور سُنا تھا کہ بڑا باکا شکاری بھی ہے لیکن کچہری خاص میں مجھ سے مقدمے بازی کے دوران میں سنا کہ وہ ایک مرتبہ یوں ہی ذرا دیر کو آیا اور میں اسے دیکھ بھی نہ سکا۔

اسکیم کے مطابق پاسیوں کے ایک مضبوط اور جیوٹ قبیلے نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ قبضہ کرنے کے لیے اس علاقے کے زرخیز ترین حصے میں اپنے ڈیرے ڈالے جو علاقے میں جگہ جگہ آئے دن ہر سال نظر آتے رہتے تھے۔ سنگھ بالو اس پر کیوں چونکتے۔ اسکیم میں پہلے سال قبضہ اور دوسرے سال سنگھ بالو کا قتل تھا، ایسی خاموشی کے ساتھ کہ کسی کو ہوا نہ لگے۔ انھیں اور کیا چاہیے تھا۔ زرخیز زمین اور شکار سے بھرا ہوا جنگل، پہلے سال جاڑوں میں ڈیروں کے چاروں طرف چپکے چپکے مٹی کی دیواریں اُٹھیں اور سنگھ بالو کو کانوں کان خبر نہ ہوئی گرمیاں آتے ہی اور سرکرا خشک ہوتے ہی جھونپڑیاں پڑ گئیں۔ سنگھ بالو چونکے ہی تھے کہ برسات ہوتے ہی جھونپڑیوں کے اردگرد بھینسوں کے ہل چلنے لگے اور دوسری بارش پر لہلہاتا گاؤں "پس گنواں" نمودار ہو گیا مگر نمودار ہونے کے بعد بھی سنگھ بالو خاموش بیٹھے رہے۔ فصل اُٹھنے پر معاملہ اُٹھا رکھا لیکن جب دھان اور جوار کی بٹائی کرنے سنگھ بالو کے آدمی پہنچے تو پاسیوں نے دھتکار دیا۔ اس وقت سنگھ بالو کو پتہ چلا کہ یہ کون سی اسکیم کے تحت گاؤں آباد ہوا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندیشہ ہوا کہ مقابلہ کرتا ہے کہیں پانچ ہزار سال پرانی تاریخ نہ اُلٹ پڑے میرے اور پاسیوں کے درمیان یہ معاہدہ تھا کہ جتنے رقبہ اراضی پر وہ پہلے سال میں قبضہ کریں گے اُس پر ہمیشہ کے لیے لگان معاف رہے گا اور اسی عطیے کے سلسلے میں سنگھ بالو کے قتل کی خدمت مضمر تھی تیسرا سال لگ گیا۔ ان تینوں سالوں میں میں نے اپنی جاسوسی تیز کر دی اور مجھے برابر اطلاعات بھی ملتی رہیں۔ دو ایک موقعوں پر اندازہ بھی ہوا کہ سنگھ بالو میرے قتل کی سازش کر رہا ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی فطری امر تھا۔

اگرچہ علاقہ میری جائے قیام سے سو سوا سو میل پر تھا اور پختہ سڑک اور

سب تنگ

ریل سے پندرہ بیس میل دور افتادہ تھا۔ میں قصبے میں رہتا تھا پھر بھی اپنے گھر پسرات کو اپنی حفاظت کے خاص سامان کرنا پڑتے کیونکہ کبھی کبھی خبریں کچھ ایسی ویسی کان میں آتی رہتی تھیں لیکن پپس گنواں بسنے کے تیسرے سال مجھے فصلِ ربیع کی تیاری کے وقت سیاستہ آنا پڑا، مجھے میرے آدمیوں نے خبر دی تھی کہ پاسیوں نے زمینیں بہت زیادہ آباد کرلی ہیں، اُدھر کے دو سال میں بڑی پیداوار لی ہیں اور ان سالوں میں جتنی زمینیں شاداب کی ہیں اُن کا مالیہ وصول ہونا چاہیے مگر پاسی اس پندار میں ہیں کہ میاں ڈر کے مارے اس علاقے میں گھس نہیں سکتے اور اسی لیے سنگھ بالو کو قتل نہیں کرتے کہ اس کے بعد میاں بے خوف ہو جائیں گے اور باضابطہ مالیہ بٹائی وصول کرنا شروع کر دیں گے۔ اس طرح انھوں نے پپس گنواں اپنی خود مختار "نخرچی" ریاست بنالیا ہے اور ہر برسات میں حدود پھیلاتے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اُن کے دل سے صرف یہ بات نکالنے کے لیے کہ میں اس علاقے میں سنگھ بالو کے ڈر کے مارے گھس نہیں سکتا، میرا یہاں آنا ناگزیر تھا اگرچہ اس میں مجھے یک گونہ خطرہ بھی تھا اندیشہ یہ تھا کہ کہیں یہ پاسی ہی دبا کر نہ بیٹھ جائیں۔ چنانچہ پیمائش، پڑتال اور وصول یابی کے کام کا بہانہ بنا کر میں یہاں پہنچا اور کئی دن قیام کیا۔ اگرچہ میں یہ سمجھتا تھا کہ سنگھ بالو کے راستے کا سب سے بڑا کانٹا میں ہوں اور وہ اسے ہٹا کر ایسے بلائے پاسیوں پر بڑی آسانی سے قابو پا سکتا ہے اور وہ تو ویسے ہی ہمیشہ سے صاف کرنے کی فکر میں تھا، یہ اور برا علاج ہو گیا مگر پاسیوں کو بھی تو زیادہ ڈھیل مناسب نہ تھی معاہدے کی رو سے دوسرے ہی سال کے اختتام پر وصول یابی ہونی چاہیے تھی۔ یہ تو تیسرا برس تھا۔ جان خطرے میں ڈال کر مجبوراً آنا ہی پڑا۔ دو ہفتے قیام کی اسکیم تھی۔ یہاں ان پاسیوں کے درمیان بڑی آؤ بھگت ہوئی اور دوسرے ہی روز میرے دل سے خوف نکل گیا۔

پاسی میری سب سے بڑی کمزوری کے بھی محرم تھے۔ تین سال میں کچھ کاشت کارانہ مزاج بھی مرتب ہو گیا تھا، اُنھیں خوب علم تھا کہ میاں شکار کے رسیا ہیں، پرانے ساتھی ہی جو تھے۔ اُنھوں نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ دو سال سے ہماری حد میں سنگھ بالو شکار کو بھی نہ آپائے ہیں اور پھر مجھ پر روغنِ قاز ملا کہ دو سال سے میری آمد کے لیے اُنھوں نے جنگل کے مخصوص قطعے کا شکار رکھا ہے۔ بڑا کامیاب شکار رہے گا اور میرے پہنچنے کے چوتھے ہی روز مجھے شکار کے شوق کی بارھوں پر رکھ کر جنگل میں دھر دیا۔ یوں تو میں بھی جانتا تھا کہ میرا پگ اسٹکنگ کا شوق یہیں پورا ہو سکتا ہے اور یہ پانچ ہزار سال پرانی چیز ہے جب آدمی نے گھوڑے اور کتے کو مطیع کر لیا تھا اور ہمارے تمدن کا قافلہ گپھاؤں اور جھونپڑیوں کے درمیان کا فاصلہ سلو موشن میں طے کر رہا تھا اور اقتصادیات کا اولین تخیل جانوروں کی ملکیت کی شکل میں رونما ہوا تھا۔ آج بیسویں صدی کے وسط میں ہم تہذیب و ارتقا کی مصنوعات سے گریز کر کے پلٹ پڑتے ہیں تو کبھی کبھی فری اسٹائل کشتی اور پگ اسٹکنگ جیسے کھیل کھیلتے ہیں۔ ایک پتلا سا برچھا، ایک سدھا ہوا تیز گھوڑا اور اپنا ہاتھ اپنی ران، اور چٹان جیسے جنگلی سور سے جا بھڑتے ہیں

افغانستان

کا سابق حکمراں امیر امان اللہ خاں اپنی معزولی کے زمانے میں ایک بار دکن کے نواب بہادر یار جنگ سے ملا۔ اُس نے بہادر یار جنگ سے کہا کہ "آپ میرے متعلق کچھ کہیے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟"

بہادر یار جنگ نے جواب دیا "عزیز برادر! آپ ایک ایسے بادشاہ تھے جو نئی سڑک بنائے بغیر نئے زمانے کی موٹر دوڑانا چاہتے تھے۔ اسی جلد بازی کی وجہ سے آپ کی حکومت ٹوٹ گئی۔"

*

پگ اسٹکنگ شکار کے جارحانہ اقدام کی انتہا ہوتی ہے۔ خالص شکاری شکار پاسیوں نے ناگ پھنی اور جھاؤ کے جنگل میں کئی جگہ سے سوروں کی داڑیں اُٹھائیں اور میدان میں نکالیں مگر میرا موقع نہ لگا۔ چھ بجے صبح سے بارہ بجے دن تک مسلسل پشتِ زین پر رہنے کے بعد میری رگ رگ دُکھ گئی ستارہ بھی ہلکان ہو گئی اور پیہم ناکامی نے اور بھی زیادہ چور کر دیا۔ میلوں اِدھر سے اُدھر دوڑنے کے بعد پلٹ رہا تھا۔ پیاس کی شدت میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لکڑی کی میخ حلق سے معدے تک ٹھکی ہوئی ہے۔ سر پر بندھے ہوئے رومال سے سورج کی کرنیں سوئی کی نوکوں کی طرح کھوپڑی میں نفوذ کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ پہلے ہی روز چار پانچ وار خالی گئے اور اب تو مدتوں کا خاموش جنگل چھڑ گیا تھا۔ کل بہت کم اُمید تھی۔ ساتھی گم ہو گئے تھے۔ سمت کی سُدھ بُدھ بھی بھاگ دوڑ میں مٹ گئی تھی۔ میں ستارہ کی جبلت پر اطمینان کیے ڈھیلا ڈھالا لدا ہوا سا سفر کر رہا تھا اور میں نے نظر اُٹھائی تو ماحول بالکل ویران اور قطعاً نامانوس اجنبی سا معلوم ہوا۔ نہ معلوم یہ مجھے کہاں لیے جا رہی ہے۔ میری طرح اس علاقے میں یہ بھی تو بالکل نو وارد ہے۔ یہ پاسی کم بخت کدھر رم گئے۔ میں نے پھر اپنے صبح سے اب تک کے چکروں کا نقشہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پپس گنواں کی صحیح سمت کا تعین کرنا چاہا، موجود و قریب نظر سے پیمائش کی مگر کوئی تخیل قائم نہ کر سکا۔ اب مجھے اپنی تنہائی اور اس نامانوس ماحول میں وحشت سی ہونے لگی۔ ہر قدم پر جیسے فضا اور ماحول کی اجنبیت فزوں تر ہوتی محسوس ہوئی۔ کہاں چلا جا رہا ہوں۔ جیسے کسی نے اندر سے آواز دی۔ وہ تو اس علاقے کا شیر ہے مجھے یقیناً پہچانتا ہے اور میں تو اسے پہچانتا بھی نہیں ہوں کہیں پیچھے نہ لگ جائے۔ ایک جھرجھری سی میرے تمام رگ و پے میں دوڑ گئی اور نظریں دُور دُور پڑنے لگیں۔ سیدھے ہاتھ میں لٹکتا ہوا برچھا مضبوط ہو کر از خود تن سا گیا، راسیں پکڑے ہی پکڑے ہاتھ کی کہنی نے شکاری کوٹ کی جیب ٹٹولی، جس میں تو فیر ابھرا ہوا تمنچہ پڑا تھا۔ پھر خیال آیا کہ سنگھ بالو بھی سُننے میں بڑا دھتی شکاری ہے اور اس علاقے کے چپے چپے پر اُس کی شکاری مہمات کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ اُس کے ساتھ کبھی شکار کا موقع کاہے کو ہو سکتا ہے۔ اللہ بچائے اُس سے تو کبھی مقابلہ ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ وہ تو ایک گنوار لٹھ قسم کا شکاری ہے۔ میں نے تو باقاعدہ سائنٹفک نشانے بازی سیکھی ہے مگر بندوق کا مقابلہ بہت ہی بری چیز ہے۔

اس میں وہی بہادر کہلاتا ہے جس کا ہاتھ انچ بھر پہلے اُوپر اُٹھ جائے اور اوّلین پھرتی میں مدِمقابل کے سینے پر گولی دے جائے۔ میں نے نزدیک اور دور پھر نظریں پھینکیں اب کی مرتبہ تنہائی اور ویرانی اور بھی زیادہ محسوس ہوئی۔ ہُوں یہ پاسی سالے کا ہے کے لیے ہیں آج ہی جا کر دونوں سال کا لگان معاف کرنے کا اعلان کروں گا بشرطیکہ وہ اس فصل کے آخر تک سنگھ بالو کا خاتمہ کردیں۔ اب تو میں یہاں کا دورہ بھی کر چلا۔ ان کی ہمتیں اور بڑھ جائیں گی اور سنگھ بالو کا رہا سہا خوف بھی نکل جائے گا۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے اس دورے کی علاقے میں خاصی شہرت ہے اور اس سے میرے مدِمقابل کی پرسٹیج کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔

میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی تھی کہ ایک دم ستارہ کنوتیاں بدلنے لگی۔ انگ انگ پر چنگاریاں سی چٹخ اُٹھیں اور دور میدان میں نگاہیں پھینکنے لگی۔ جب میں نے اُدھر نگاہ ڈالی تو بڑی دور میدان میں سؤر بڑے اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ اکڑا ہے۔ سؤر گلّوں میں رہنے والا جانور ہے اور جو اکیلا رہ جاتا ہے، وہ بہت ہی پریشان نظر آتا ہے۔ جو سؤر اکیلا اطمینان کے ساتھ نظر آئے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اکڑا ہے۔ اکڑا عام سؤروں سے علیحدہ اپنے منفرد سورپن کا حامل ہوتا ہے۔ ساتھیوں سے لڑنے والا اور سب کا حصہ چٹ کر لے جانے والا۔ زیادہ جسیم، طاقت ور اور پھرتیلا، شکاری کو پہچاننے والا اور کچھ نہ کچھ ایسی خصلتوں کا حامل جو سؤر کی خصلت کے منافی ہیں۔ اسے دیہاتی اور جنگلی کسان اور شکاری اپنی اصطلاح میں اکڑا کہتے ہیں۔ ہر جنگل میں ایک دو اکڑے ہوتے ہیں جو اپنی حکومت کی حدود قائم کیے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے اندر کسی کو پھٹکنے نہیں دیتے۔ ستارہ کی نگاہ بار بار اُٹھتے ہی میں نے دیکھ لیا۔ فطری طور پر میں ذرا سنبھلا، آسن جما، ستارہ کی نازک کنوتیاں اور تیکھے تیور اُترنے چڑھنے لگے۔ آنکھیں ہرنی کی سی وحشت کے ساتھ چمک اُٹھیں اور ذرا راسیں سنبھالتے ہی اور آسن جمانے ہی جسم میں بجلی سی لہرا اُٹھی۔ پگ اسٹکنگ اور پولو کے گھوڑے گھوڑیاں بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں اور کھیل میں کسی نہج سوار سے کم انہماک نہیں رکھتے۔ میں آہستہ سے مٹھارا تو ستارہ نے بڑی سُریلی ہوں ہوں میں جواب دیا اور جب ذرا برچھا مضبوط کر کے سیدھا کیا تو فورِ شوق میں اچھل کر جا پڑی اور دوڑنے کا انداز بنانے لگی۔ میری اور مجھ سے زیادہ ستارہ کی تکان چستی میں بدل گئی۔ وہی تندی اور شوق جو صبح پہلے چانس پر تھا، رگ رگ پر پھڑک اُٹھا مگر فاصلہ ابھی زیادہ تھا اور سور کو خطرے کا کوئی احساس نہیں تھا، بہت ہی سکون کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے راسیں روک لیں اور بدستور ذرا چست شاہ گام چلنے دیا۔ وہ میرے مخالف سمت آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ پر تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر محاذ میں آ کر گزر گیا۔ میں نے ستارہ کو موڑا۔ اب سامنے میدان تھا اور سور۔ پیچھے پیچھے ستارہ۔ یہ میدان دو جانب دریا کے کناروں سے ملا ہوا تھا۔ سؤر آہستہ آہستہ زمین سونگھتا بے خبر دریا کی سمت بڑھ رہا تھا۔

میں نے ستارہ کو اشارہ کیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اچھلی اور آندھی دھاندی سرپٹ چلی۔ سؤر نے بھاگنا شروع کیا مگر ستارہ نے اپنی دوڑ اور زمین کا فاصلہ منٹ بھر میں ہڑپ کر لیا اور جیسے چار ڈگوں میں گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ پگ اسٹکنگ کی گھوڑیاں شکار کے وقت شکاری سے زیادہ خون کی پیاسی ہو جاتی ہیں۔ شکاری تو اُن کا ایک ہتھیار سا ہوتا ہے، دراصل شکاری تو وہی ہوتی ہیں، برچھے کی نوک اور سور بھوئے پر باریک ہیں نظریں جمائے رفتار ریگولیٹ کیے چلتی ہیں۔ سؤر کے ساتھ ساتھ اسی سمت اور کان سوار کے کاشن پر لگائے رہتی ہیں اور اشارہ سُنتے ہی دوڑتے دوڑتے رفتار ایک جھٹکے میں تبدیل کر دیتی ہیں، ایک ایسا جھٹکا جس میں پلک جھپکتے میں رفتار عمل اور ردِعمل کی حرکت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جاری بھی رہتی ہے۔ جھٹکے کے ساتھ برچھے کی نوک سؤر کے پہلو میں داخل ہو کر اور قلب فگار کر کے باہر آ جاتی ہے اور شکاری کو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھوڑے کی پوری طاقت اس کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی ہے۔ رکاب آسن، اُس کا ہاتھ اور لمبا برچھا تک ایک میکانکی انداز میں گھوڑے کے جسم کا جزو سا بن جاتے ہیں۔ ایک عجیب میٹھی میٹھی سی لپک شکاری کے دائیں پہلو سے لے کر بازو، کلائی اور پہنچے تک لہرا جاتی ہے اور صریحاً محسوس ہوتا ہے کہ گھوڑے کا جھٹکا ہمارے ہاتھ سے بالکل اپنے بدن میں ضم کر کے کام لے رہا ہے۔ اسے علم الحرکت کے ماہر ہی سمجھ سکتے ہیں، نہ شکاری نہ گھوڑا۔ شکاری کو تو کبھی کبھی ایک جادو جیسا عمل متحیر کر دیتا ہے جب یہ جھٹکا اوچھا پڑتا ہے، یہی اس وقت ہوا۔ سوا تین من کی لڑھکتی ہوئی بھوری چٹان برچھے کی انی سے اُچھل کر گھوڑی کے سامنے چار پانچ گز کے فاصلے پر جا گری۔ نہ معلوم میں نے کاشن غلط پوائنٹ پر دے دیا۔ ستارہ رفتار اور جھٹکے کا صحیح توازن نہ کر سکی بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے شدید اور خلافِ عقل حادثے میں نہ تو شکاری کے نحیف ہاتھ کا دخل ہو سکتا ہے نہ تیلے سے نیزے کا کہ تین من وزن اچھل کر جا گرے، یہ طاقت اور عظمت کا کرشمہ ہوتا ہے اور ہارس پاور ہی سے ایسے شعبدے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ شاید یہ رفتار اور مخصوص جھٹکے کے عدم ربط ضبط کا کھیل تھا۔

ٹریننگ کے مطابق حملے کے کچھ فوراً اچھل کے گھوڑا آن کی آن ٹھیر کر حملے کا نتیجہ دیکھتا ہے اور اگر ضرورت ہوتی ہے تو دوسرا چارج کرتا ہے۔ ستارہ ابھی اچھی طرح ٹھیر بھی نہ پائی تھی کہ اس نے سؤر کو اپنے اوپر حملہ کرتے پایا، اپنی سرشت کے بالکل خلاف سور پلٹ پڑا اور توپ کے گولے کی طرح شعلہ سا لپکتا' دوسرے لفظوں میں موت جھپٹی، مجسم قضا، مضبوط تھوتھنی اور دھار دار کٹاریں سیدھی کیے۔ اُس نے ستارہ کی اگلی ٹانگوں کے درمیان سینے پر وار کیا۔ کوہ شکن انداز میں تھوتھنی اور کانپیں بھڑا ہی دی تھیں مگر ستارہ کمال چابک دستی سے الف ہو گئی۔ اُس نے دوسرا وار دو فٹ بڑھ کر ستارہ کے پچھلے حصے پر کیا اور پیٹ پر تارپیڈو مارا، اگلی ٹانگوں پر ٹک کے ستارہ نے دولتی جھاڑی اور اس طرح اپنی آہنیں ڈھیر ہونے

سے بچائیں اور کان کی نوکوں سے پچھلے سُموں تک بجلی کی طرح لہرا گئی مگر ان متصلو حرکتوں کی تاب نہ لا کر میں پشت زین سے نیچے آ پڑا۔ ایک قلابازی اُوپر کھائی، دوسری نیچے، اور دوسری میں کچھ حصّہ جسم گھوڑی کے گرد لپٹے ہوئے سُور پر آ آیا۔ بچ گئے ہم تو قضا لوٹ گئی" سُور نے ضرور خیال کیا ہو گا کہ شکاری سے یا بھوت اُوپر پھاند پڑا۔ خیریت گزری تھوڑا سا زخم اور ایک پیچ کھا کر بھاگ پڑا اور لُطف یہ کہ حیوانی سرشت کے بالکل منافی، اُلٹا اُدھر ہی جدھر سے میں نے تعاقب کر کے حملہ کیا تھا۔ قلابازی کھا کر شاید میں اسی تیزی سے کھڑا ہوا جس تیزی سے گرا تھا۔ میرے قریب برچھا مٹی میں گڑا ہوا تھا اور ستارہ رفتار میں بھری مجھ سے پچاس ساٹھ گز دُور جا پڑی تھی۔ برچھا پکڑ کے میں ستارہ کی جانب لپکا اور ستارہ میری جانب دوڑی۔ موقع کی نزاکت اور بیتے ہوئے حادثے کی شدت، ہر چیز پر ابتدائے آفرینش والا شکاری سوار تھا۔ چند سیکنڈ پیشتر والے حادثے سے بچ نکلنے کی اہمیت کا ذرا بھی شائبہ دماغ میں نہ تھا۔ نہ یہ کہ بیسویں صدی میں پگ اسٹکنگ کا اقدام ہزار سال پرانی حماقت ہے۔ سامنے اُدھے میل کے فاصلے پر سُور بھاگا چلا جا رہا تھا۔ میں رکاب میں پاؤں چھوئے بغیر ذرا آیال پکڑ کر ایک جست میں ستارہ کی پیٹھ پر لنگور کی طرح جا بیٹھا اور تقریباً دو منٹ کی دوڑ میں ستارہ نے پھر سُور کو جا لیا۔ تقریباً ایک فرلانگ برچھا لگائے گھوڑی کے آگے آگے کھدیڑا پایا ہوں گا اور برچھے کی نوک اور سُور کے شانے سے مخصوص زاویہ بنا کر گھوڑی کو کاشن دینے ہی والا تھا کہ سُور پھر پلٹ پڑا اور حملہ کیا مگر اب کی مرتبہ ستارہ پہلے سے زیادہ چوکنی تھی تیور بدل کے چل رہی تھی پیشتر اس کے کہ سُور ٹانگوں تک پہنچ سکے، بڑے فن کارانہ انداز میں رفتار جست میں تبدیل کر دی اور ایک پھرتیلے باز کی طرح پینترا سا بدل کر سُور کے پیچھے جا گری گویا شکاری کو قاعدے کے مقام پر پہنچا کر پھر شکار کا سماں باندھا لیکن گر کر سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ سُور اس کے ساتھ ہی دوسرے حملے کے لیے سیدھا ہو گیا اور ستارہ نے پھر اسی داؤ پر حملہ خالی دیا۔ شاید دوسرے تیسرے حملے تک میری شکاری اسپرٹ قائم رہی اور میں ہر لحظے منتظر رہا کہ بھاگتے ہی بھرپور نیزا جماؤں گا۔

مگر حملے اور بچاؤ میں میرا جذبہ بہت جلد مدافعانہ شکل اختیار کرنے لگا۔ اگرچہ ستارہ نیولے اور سانپ والے انداز میں کھیل رہی تھی حملوں کی تندی شدید تر ہوتی گئی۔ ستارہ ایک ماہر بنوٹ کی طرح دائیں بائیں پیچھے گرتی رہی اور دس بارہ من وزنی جسیم منٹر کی طرح لہرا کر اِدھر سے اُدھر پھینکتی رہی اور اکڑا اُچٹان سا سُور چنچنتے سانپ کی طرح اچھل اچھل کر حملے پہ حملہ کرتا رہا۔

اب ستارہ مدافعت ہی مدافعت کرتی رہ گئی تھی، شکار بھول سا گئی تھی اور مجھے تو شروع ہی میں اندیشہ ہو گیا تھا کہ آثار اچھے نہیں ہیں اور سُور اپنی عافیت تابڑ توڑ حملوں ہی میں سمجھتا ہے۔ تین چار منٹ گزر گئے اور ایسا محسوس ہوا کہ جگ بیت گیا۔ معلوم ہوا کہ موت و زیست کے میدان میں پٹنے کھا رہا ہوں ۔۔۔ وہ کم بخت پیہم حملوں میں اتنا موقع بھی نہ دیتا تھا کہ پل بھر کے لیے گھوڑی کو ذرا کنٹرول کر کے میدان سے فرار ہو سکوں۔ پیہم حملوں کے بچاؤ میں مسلسل جستیں تھیں۔ میں دو حملوں کے درمیان بمشکل ایک پینترا مدافعت



کر رہا تھا۔ برچھا پھینک کر تمنچہ نکال لینے کا خیال آیا مگر وہ بھی بیکار ثابت ہوتا اور برچھا بھی ہاتھ سے جاتا۔ شدت بڑھتی ہی چلی گئی۔ ہر حملے میں ستارہ بال بال بچتی اور مجھے ستارہ کی آنتیں ڈھیر نظر آئیں پھر اپنا انجام۔ دوسرے چار پانچ منٹ اور گزر گئے اور ہر منٹ میں دو مرتبہ موت میرے سامنے آئی اور اب تو ستارہ زمین پر اچھی طرح آنے بھی نہ پاتی تھی کہ وہ موذی سیدھا ہو جاتا تھا۔ پھر یہاں زمین بھی خشک تھی سؤر کے ہر حملے اور ستارہ کے ہر پینترے پر ریت کا بگولا سا اٹھتا۔ نہ معلوم کتنی ریت میرے حلق اور کانوں میں ٹھنس گئی۔ بعض مرتبہ یہ گرد مدافعت میں مانع ہوتی۔ اب ستارہ کا بھی جی چھوٹ گیا، عاجز سی ہو گئی۔ جستوں میں بدحواسی سی نمایاں ہونے لگی۔ ایک آدھ مرتبہ تو بالکل دھر ہی لیا تھا نہ معلوم کیسے بچی۔ سؤر مسلسل حرکت اور مجسّم حملہ تھا اور ستارہ پینترے ہی پینترے، جستیں ہی جستیں، ہر حملے میں موت نظر آتی تھی اور ہر پینترے میں نئی زندگی ملتی تھی اور ابھی نئی زندگی پانے کا احساس بھی شعور میں اچھی طرح نہ ابھرتے پاتا تھا کہ نئی موت سامنے آجاتی تھی۔

نگاہ ہٹنے کا موقع نہ تھا لیکن شاید کسی آواز پر میری اٹھتی سی نظر پل بھر کے لیے اٹھی کچھ دور ناگ پھنی کی جھاڑیاں تھیں۔ وہاں کہیں سے مجھے ایک آدمی سا نظر آیا۔ ایک آواز ہمت بندھاتی کان میں پڑی۔ نگاہ تو خیر ایک آن میں موت سے زندگی کی راہ ڈھونڈنے پلٹ آئی مگر کان البتہ آواز پر لگ گئے اور شاید حملوں اور بچاؤ کی دو تین اُلٹ پلٹ اور ہو پائی ہوں گی کہ کوئی بڑے زور سے دوڑا۔ ایک قد آور انسان برچھا سیدھا کر کے ہمارے مجادلے میں پھاند پڑا اُس نے بڑے زور سے سؤر کو ڈپٹا۔ اُس کی للکار سے ستارہ کی ہمت بندھی اور میرا جی ٹھیرا۔ سؤر نے اُس پر بڑے زور سے چارج کیا۔ اُس نے بہت ہی مختصر سا پینترا کاٹ کر وار خالی دیا اور اب وہ مقابلے میں نصف کا شریک ہو گیا۔ مجھے فرار ہونے کے لیے میدان خالی تھا مگر یہ سوال تو اس موقع پر میرے ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا۔ اُس کے بشرے پر اطمینان تھا۔ دو ایک مرتبہ للکار کر اُس نے مجھے ہدایت دی جو وہ مجھے پہچانتا تھا، شور زیادہ مچا رہا تھا اور سؤر کو للکار للکار کر اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ بار بار ستارہ کو ڈپٹ ڈپٹ کر ہدایت اور باڑھ دیتا جاتا تھا بچاؤ اور حملے کی صورتوں میں مجھے آگاہ کرتا جاتا تھا اور اپنا بچاؤ تو بڑے فن کارانہ انداز میں یک گونہ شانِ استغنا کے ساتھ کرتا تھا۔ مجھے نظر آیا کہ اُس کے کندھے پر رائفل لٹکا ہوا ہے مگر ایسے موقع پر وہ بھی میرے تمنچے کی طرح بیکار تھا۔ ستم یہ کہ ایک مرتبہ جب سؤر مجھ پر حملہ کر رہا تھا، اُس نے موقع پا کر اسے زخمی کر دیا مگر برچھا بدن کے پچھلے حصے پر پڑا تھا اور بپھرے ہوئے سؤر پر بے اثر تھا پھر تو سؤر شعلے کی طرح لپکنے لگا مگر اُس کے اطمینان اور دم خم میں فرق نہ آیا۔ بار بار جنگل کی جانب بلند آواز دیتا تھا، کسی کو پکار رہا تھا۔

دُور زمین پر پیچھے سے متحرک معلوم ہوئے اور پلک مارتے کتوں کی ایک پوری ٹیم نظر آئی۔ کتے تیر کی طرح جھپٹے اور اُس نے بڑی جوشیلی آواز میں باڑھ دی۔ "واہ بیٹا! مارا استاد!"

ایک گرانڈیل کتا بجلی کی طرح ٹوٹا، ردِ عمل میں کالا کالا چھیچھڑا سا اُڑا اور لال سفید رتیاں سی پھیل گئیں لیکن پیچ کھا کر اسی تیزی سے غٹ پٹ ہو گیا۔ استاد سیدھا سؤر کے ٹیٹوے پر چلا تھا مگر سؤر نے اسے کانیوں پر رکھ کر اچھال دیا تھا اور آنتیں بکھیر دی تھیں لیکن گرم خون اور جوش میں آنتیں گھسیٹتے ہوئے استاد نے سؤر کا ٹیٹوا پکڑ ہی لیا اور استاد کے منہ ڈالتے ہی سب کے سب چھڑی ہوئی بھڑوں کی طرح سؤر کی رگ رگ سے چمٹ ہی گئے اور وہ آدمی ایک ایک کتے کا نام لے لے کر بڑی جوشیلی آواز میں باڑھیں دیتا رہا۔ ایک آن کی آن تو شکنجوں میں نظر آیا اور پھر گیارہ شکاری کتوں کے دانتوں میں چٹان سا سؤر روئی کی طرح دھنک گیا۔

موت کا سناٹا تمام ماحول پر طاری ہو گیا۔ کچھ اور آدمی بھی آگئے تھے اور ایک گھوڑی کائنات کو اپنے آپ کا ہوش آیا، نئی زندگی میں ایک نظر پڑتالا۔ میں چوٹی سے ایڑی تک شرابور تھا۔ ستارہ کے سُموں پر پسینہ مل رہا تھا اور استاد کی روح تو شاید سؤر کی پہلی ٹکر پر ہوا ہی میں پرواز کر گئی ہو لیکن خون خوار شکاری جسم الاماں اب بھی جہاں کا تہاں ٹیٹوے پر جبڑا جمائے چمٹا رہ گیا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھا اور کچھ دور کھڑا استاد کی لاش کی جانب دیکھ دیکھ کر بسور رہا تھا۔ ڈھیلا ڈھیلا، رنج و غم میں زیر و زبر میں اُتر پڑا، برچھا پھینک کر اُس کی جانب سیدھا بڑھا لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔ وہ میری جانب دیکھ کر ترچھا ہو کر تن گیا اور برچھا سنبھالا، تیوروں میں اجنبیت سی پیدا ہو گئی اور انداز جیسے کچھ جارحانہ سا۔ ذرا اور قریب پہنچ کر میں نے وفورِ جوش میں آغوش پھیلائے، بے اختیار جی چاہا کہ اُسے بھینچ کر پیار کر لوں، اُس کے ہاتھ چوم لوں، اُس کے خالص شکاری جذبے اور بہادری کو سراہوں اور جب میں بالکل ہی قریب پہنچ گیا تو وہ ڈھیلا ہو گیا برچھا لٹک گیا اور جب میں نے شاید مخصوص شکاری اصطلاح میں کوئی توصیفی لفظ منہ سے نکالا تو خلافِ توقع وہ مڑ گیا اور جیسے حقارت کے ساتھ منہ پھیر گیا اور پلٹ کر اپنی گھوڑی پر سوار ہو گیا اور مڑ کر چل پڑا۔ "ٹھیرو بھئی!" میں نے آواز دی مگر جیسے اُس نے سنی ہی نہیں۔ آہستہ آہستہ گھوڑی بڑھا دی۔

"کیا انداز تھا اس کا ایں؟" میں دل ہی دل میں متحیر ہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک منٹ سکوت کیا مگر وہ چلا ہی گیا۔ پلٹ کر اُن آدمیوں کے قریب آیا جو سؤر کے منتیھڑے سنبھال رہے تھے اور پوچھا کہ یہ کون تھا؟

"ایں آپ نہیں جانتے؟ اور وہ تو آپ کی آواز سن کر آئے تھے سنگھ بابو۔"

"سنگھ بابو" سنتے ہی یک دم جیسے کائنات بھری میں دم بخود خلاؤں میں جا پڑا جیسے کرۂ ارض کی گرمی تھی اور ہوا، سب کچھ شکاری جذبے کی عظمتوں میں بدل گیا اور جب میں نے اُدھر نظر کی تو اندازہ کیا کہ وہ اپنی گھوڑی پر مجھ سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ میں اُس کی گرد کو بھی نہ پہنچتا۔



چارہ

انتھونی مارش ★ نرگس جمیل

ایک بینک کا قصہ

منیجر کا حکم تھا کہ بینک میں ڈاکوؤں کا خاص خیال رکھا جائے۔

مغرب سے تازہ بتازہ | ایک دل پذیر | خوش نما تحریر

"سنو ایلکس" بینک منیجر نے دستی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپنے بینک کی یہ پالیسی قائم رہے گی اس لیے میں تمہارے کسی منصوبے میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ تمہارے منصوبے پر عمل کرنے سے بینک کی پالیسی متاثر ہوگی۔"

"درست ہے جناب! لیکن میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ڈاکو بینک لوٹتے رہیں اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔"

"بینک کے تمام ڈائرکٹروں کا یہ خیال ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ قطعی صحیح ہے حالانکہ تم اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا کہتے ہو۔ ہمیں یہی کرنا چاہیے۔ بینکاری کی تجارت میں نقصانات پہنچنے کی کئی وجوہ ہوتی ہیں۔ ان وجوہ میں ڈاکا پڑنا بھی شامل ہے۔ ڈاکے کا امکان کوئی بینک نظر انداز نہیں کرتا اور اسے بھی اخراجات کی مد میں شمار کیا جاتا ہے۔ بینک لٹنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لٹنے کے لیے ہر بینک ہر وقت تیار رہتا ہے اور اس ناگہانی نقصان کے لیے ہر سال کچھ رقم علیحدہ رکھ دی جاتی ہے لہٰذا ہمیں ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کچھ بھی کریں انھیں کرنے دو اور تم صرف اسی کام سے سروکار رکھو جو تمہارے ذمے ہے۔"

"لیکن جناب! گزشتہ چند مہینوں میں ہماری شاخ تین بار لوٹی گئی ہے۔"

"اسے اس شاخ کی بدقسمتی کہہ لو لیکن اب مجھے یقین ہے کہ ہم خاصی مدت تک سکون سے رہیں گے اور فرض کرو اگر یہ شاخ پھر لوٹنے کی کوشش کی گئی تو یہ ہماری مزید بدقسمتی ہوگی۔ اس سلسلے میں تم یا میں کیا کر سکتے ہیں۔"

"میں یہی تو بتانے کی کوشش کر رہا ہوں جناب کہ ہم بہت کچھ کر سکتے

ہیں۔ مثال کے طور پر آخری بار جب ہماری شاخ لُوٹنے کی کوشش کی گئی تھی تو۔۔۔"

"بے شک اُس موقع پر تم نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا، وہ تعریف کے قابل ہے" مینیجر نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن تمہارا وہ اقدام بینک کے دوسرے ملازمین کے لیے مثال نہیں بنایا جا سکتا۔ تم خوش قسمت تھے کہ ڈاکو کا ریوالور خالی تھا لیکن اگر اُس کے پستول میں گولیاں ہوتیں تو اس وقت صورتِ حال قطعی مختلف ہوتی۔ پھر بھلا تمہاری جرأت ہمارے کس کام آتی۔ ہمیں تمہاری صلاحیتوں کی ضرورت ہے، تمہاری بہادری کی نہیں۔ اگر بینک میں گولیاں چل جاتیں تو عوام کی نظر میں ہمارا وقار گر جاتا۔"

"میرا اشارہ جرأت یا بہادری کی طرف نہیں ہے جناب! ڈاکوؤں کو دوسری ترکیبوں سے بھی روکا جا سکتا ہے۔ میں دوسری عظیم جنگ میں فوجی انجینئر تھا، وہاں مجھے چند کاموں کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے تجربات کی روشنی میں۔۔۔۔"

مینیجر نے بے چینی سے دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "بینک کو ایک مشہور انجینئرنگ کمپنی کی خدمات حاصل ہیں۔ وہ ہمارے لیے ہر قسم کا خود کار نظام تیار کر سکتی ہے۔ ڈاکو کو رقم کے ساتھ فرار ہونے سے روکنا ہمارے لیے بے حد آسان ہے لیکن اس قسم کے کسی منصوبے پر عمل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جب ڈاکو فرار کی راہیں مسدود دیکھتے ہیں تو وہ حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور بے تحاشا گولیاں چلانے لگتے ہیں۔ اس طرح بینک کا کوئی ملازم یا گاہک زخمی بلکہ ہلاک ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ڈاکوؤں کو فرار کا پورا موقع فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ گھبرا کے گولیاں چلانا نہ شروع کر دیں۔"

"درست ہے جناب! لیکن جب میں فوج میں انجینئر تھا۔۔۔۔"

"ایلکس! سنو۔ غور سے سنو۔ تم اس وقت جنگ کے میدان میں نہیں ہو اور یہ جنگ کا زمانہ بھی نہیں ہے۔ تم اس وقت بینک کی ایک بے حد مصروف شاخ میں خزانچی ہو اور یہ شاخ شہر کی ایک مصروف ترین شاہراہ پر واقع ہے۔ ڈاکوؤں کو پکڑنا ہمارا کام نہیں ہے، یہ پولیس کا کام ہے۔ پولیس کو اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے اور ہمیں جو تنخواہ ملتی ہے، وہ بینک چلانے کے لیے ملتی ہے۔ بینک چلانا مجرموں کو پکڑنے سے بالکل مختلف کام ہے۔ صاف لفظوں میں یہ بات اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ ہم یہاں دولت بنانے کے لیے آتے ہیں۔ ہم جب تک صحیح خطوط پر بینکاری کرتے رہیں گے، ہمارے گاہک ہمارے پاس آتے رہیں گے اور ہمارے ساتھ کاروبار کرتے رہیں گے لیکن اگر اُنھیں یہ علم ہو گیا کہ ہم یہاں ڈاکوؤں اور محافظوں میں گولیاں چلانے کے مقابلے منعقد کرنا چاہتے ہیں تو وہ یہاں آنا بند کر دیں گے اور ہمارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا، آمدنی بند ہو جائے گی اور ہم دونوں بے روزگار ہو جائیں گے۔ اب تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟ تم سمجھ گئے نا؟"

"درست ہے جناب لیکن۔۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں" مینیجر نے میز پر زور سے گھونسا مارا "مجھے تمہارے ذاتی خیالات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ بینک کو تمہاری بہادری کی ضرورت ہے۔ اچھی طرح سُن لو، تم آیندہ کوئی احمقانہ قدم نہیں اُٹھاؤ گے اور کسی ڈاکو کو روکنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ہماری شاخ میں جو حفاظتی انتظامات موجود ہیں، میں اُن میں کوئی تبدیلی برداشت نہیں کر سکتا۔ سمجھ گئے؟ میں مزید وضاحت کیے دیتا ہوں۔ اگر کوئی ڈاکو بینک لُوٹنے کے لیے اندر داخل ہو اور اُس کے پاس کوئی بھی ہتھیار ہو، چاہے وہ تیزاب کی بوتل ہی کیوں نہ ہو اور وہ تم سے تمہاری دراز کی ساری رقم طلب کرے تو تم کسی حیل و حجت کے بغیر فوراً ساری رقم اُس کے حوالے کر دینا۔ یہ میرا حکم ہے۔ اگر تم نے اس حکم کی تعمیل میں ذرا بھی سستی کی تو تمھیں اُسی دن ملازمت سے سبک دوش کر دیا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس سے زیادہ واضح الفاظ استعمال نہیں کر سکتا۔"

ایلکس ایک جھٹکے سے اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا۔ "بہتر ہے جناب! آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔" وہ فوجی انداز میں مارچ کرتا ہوا مینیجر کے کمرے سے نکل گیا۔ ایلکس بینک میں خزانچی تھا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ بینک کی خاتون خزانچی مس نینسی اُسے دیکھ کر دل آویز انداز میں مسکرائی۔ اُس میں یہ تبدیلی صرف دو ہفتے پہلے آئی تھی۔ دو ہفتے پہلے ایلکس نے ایک ڈاکو کو بینک لُوٹنے سے روک دیا تھا۔ وہ اسی کی کھڑکی پر آیا تھا۔ اُس نے جیسے ہی ریوالور دکھا کے رقم کا مطالبہ کیا، ایلکس اچھل کر کاؤنٹر پر چڑھ گیا۔ کاؤنٹر سے اُس نے ڈاکو پر چھلانگ لگا دی۔ ڈاکو کے لیے ایلکس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ اپنی مدافعت میں اُنگلی بھی نہیں ہلا سکا۔ بینک کے محافظ تو ایسی غیر متوقع حرکتیں کر گزرتے ہیں لیکن ڈاکو نے کسی خزانچی کو ایسا جرأت مندانہ قدم اُٹھاتے ہوئے نہ دیکھا تھا، نہ کبھی اخباروں میں پڑھا تھا۔ ایک خزانچی کا یہ غیر روایتی اقدام اُسے لے ڈوبا۔ اس بات کا علم تو بعد میں ہوا کہ اُس کا ریوالور خالی تھا۔ بینک کے ملازمین جانتے تھے کہ ایلکس کا یہ اقدام بینک کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی جرأت کی وجہ سے بینک میں ہیرو بن گیا۔ اُس کی عزت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ہر شخص اُس کا احترام کرنے لگا۔ صرف مینیجر ایک ایسا شخص تھا جو اُس کی جرأت مندی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس واقعے کے بعد ایلکس خصوصاً بینک کی لڑکیوں میں بے حد مقبول ہو گیا تھا۔ اُن کے رویّے میں حیرت انگیز تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی تھیں اور جب بھی وہ ان کی طرف دیکھتا، اُن کے ہونٹوں پر دل موہ لینے والی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ خود ایلکس میں بھی اس واقعے کے بعد زبردست تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ اب اُسے بینک کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کی دلچسپی کا مرکز بینک لُوٹنے والے ڈاکو بن گئے تھے۔ وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا تھا کہ ایسے فن کاروں کی حوصلہ شکنی کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ آخر وہ ایک خوب صورت منصوبہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بینک مینیجر نے اُس کا منصوبہ سننے تک سے انکار کر دیا تھا۔

کچھ دیر تک سکون رہا مینیجر کا قیاس درست ثابت ہو رہا تھا، یہ بھی ممکن تھا کہ شہر کے مفت خوروں میں یہ خبر پھیل گئی ہو کہ اس شاخ میں ایلکس جیسا نڈر خزانچی موجود ہے اس لیے انھوں نے اپنے ہم عصروں میں تمسخر اڑنے کے خوف سے اس شاخ کا رخ کرنا ترک کر دیا ہو لیکن یہ سکون دیرپا ثابت نہیں ہوا یا تو اُس کی جرأت کا چرچا ماند پڑ چکا تھا یا بینک میں گھسنے والا ڈاکو نووارد تھا۔ ڈاکو نے جیسے ہی اندر قدم رکھا، ایلکس نے گویا اُس کی خوشبو سونگھ لی۔ وہ کوئی قدامت پسند ڈاکو تھا، ایک بہت ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اُس کا ہیٹ پیشانی پر جھکا ہوا تھا اور اُس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ دوپہر ہو رہی تھی اس وقت لوگوں کو بینک سے زیادہ کھانے سے دلچسپی ہوتی ہے اس لیے وہاں صرف گنتی کے چند افراد موجود تھے مس نینسی کی کھڑکی پر دو افراد تھے۔ اُس کے برابر والی دو کھڑکیاں بند تھیں۔ باقی خزانچیوں کی کھڑکیوں پر ایک ایک گاہک نظر آ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے ایلکس تنہا تھا۔ اُس نے دعوت دینے والے انداز میں مسکراتے ہوئے ڈاکو کی طرف دیکھا۔ ڈاکو نے اُس کی دعوت قبول کر لی۔ وہ اُسی کی کھڑکی پر آ گیا۔ اُس نے کپڑے کا ایک تھیلا ایلکس کی طرف کھسکایا اور کوٹ کی جیب سے ریوالور کا دستہ صرف اتنا باہر نکالا کہ ایلکس کو نظر آ سکے۔

"فرمائیے جناب! کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟" ایلکس کاروباری انداز میں مسکرایا۔

"ہوش میں آؤ۔" ڈاکو نے غرا کے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں تمھارا بینک لوٹنے آیا ہوں۔ دراز میں جتنی رقم ہو خاموشی سے تھیلے میں ڈال دو۔ جلدی کرو۔"

"بہتر ہے جناب! ہم آپ جیسے مہربانوں کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ آپ دیکھتے رہیے میں کس پھرتی سے آپ کا تھیلا بھرتا ہوں۔" ایلکس دراز کھول کے کپڑے کے تھیلے میں نوٹ ٹھونسنے لگا۔ وہ یہ کام بہت انہماک سے انجام دے رہا تھا اور سیٹی بھی بجاتا جا رہا تھا۔

"بند کرو یہ سیٹی۔" ڈاکو بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھ کے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم کوئی ایسی ویسی حرکت کرنا چاہتے ہو۔"

ایلکس نے سیٹی بجانی بند کی اور اپنے دونوں ہاتھ کھول کے ڈاکو کے سامنے کر دیے۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے جناب! میں آپ کے خلاف کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر میرا سیٹی بجانا آپ کو ناگوار گزرا ہے تو میں معافی...." ڈاکو نے ایلکس سے تھیلا چھیننے کی کوشش کی لیکن ایلکس نے ایک جھٹکے سے تھیلا اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ "معاف کیجیے جناب! ابھی میں نے اپنا کام ختم نہیں کیا ہے۔ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ اگر آپ جیسا کوئی مہربان تشریف لائے اور رقم کا مطالبہ کرے تو میں اُس سے پورا تعاون کرتے ہوئے کسی حیل و حجت کے بغیر ساری رقم اُس کے حوالے کر دوں۔ میں اپنے اعلا افسروں کے احکام کی ہمیشہ تعمیل کرتا ہوں۔"

"بند کرو یہ بکواس اور تھیلا واپس کرو۔ اب تک مجھے واپس چلا جانا چاہیے تھا۔"

"آپ کو شاید علم نہیں ہے جناب کہ آج ...."

ڈاکو نے جھلا کر ریوالور کوٹ کی جیب سے باہر نکال لیا۔ "یہ کیا جناب جناب کی رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے تمھارا لب و لہجہ بالکل پسند نہیں ہے۔"

ایلکس نے ریوالور نظر انداز کر دیا۔ "تعجب ہے۔ دیکھیے جناب! میں نے ابتدائی تعلیم اُسی اسکول میں حاصل کی تھی اس کے بعد میں نے...."

"بکواس بند کرو۔ مجھے تھیلا دو۔" ڈاکو کھڑکی پر آگے کی طرف جھک گیا۔ غصے اور گھبراہٹ نے اُس کے چہرے پر عجیب و غریب تاثرات پیدا کر دیے تھے۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا جناب کہ آج کا دن آپ کے لیے بے حد مبارک ہے۔ آج اتفاق سے میرے پاس بہت لمبی رقم موجود ہے۔ یہ دیکھیے۔" ایلکس نے دوسری دراز کھول کے پچاس والے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اور ڈاکو کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ اُس نے گڈی تھیلے میں ڈال دی پھر کھڑکی کی طرف جھک گیا۔ "پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے رازدارانہ لہجے میں ڈاکو سے کہا۔ "ایک خاتون میری طرف آ رہی ہیں میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے پیچھے کھڑی ہونا چاہتی ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے آپ اطمینان سے اسی طرح کھڑے رہیے۔ خاتون کو میں فوراً یہاں سے روانہ کر دوں گا۔"

ڈاکو نے جلدی سے ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا لیکن اُس کی نال اب بھی ایلکس کی طرف تھی۔ عورت ڈاکو کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

"خاتون!" ایلکس نے بلند آواز میں کہا۔ "کیا آپ دوسری کھڑکی پر جانا پسند کریں گی؟ میں لنچ کے لیے جانا چاہتا ہوں۔"

عورت خاموشی سے دوسرے خزانچی کی طرف چلی گئی۔ مس نینسی نے تعجب سے ایلکس کی طرف دیکھا پھر فوراً اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایلکس نے ڈاکو کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ دبائی۔ "جناب! دیکھا آپ نے۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کچھ ریزگاری کی بھی ضرورت پڑے گی۔" اُس نے کاؤنٹر پر رکھی ہوئی ریزگاری مٹھیاں بھر بھر کے تھیلے میں ڈالنی شروع کر دی۔ "میں کہتا ہوں تھیلا مجھے واپس کر دو۔" ڈاکو نے بے بسی سے کہا۔ اس مرتبہ اُس نے کوٹ کی جیب سے ریوالور باہر نہیں نکالا۔

"بس جناب! میرا کام ختم ہو گیا۔" ایلکس نے تھیلا ہلا کر ریزگاری اندر پھیلا دی اور تھیلے کا منہ احتیاط سے بند کر دیا۔ تھیلے کا حجم بہت بڑھ گیا تھا اس لیے وہ کھڑکی کے ذریعے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ ایلکس نے اُسے کھڑکی کے اوپر سے ڈاکو کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لیجیے جناب! مجھے اُمید ہے کہ آپ کے پاس کوئی گاڑی ضرور ہو گی۔ تھیلا خاصا وزنی ہو گیا ہے اسے اُٹھائے اُٹھائے چلنے سے آپ تھک جائیں گے۔"

ڈاکو نے جھپٹ کر تھیلا اپنے قبضے میں کر لیا۔ ایلکس نے بینک کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک صاف و شفاف دبیز شیشہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ کار کا ڈرائیور بہت بے تابی سے بار بار بینک کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں آپ کو ایک مشورہ دینے کی جسارت کروں گا جناب!" ایلکس نے دوبارہ ڈاکو کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ بھاگنے کی کوشش قطعی نہ کیجیے گا بلکہ اس طرح اطمینان سے ٹہلتے ہوئے باہر نکلیے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"

ڈاکو نے ایلکس کا مشورہ پوری طرح نہیں سنا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش تو نہیں کی البتہ وہ جس تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ بھاگنے ہی کے برابر تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اچھی طرح کار کے اندر بیٹھتا، اس کے ساتھی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دوسرے ہی لمحے کار ایلکس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ایلکس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی نشست سے اٹھ کے مینیجر کے کمرے میں گیا۔ وہ مینیجر کی میز کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ "میں آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں جناب کہ میں نے آپ کے حکم کی پوری تعمیل کی ہے۔"

"میں اس وقت بہت مصروف ہوں ایلکس!" مینیجر نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"لیکن جناب! میں آپ کو ایک اہم واقعہ بتانا چاہتا ہوں۔ آپ کے لیے اس کی تفصیلات جاننا بے حد ضروری ہے۔"

"ایلکس! پلیز، پھر کسی وقت۔"

"لیکن جناب! ایک واردات ہو گئی ہے۔ میرا فرض ہے کہ فوراً آپ کو اس کی اطلاع دوں۔ ابھی ایک صاحب بڑی تیزی سے باہر تشریف لے گئے ہیں، وہ ڈاکو تھے اور بینک لوٹنے آئے تھے۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں ان سے مکمل تعاون کیا۔ اس طرح یہ واردات خیر و خوبی سے انجام پا گئی۔"

مینیجر اچھل کے اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا۔ "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ تمھیں خصوصی ٹیلی فون پر فوراً پولیس کو واردات کی اطلاع دینی چاہیے۔" اس نے چیختے ہوئے کہا۔

"میں نے پہلے آپ کو مطلع کرنا مناسب سمجھا۔"

مینیجر نے جھپٹ کے ایلکس کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا خصوصی ٹیلی فون کے پاس لے گیا۔ ٹیلی فون کا رابطہ براہِ راست قریب ترین تھانے سے قائم تھا۔ ایلکس نے فون پر پولیس کو تفصیل سے ڈاکو کا حلیہ بتایا۔ ساتھ ہی اس نے ڈاکو کے ساتھی کا حلیہ بھی بتایا جو گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا اور جسے اس نے اپنی نشست سے بیٹھے بیٹھے ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔

ابھی وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کے پلٹے ہی تھے کہ پولیس کی ایک گشتی گاڑی بینک کے دروازے پر رکی اور ایک سارجنٹ اندر داخل ہوا۔ سارجنٹ نے فوراً ایلکس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایلکس نے نہایت اطمینان کے ساتھ شروع سے آخر تک پورا واقعہ سنایا۔ سارجنٹ اور مینیجر منہ کھولے ہوئے پوری روداد سنتے رہے۔

"آپ کا... آپ کا مطلب یہ ہے کہ..." سارجنٹ نے بے یقینی سے ایلکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے پورے پانچ منٹ ڈاکو کو یہاں روکے رکھا اور کسی کو یہ شک نہیں ہوا کہ وہ بینک لوٹ رہا ہے؟"

"شک کیسے ہو سکتا تھا جناب! میں نے کسی کو شک کا موقع ہی نہیں دیا۔"

"کیوں؟"

"میں احکام کی تعمیل کر رہا تھا۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہاں گولیاں چلیں اور کوئی زخمی ہو جائے۔ ڈاکو کے پاس اعشاریہ پینتالیس بور کا ریوالور تھا۔ وہ بہت خطرناک ریوالور ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں گولیاں بھی تھیں۔"

"کیا آپ وہ آدمی نہیں ہیں جس نے چند ماہ قبل ایک ڈاکو پر جست لگا کر اسے غیر مسلح کر دیا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ تن تنہا کسی کی مدد کے بغیر؟"

"آپ کا قیاس درست ہے جناب! میں وہی آدمی ہوں لیکن مجھے یہ حکم دیا گیا تھا کہ میں آئندہ ایسی حرکت کرنے کی کوشش نہ کروں۔"

بینک کے ایک ملازم نے سارجنٹ کو اطلاع دی کہ تھانے سے اس کے لیے فون آیا ہے۔ سارجنٹ فون سننے چلا گیا۔ بینک مینیجر ایلکس کے پاس کھڑا رہا لیکن وہ خاموش تھا اور عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

چند منٹ بعد سارجنٹ واپس آ گیا۔ جوش سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "پولیس نے دونوں مجرموں کو گرفتار کر لیا۔" اس نے پُرمسرت لہجے میں مینیجر کو اطلاع دی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے مسٹر ایلکس! کہ آپ نے ڈاکو کے ساتھ تعاون کر کے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا کیونکہ اس کا ریوالور واقعی بھرا ہوا تھا اور وہ اعشاریہ پینتالیس بور ہی کا ریوالور تھا۔"

"مجھے اس کا یقین تھا سارجنٹ!"

"لیکن کیا آپ کو ایک چھوٹے سے بم کا علم بھی تھا جو مجرموں کے پاس تھا؟"

"جی نہیں جناب! ڈاکو نے مجھے بم کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔" ایلکس نے متانت سے جواب دیا۔

"مجرموں کے پاس ایک چھوٹا سا بم بھی تھا جسے انھوں نے رقم کے ساتھ تھیلے میں ڈال دیا تھا۔ وہ بم کسی وجہ سے پھٹ گیا۔ تھیلے میں چونکہ بہت ساری ریزگاری بھی تھی اس لیے بم پھٹنے سے تمام سکے بارود کے ساتھ اڑ کر مجرموں کو لگے اور مجرم بری طرح زخمی ہو گئے۔ انھیں اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ایک ہفتے سے پہلے مجرموں کو جیل نہیں لے جایا جا سکے گا۔"

مینیجر اب بھی اپنے خزانچی کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایلکس فوجی انداز میں اٹین شن کھڑا ہوا بے تعلقی سے دیوار گھور رہا تھا۔



۵۷ بہترین پُرزہ جات
۳۰ سال کی فنی مہارت
۱۰ کروڑ روپے کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی اور
۴۴۰ منٹ تک جدید فیکٹری ٹسٹ پر پرکھے جانے کا نچوڑ....

پیکونیومن الیکٹرک موٹر

مضبوط اور قابلِ اعتماد پیکو نیومن الیکٹرک موٹر مشین ٹولز، پمپس، پاور لومز، ویٹ تھریشرز اور دوسری مشینوں کے لیے کم خرچ اور بہترین ہیں۔





پاکستان انجینئرنگ کمپنی لمیٹڈ

میر جمشید عالم الٰہ آباد کے ایک متوسط خاندان کا فرد تھا۔ اُس کا گھرانا پانچ افراد پر مشتمل تھا، ماں باپ، بڑا بھائی سکندر، چھوٹی بہن یاسمن اور وہ خود۔ جمشید ایک خوب رُو اور ذہین لڑکا ہونے کے باوجود خوابوں میں زندگی گزارتا تھا اور اپنے خوابوں سے ہراساں بھی رہتا تھا کیونکہ اُن کی تعبیر کے طور پر اُس کے گھر میں کئی تلخ حقیقتیں رونما ہو چکی تھیں۔ اُس کے چچا اور دادی کی الم ناک اموات اُسی کے خوابوں کا نتیجہ تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جب اُس نے اپنی چہیتی بہن یاسمن کے متعلق ایک خواب دیکھا تو لرز کے رہ گیا۔ یاسمن ارشد نامی ایک نوجوان ڈاکٹر کی منسوبہ تھی۔ جمشید نے اپنے لرزہ خیز خواب کے پیشِ نظر اس رشتے کی بھرپور مخالفت کی مگر اُس کی سنتا کون؟ آخر ایک روز یاسمن خوں رنگ جوڑے میں ارشد کے ساتھ وداع کر دی گئی اور جمشید غیروں کی طرح اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر جلد ہی اُس کے موذی خواب نے تعبیر کا پھن اُٹھا لیا۔ شادی کے صرف چند روز بعد ایک صبح ارشد گھبرایا ہوا اُس کے گھر پہنچا اور اپنی عادت کے خلاف جمشید کے والد سے گستاخانہ انداز میں پوچھنے لگا کہ یہ کیچو کون ہے اور یاسمن سے اُس کا کیا تعلق ہے؟ جمشید کے لیے کیچو کا نام نیا تھا لیکن اُس کے والد یہ نام سُن کے اچانک چراغ پا ہو گئے اور اپنے داماد کو بُری طرح جھڑکنے لگے۔ ارشد پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔ جمشید کے والد نے غصے سے بھرا ہوا پستول اٹھایا اور ارشد کے پیچھے لپکے۔ جمشید کا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ تذبذب کے بعد اُس نے بھی دوڑ کے اُن کا تعاقب کیا لیکن جب وہ ارشد کے گھر پہنچا تو قصہ تمام ہو چکا تھا۔ جمشید کے والد نے اپنے داماد کو شوٹ کر کے خودکشی کر لی تھی۔ جمشید نے حواس باختگی میں اُن کے خون میں لت پت جسم پھلانگے اور گھر کے اندر پہنچا۔ وہاں یاسمن کی چھت سے جھولتی ہوئی لاش نے اُس کا استقبال کیا۔ وہ اُس کی بے جان ٹانگوں سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تباہی کا جو سلسلہ کیچو کے نام سے شروع ہوا تھا وہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ اِن پے در پے صدمات نے جمشید کی ماں کو بھی اُس سے چھین لیا۔ نیز جمشید کا بڑا بھائی سکندر اُس کی طرح باہمت یا بے غیرت ثابت نہیں ہوا۔ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا اور نہ جانے کہاں چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا گھر خاک ہو گیا تھا۔ جمشید اُجاڑ گھر کے در و دیوار سے سر ٹکرانے کے لیے اکیلا رہ گیا۔ ممکن ہے تنہائی کی اذیت اُسے بھی گلا گھونٹ لینے پر مجبور کر دیتی مگر جلد ہی رانی پور سے اُس کے چچا نے اُسے بلوا لیا۔ اُن کی لڑکی غزالہ جمشید کی منگیتر تھی اس لیے وہاں اُسے ایک بار پھر گھر جیسا سکون محسوس ہوا اور اُس نے اپنی تعلیم دوبارہ جاری کر کے رفتہ رفتہ بی اے کر لیا۔ بی اے کرنے کا انعام اُسے یہ ملا کہ چچا نے ایک روز نہایت خوب صورتی سے جمشید کا آبائی مکان اپنے نام کرا لیا اور غزالہ کی بات بالا ہی بالا کسی اور سے طے کر دی۔ جمشید نے اس زیادتی پر احتجاج کیا تو اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا گیا۔ ناچار وہ شہروں شہروں اپنے پاگل بھائی کو تلاش کرتا ہوا کلکتے پہنچا۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک بار گھر سے بھاگ کر کلکتے آ چکا تھا۔ یہاں اُس کا ایک دوست جارج رہتا تھا اور بازارِ حسن کی ایک نوخیز مغنیہ بانو سے بھی اُس کی شناسائی تھی۔ جمشید کوچے کوچے اپنے دوست جارج کو ڈھونڈتا رہا۔ اُس کے کپڑے پھٹ گئے تھے، جیب میں ایک دمڑی تک نہیں تھی۔ دمڑی کے بغیر نہ پیٹ کی آگ بجھ سکتی تھی، نہ دل کی۔ نہ سر پر چھت تھی، نہ پیٹ میں پتھر۔ ایک روز اُس نے شدید مایوسی سے خود کو پانی کی آگ میں جھونک دینے کا فیصلہ کیا اور دریائے ہگلی کے کنارے جا پہنچا۔ قریب تھا کہ وہ دریا میں چھلانگ لگا دیتا لیکن اچانک ایک مخملی، سریلی آواز نے اُسے نام لے کے پکارا۔ جمشید چونک کے مُڑا تو دنگ رہ گیا۔ اُس کے سامنے ایک دل کش نسوانی ہیولا لہرا رہا تھا۔ ہیولے نے پیار سے اُس کی ہمت بندھائی اور اُسے زندہ رہنے کی ترغیب دی پھر اپنا نام بتایا۔ اُس کا نام سُن کے جمشید کے قدم ڈگمگا گئے۔ آج وہ بدنام دوسری بار سُن رہا تھا۔ "کیچو"۔ پھر اِس سے پہلے کہ جمشید اُس سے کچھ وضاحت چاہتا، کیچو جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اُسی طرح غائب ہو گئی۔ جمشید غیر ارادی طور پر سر جھکائے بوجھل قدموں سے پھر زندگی کی طرف لوٹ گیا لیکن اِس بار زندگی نے اُسے ٹھکرایا نہیں، سینے سے لگا لیا۔ کیچو کا ملنا اتنا مبارک ثابت ہوا کہ جمشید کو جلد ہی جارج بھی مل گیا اور بانو بھی۔ بانو نہ جانے کب سے اُس کا راستہ تک رہی تھی۔ وہ نظر آئی تو جمشید مچل گیا کہ بے تاخیر اُس کا ہاتھ تھام لے اور اُسے ذلت کی دلدل سے باہر کھینچ لے۔ چنانچہ چند روز بعد جمشید مقررہ وقت پر بانو کے پاس پہنچ گیا۔ بانو زیوروں اور نقدی کی پوٹلی سنبھالے برقع اوڑھے اُس کی منتظر کھڑی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ جمشید کے ساتھ کوٹھے کی دہلیز پار کرتی اُس کی نائکہ ماں نورو بیگم اور اُس کا سازندہ بخاور وہاں پہنچ کے اُن کی راہ میں دیوار بن گئے۔ جمشید نے اُنھیں شرافت کے ساتھ سامنے سے ہٹانا چاہا لیکن بخاور نے چاقو نکال لیا۔ مجبوراً جمشید کو بھی پھرتی دکھانی پڑی۔ اُس نے بخاور کا چاقو چھین کے اُسی کے پیٹ میں اُتار دیا اور نورو بیگم کی انتڑیاں بھی کھال کی قید سے آزاد کر دیں۔ اب دو لاشوں کی موجودگی میں زندہ بانو کو لے جانا مصلحت کے خلاف تھا چنانچہ جمشید نے اُسے بے بس کر کے وقتی طور پر وہیں چھوڑا اور خود باہر آ گیا۔ اُس کے دوست جارج نے یہ روداد سُنی تو اُس کا حوصلہ بڑھایا اور اُسے پہلی گاڑی سے بمبئی روانہ کر دیا۔ بمبئی پہنچ کے جمشید کو نہ معلوم کتنا بھٹکنا پڑتا لیکن جلد ہی ایک خوب صورت خانہ بدوش عورت ڈالی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ جمشید نے اُسے اپنا نام شیر و بتایا۔ ڈالی کا شوہر مر چکا تھا اور ورثے میں اُسے ایک گدّا اور پھیلا ہوا ہاتھ دے گیا تھا۔ ڈالی کو اپنا اور اپنے گدّے کا پیٹ بھرنے کے لیے بھیک مانگنے کے علاوہ مردوں کی ہوس کا شکار بھی ہونا پڑتا تھا اس لیے وہ وہاں خوش نہیں تھی۔ دوسری طرف دُہرے قتل کا مجرم جمشید بھی خود کو بمبئی میں غیر محفوظ سمجھتا تھا اس لیے ایک روز ڈالی اور جمشید نے گدّے کو اٹھایا اور بمبئی سے بھاگ کے ایک چھوٹی سی ریاست راجے پور میں پہنچ گئے۔ جمشید کی وجاہت اور ڈالی کی خوب صورتی کام آئی۔ اُنھیں راجے پور کے ایک بہت بڑے رئیس پرکاش چندر کی حویلی میں ملازمت مل گئی۔ یہاں جمشید نے اپنا نام موہن داس ظاہر کیا۔ حویلی کا نام پرکاش بھون تھا۔ بھون ایک رنگین جگہ تھی۔ وہاں کا ماحول دیکھ کے جمشید کو یقین ہو گیا کہ جب تک دِلّی جوان ہیں، اُن کی عظمتیں بچی ہیں۔ پرکاش چندر کے لڑکے راج کمار کہلاتے تھے۔ نیز بیویاں رانیاں تھیں اور لڑکیاں راج کماریاں۔ تقریباً سبھی رنگے ہوئے تھے۔ ڈالی کو مردوں نے اور جمشید کو لڑکیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا خصوصاً ایک نوخیز لڑکی شاردا نے مختلف انداز میں جمشید کو اُس کے ہونے کا احساس دلایا۔ وہ اُس پرستان کی سب سے حسین، سب سے نازک اور سب سے منفرد پری تھی۔ جمشید بھی بے اختیار اُس کی طرف کھنچتا گیا یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے سینوں میں دھڑکنے لگے۔ جمشید شاردا کی قربت میں اپنا خطرناک ماضی بھول سا گیا تھا مگر ایک دن اچانک اُسے پیچھے پلٹنا پڑا۔ ہوا یہ کہ بھون میں دیوراج نامی ایک بوڑھا سادھو اکثر آتا تھا۔ اُس کی وہاں بہت عزت تھی۔ سادھو نے قطعی نامعلوم طریقے سے جمشید کی چور آنکھیں پڑھ لیں کہ وہ ایک مجرم ہے اور پرکاش چندر کے ولی عہد مہیش چندر کو بھی آگاہ کر دیا جو کسی ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا چنانچہ مہیش نے رازداری کے وعدے پر اُسے مٹھی میں لیا اور اپنے باپ پرکاش چندر کے قتل پر مامور کر دیا۔ اس خطرناک کام سے بچنے کے لیے جمشید نے بھون سے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن نورو بیگم اور بخاور کے ڈھانچے بھوت بن کے اُس کے راستے میں حائل ہو گئے۔ اس کے علاوہ شاردا، ڈالی اور گدّے کو وہ کس کے سہارے چھوڑ جاتا؟ چنانچہ چار و ناچار اُس نے پرکاش چندر کو ٹھکانے لگانے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن زبردست پہرے کے باعث اُسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور مہیش چندر سے ملی ہوئی مہلت کی آخری رات آ پہنچی۔ جمشید مایوسی سے پائیں باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک پُراسرار کیچو دوسری بار اُس کے سامنے نمودار ہوئی اور مبہم انداز میں اُسے اطمینان سے سو جانے کی تلقین کر کے رخصت ہو گئی۔ دوسری صبح پرکاش چندر حیرت انگیز طور پر اپنی خواب گاہ میں مُردہ پایا گیا۔ مہیش نے اُس کی موت کا سہرا جمشید کے سر باندھ کے اُسے انعام سے نوازا لیکن جمشید کو خوشی نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتا تھا اب مہیش پہلی فرصت میں اُسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے گا۔ اِس صورت میں جمشید کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ مہیش کو بھی اُس کے باپ کے پاس پہنچا دے۔ اتفاق سے جلد ہی جمشید کو اس کا موقع مل گیا۔ وہ اس طرح کہ آں جہانی پرکاش چندر کی سب سے کم عمر رانی پاڑو مہیش سے ناراض ہو گئی تھی حالانکہ وہ پرکاش چندر کی موت میں مہیش چندر کی شریک تھی۔ اُس نے جمشید کو اعتماد



میں لے کے ہمیش کے قتل کی راہ ہموار کر دی اور ہمیش جمشید کے ہاتھوں کتّے کی موت مارا گیا۔ یہ کوئی معمولی قتل نہیں تھا لہٰذا جمشید کے لیے قتل کی محرک اور محرم پارو کو قابو میں رکھنا لازم تھا۔ اِس مقصد سے وہ ایک رات دندناتا اُس کی خواب گاہ میں جا گھسا۔ پارو نے شروع میں مزاحمت کی مگر آخر جمشید کی وجاہت، ذہانت اور پستول کے سامنے اُسے بے بس ہونا پڑا۔ جمشید نے اُس کے ساتھ ایسی رنگین اور سنگین رات گزاری کہ حسین پارو نے اپنی آیندہ کی تمام راتیں جمشید کے نام وقف کر دیں۔ ہمیش کے بعد بھون کی باگ ڈور اُس کے چھوٹے بھائی دنیش کے ہاتھوں میں آگئی۔ دنیش ایک سنجیدہ اور جوہر شناس نوجوان تھا۔ اُس نے جمشید عالم یعنی موہن داس کو ملازم کے بجائے ایک دوست کی حیثیت سے اپنے قریب کیا۔ جمشید نے بھی نمک اور دوستی کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی جب بھی دنیش کی طرف اندھیرے میں کوئی تیر آیا، جمشید نے اپنا سینہ آگے کر دیا۔

ریاست راجے پور کی تقدیر کا مالک مہاراجا امرناتھ تھا۔ مہاراجا امرناتھ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اولاد ہوتی تب بھی اُس کے بعد ریاست کے دو خاندانوں میں سے کسی ایک کو ریاست کی گدی پر براجمان ہونا تھا۔ دونوں خاندانوں کے دو بڑے بیٹے ریاست کی گدی کے حق دار اور امیدوار سمجھے جاتے تھے، ایک دنیش چندر، دوسرا کنور جگ دیپ۔ جگ دیپ بڑی حویلی میں رہتا تھا۔ اُسے بڑی حویلی سے براہِ راست راج محل پہنچنے کی بہت جلدی تھی اِس لیے وہ دنیش کو اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن اِدھر موہن داس دنیش کی ڈھال بنا ہوا تھا۔ جگ دیپ کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ نتیجتاً اُس نے اپنے حملوں کا رُخ سیدھا موہن داس کی طرف موڑ دیا۔ اُس نے ایک بار گھڑ دوڑ میں موہن داس کے اُوپر گھوڑا چڑھا دینے کی کوشش کی پھر مختلف اوقات میں بیک وقت کئی کئی آدمیوں سے اُس پر حملے کروائے، اُسے قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کرایا اور طرح طرح کی بہتان تراشیوں سے اُسے رُسوا کرنے کی کوشش کی لیکن جمشید کی آنکھیں ہر وقت کھلی رہتی تھیں اور اُس کی رگوں میں دوڑنے والا خون کبھی منجمد نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ مخالفوں کے ہر حربے سے بچتا رہا اور اپنے محاذ پہ ڈٹا رہا۔ دشمنوں کی اِس کشاکش سے اُس کی زندگی ایک ہیجان انگیز انقلابی دور سے گزر رہی تھی اور اُسے روز و شب، صبح و شام انتہائی نازک لمحات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ وہ ایک شدید نازک موقعوں پہ اُسی پُراسرار ہیولے کیچو نے اچانک نمودار ہو کے اپنے مخصوص مبہم انداز میں اُس کی ڈھارس بندھائی اور اُسے ایک بُوٹی کھلا کے مژدہ سنایا کہ اب اُس پر کوئی زہر اثر نہیں کر سکے گا۔ کیچو کے التفات نے سادھو دیوراج اور ایک پنڈت اسٹیورٹی لال کو جمشید کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ وہ کیچو اور جمشید کا رابطہ جان کے جمشید کے ساتھ نیازمندی سے پیش آنے لگے تھے لیکن جمشید کو نہ اُن سے دلچسپی تھی نہ اُن کی دیوی سے۔ وہ اپنی زندگی کی بدترین اُلجھنوں میں گرفتار تھا، جو وقت دشمنوں سے بچتا، وہ تارا، دنیش اور پارو میں صرف ہو جاتا تھا۔ غرض عجیب متضاد دن گزر رہے تھے۔ راج کمار دنیش چندر پر اُس کے جوہر کھل رہے تھے اور اب وہ کھلے عام موہن کو اپنا سب سے قریب کا آدمی ظاہر کرتا تھا۔ انھی دنوں راج محل میں انگریز آقاؤں کی خوشنودی کے لیے ایک خصوصی ضیافت منعقد ہوئی۔ دنیش، جمشید کو بھیس بدلوا کے اپنے ساتھ وہاں لے گیا۔ ضیافت میں اُس نے جمشید کا تعارف ایرانی پروفیسر زاہدی کی حیثیت سے کرایا۔ جمشید کو مجبوراً پروفیسر زاہدی بننا پڑا اور پروفیسر زاہدی نے اپنی خوش خلقی، مجلسی آداب اور بلاغت سے اپنے دوست کے مذاق کی لاج رکھ لی۔ کرنل ہارڈنگ، مہاراجا اور دیگر مہمان پروفیسر زاہدی سے بہت متاثر ہوئے خصوصاً ریتا اور راج کماری کنول کی شیدائیت دیکھنے کے لائق تھی۔ ریتا کرنل ہارڈنگ کی بیٹی اور کنول مہاراجا کی بھتیجی تھی۔ دونوں اپنا جواب آپ تھیں۔ راج محل سے واپسی پر دنیش نے جمشید کا منہ چوم لیا اور اُسے دلّی سے آئی ہوئی ایک مغنیہ ترنم کا تحفہ دیا۔ جمشید نے ترنم کے ساتھ صرف ایک رات گزاری کہ اُس کے لیے دلّی لوٹنا دوبھر کر دیا۔ وہ وہیں مقیم ہو گئی۔ وقت اچھا گزر رہا تھا لیکن کتوں نے دنیش اور جمشید کی بو سونگھنا نہیں چھوڑا تھا اس لیے ایک رات دنیش اُن کی زد پہ آگیا۔ انھوں نے بھرپور حملہ کیا مگر اب بھی دنیش بال بال بچ گیا البتہ اُس کا ڈرائیور بے موت مارا گیا۔ جمشید جانتا تھا کہ یہ حملہ کس جانب سے ہوا ہے۔ اُس نے تمام مروّت طاق پر رکھ دی اور جگ دیپ کی ایک آلۂ کار بنیا رانی، اُس کے ایک حکیم گرگے پرشوتم، جگ دیپ کے باپ کنور پردیپ اور اُس کے اسسٹنٹ کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہ کام اُس نے ایک ہی رات میں تنِ تنہا انجام دیا تھا۔ دوسرے روز راج محل، چھاؤنی، بڑی حویلی بلکہ پوری ریاست میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ کالی پولیس کے ساتھ گوری فوج نے بھی سرگرمی سے قاتلوں کی تلاش شروع کر دی خصوصاً انگریز چھاؤنی کا ایک رنگین مزاج افسر میجر رابرٹ ضرورت سے زیادہ مستعدی دکھانے لگا تھا۔ جمشید نے اپنی حسین رفیقۂ کار پارو کے ذریعے اُسے ایک سنسان پہاڑی مقام پر بلوایا اور اُسے اُس کی جیپ سمیت کئی ہزار فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکا دیا۔ یہ ایک بہت بڑا اقدام تھا چنانچہ جمشید نے حفظِ ماتقدم کے طور پر پروفیسر زاہدی کا بھیس بدلا اور کرنل ہارڈنگ سے ملنے کے لیے چھاؤنی جا پہنچا۔ کرنل لیے دیے انداز میں دوستوں کی طرح اُس سے ملا مگر اُس کی لڑکی ریتا نے کوئی تکلف ملحوظ نہیں رکھا۔ اُس نے ہلکی ہلکی سُرخ روشنیوں کے تخلیے میں اُس سے دیرینہ شناساؤں کی طرح پوری مغربی بے باکی سے ملاقات کی۔ جمشید نے اُسے پرکاش بھون آنے کی دعوت دی۔ پھر چند روز بعد اُس کا شاہانہ جلوس پرکاش بھون آگیا۔ جمشید نے اُس کے ساتھ اپنی زندگی کی ایک بیش قیمت رات گزاری۔ ریتا کو اتنے قریب سے دیکھ کے اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ مغربی شیشے میں مشرقی شراب بھری ہوئی ہے۔ ریتا کے ساتھ کئی انگریز محافظ بھی بھون آئے تھے۔ اُن میں سے ایک شخص کا نام جیکسن تھا۔ اُسے اُس کی بدقسمتی پرکاش بھون لائی تھی اسی لیے ایک روز وہ جمشید کے ساتھ چالاکی سے پیش آنے کی بیوقوفی کر بیٹھا۔ اُس نے غیر واضح لفظوں میں جمشید پر میجر رابرٹ کے قتل کا شبہ ظاہر کیا۔ چنانچہ ایک رات جمشید نے بہانے سے اُسے راجے پور کے ویران کھنڈروں میں لے جا کر صرف ایک گولی میں زندگی کے تمام دکھوں سے نجات دلا دی۔ اُسے مار کے جمشید لوٹ ہی رہا تھا کہ اچانک وہاں ایک جیپ آکے رکی۔ جیپ میں ایک ہندوستانی اور چھ گورے سوار تھے۔ جمشید کے لیے اُن کی آمد غیر متوقع تھی لیکن اُس کے پاس گولیوں کی کمی نہیں تھی اس لیے اُس نے ایک ایک کر کے اُن ساتوں کو جیکسن کے پاس روانہ کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ بھون سے چلتے وقت جیکسن نے جمشید کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کے احتیاطاً چھاؤنی فون کر دیا تھا کہ وہ کھنڈروں کی طرف جا رہا ہے۔ کھنڈروں کی اس لرزہ خیز واردات نے چھاؤنی میں ہلچل برپا کر دی۔ بڑی حویلی اور پرکاش بھون کے بے شمار ملازمین شبہے میں گرفتار کر لیے گئے۔ میر جمشید عالم بھی پابہ جولاں چھاؤنی لے جایا گیا اور وہاں اُسے مشقِ ستم بنانے میں کوئی بُخل نہیں کیا گیا۔ جمشید نے جرم کا اقرار نہ کرنے کے سبب اپنی زندگی کی سب سے اذیت ناک سزائیں بھگتیں۔ اُس کی کھال سر سے پاؤں تک اُدھیڑ کے رکھ دی گئی لیکن بدقسمتی نے اُسے موت سے ہم آغوش نہیں ہونے دیا۔ وہ زنداں میں سڑ رہا تھا کہ سادھو دیوراج اپنے ساتھ کئی سادھوؤں اور پنڈتوں کے ساتھ اُس کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے چھاؤنی پہنچ گیا نیز دنیش اور خود کرنل ہارڈنگ کی بیٹی ریتا کی طرف سے بھی اُس کی رہائی کے لیے زور لگایا گیا۔ آخر انگریزوں کو مجبور ہو کے اُسے رہا کرنا پڑا۔

جمشید کی قید کے دنوں میں پارو نے اپنے ایک نمک خوار اینگلو انڈین پولیس افسر ٹیلر کی مدد سے دو انگریز اور مار دیے تھے تاکہ تفتیش کا رُخ جمشید کی طرف سے ہٹ جائے لیکن پارو کا وار ذرا اوچھا پڑا تھا اس لیے ایک انگریز میں کچھ کچھ جان باقی رہ گئی تھی اور وہ اسپتال میں اپنی زندگی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ ریاست کے مخدوش حالات کے پیشِ نظر اُن دنوں ہائی کمان کی جانب سے تین انگریز کرنل وہاں آئے ہوئے تھے اور تمام تحقیقات انھوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ وہ یہ کام بہت رازداری سے انجام دے رہے تھے۔ تفتیش کے نتائج کا اُن کے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ اسپتال میں پڑے ہوئے زخمی گورے کے بیان سے اُن کی نگاہ پارو کے چہرے پہ جا ٹکی۔ پارو کو معلوم ہوا تو اُس کے گلابی رخسار ہلدی کی طرح زرد ہو گئے۔ جمشید نے مصلحتاً پارو کو ٹیلر کے ذریعے بڑی حویلی میں قتلِ عام کی راہ سجھائی۔ پارو کے اشارے پہ ٹیلر نے ایک دن موقع پا کے وہاں کے کئی افراد ٹھکانے لگا دیے۔ اتفاق سے دنیش کا چھوٹا بھائی نریش اُن دنوں وہیں مقیم تھا۔ وہ بھی مارا گیا۔ اس ہولناک واردات نے انگریزوں کے اوسان خطا کر دیے۔ اُن کی کارروائیاں تیز تر ہو گئیں اور کرنل ہارڈنگ کو معطل کر دیا گیا۔ جمشید نے اپنی سرگرمی جاری رکھی۔ اُس نے ایک جامع منصوبہ بنا کے دنیش کے ڈرائیور دیوی لال کو اعتماد میں لیا اور ایک رات کار کی ڈکی میں چھپ کے ہائی کمان کے افسروں کی قیام گاہ شانت محل پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے نہایت صفائی سے تینوں کرنلوں اور تین انگریز سنتریوں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر دیں اور اُسی رات پولیس افسر ٹیلر کو بھی ختم کر کے اپنا اور پارو کا راز محفوظ کر لیا۔ شانت محل سے وہ تین فائلیں لایا تھا۔ اُن فائلوں میں پارو کے سراغ کے علاوہ پورا راجے پور بند تھا۔ فائلوں کے مطالعے سے جمشید کو ریاستی رؤسا کی سرگرمیوں خصوصاً جگ دیپ اور اُس کے گرگوں کی مکمل تفصیلات حاصل ہو گئیں۔ اُسے معلوم ہوا کہ راجے پور کی قریبی بستی لاکھی پور کے سرکش قبائل جگ دیپ کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ جمشید نے انھیں ذہن میں چھپا کر لیا۔ کرنلوں کی عبرت ناک اموات سے انگریزوں کو فی الفور اپنی سوچ اور تدابیر کا رُخ تبدیل کرنا پڑا۔ عدالتوں اور سڑکوں سے گورے فوجی واپس بلا لیے گئے اور کرنل ہارڈنگ کو اُس کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ واردات کے دوسرے روز دنیش نے جمشید کی زبانی پوری روداد سنی اور یہ بھی سنا کہ جمشید نے ڈرائیور دیوی لال کو زندہ چھوڑ دیا ہے۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ اُس نے جمشید کے دفاع کے لیے اُسی روز اپنے ہاتھوں سے دیوی لال کو شوٹ کر دیا۔ دوسری طرف جمشید نے کنور جگ دیپ کو متنبہ کرنے کے لیے پارو کے تعاون سے لاکھی پور کے دس شہدوں کے جسم چھلنی کر دیے۔ اِن متواتر واقعات نے جگ دیپ کو بھی کسی اور طرح سوچنے پر مجبور

کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے جگ دیپ کی حسین و جمیل بہن انیتا نے جمشید کی طرف مفاہمت کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ پرکاش بھون میں چند دنوں کے لیے آگئی تھی۔ جمشید اُس کی دعوت پر ایک رات اُس کے کمرے میں گیا۔ انیتا اُس سے تپاک کے ساتھ ملی پھر ابھی اُن دونوں میں چند ہی جملوں کا تبادلہ ہوا ہوگا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جمشید پردے کی آڑ میں ہوگیا۔ انیتا نے دروازہ کھولا تو راج کماری پریت گھبرائی ہوئی اندر آئی۔ پریت پرکاش بھون میں جگ دیپ کی آڑ کار تھی۔ اُسے دیکھ کے جمشید کی مٹھیاں بھنچ گئیں مگر جب اُس نے اُس کی زبان سے یہ وحشت ناک خبر سُنی کہ بڑی حویلی میں متعدد لوگ مارے گئے ہیں تو اُس کی انگلیاں ڈھیلی ہوگئیں اور منہ کھل گیا۔ اُس کی سمجھ نہیں آیا کہ کسے بڑی حویلی کے مکینوں پر اتنا غصہ آسکتا ہے؟ یہ واردات راجے پور کی سب سے سنگین واردات تھی۔ پورے اٹھارہ آدمی اجل کا لقمہ بنے تھے۔ ہر طرف چہ میگوئیوں اور قیاس آرائیوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ جمشید کا خیال تھا کہ خود جگ دیپ کے گرگوں نے اپنے ساتھیوں کا انتقام لینے کے لیے یہ قدم اُٹھایا ہے۔ وہ جیلوں میں جاتے، شکستیں کھاتے اور مرتے مرتے تھک گئے ہوں گے مگر یہ خیال جمشید کے دل کو جچا نہیں کیونکہ اگر جگ دیپ کے گرگے مشتعل ہوگئے تھے تو انھیں یہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ واردات کے وقت جگ دیپ چھاؤنی گیا ہوا تھا۔ اُن دنوں وہ وہاں اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ یہ حادثہ تو کسی مغلوب الغضب مخبوط الحواس شخص کی کارستانی معلوم ہوتا تھا۔ وہ کڑوں کڑوں جگ دیپ کو ڈھونڈتا پھرا۔ وہ ملا تو جو بھی سامنے آیا اُس کی چھاتی میں سوراخ کر دیا۔ لاشوں کا جلوس بہت بڑے پیمانے پر نکلا۔ کرنل ہارڈنگ اور مہاراجا نے بھی شرکت کی۔ سرکار کی طرف سے قاتل کی سراغ رسی پر پچاس ہزار روپلے کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ جمشید نے کوشش کی کہ وہ خود کو قاتل کی حیثیت سے پیش کرے اس طرح ڈالی اور گڈا انعامی رقم سے عمر بھر مزے کریں گے لیکن ڈالی اس تجویز پر بتھے سے اُکھڑ گئی اور سینہ کوٹ کوٹ کے جمشید کو کوسنے لگی۔ راجے پور کا آئی جی مہتا سادھو دیو راج اور جمشید کے ربط و ضبط سے واقف تھا اور اس لیے اُس کی عزت کرتا تھا۔ انھی دنوں اُس نے خفیہ طور پر جمشید کو بلایا اور نہایت لجاجت سے یہ مخلصانہ تجویز پیش کی کہ جمشید کچھ دنوں کے لیے راجے پور سے باہر چلا جائے۔ جمشید سناٹے میں آگیا۔ اب پرکاش بھون کے لوگوں میں وہ اور اُس میں لوگ اتنے شامل ہوگئے تھے کہ وہ انھیں ان حالات میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ شدید تذبذب میں مبتلا تھا۔ اسی تذبذب میں وہ راج کماری کنول سے ملنے کے لیے راج محل جا پہنچا۔ کنول سے اُس کی فون پر اکثر گفتگو ہوتی تھی لیکن جب اُس نے کنول کے روبرو بیٹھ کے اُس کے یاقوتی ہونٹوں سے کھلنے والے پھول سُنے اور سونگھے تو وحشت میں مبتلا ہوگیا۔ کنول اُس سے بہت واضح، بہت ترچھی باتیں کر رہی تھی۔ ایسی باتیں جمشید، شاردا اور پارو سے بھی سن چکا تھا لیکن کنول میں چونکہ اُس کا دوست اُس کا محسن اُس کا آقا ذیشان دلچسپی رکھتا تھا اس لیے جمشید کو اپنا رویہ متعین کرنے میں مشکل پیش آئی پھر بھی اُس نے اپنی کشمکش کا اظہار کنول پر نہیں ہونے دیا۔ کنول نے غیر رسمی طور پر اُسے مہاراجا سے بھی ملوایا۔ مہاراجا کا خیال تھا کہ موہن داس جیسے نوجوان کو تو راج محل میں ہونا چاہیے۔ کنول نے مچل کے اس بات کی تائید کی اس طرح جمشید راج محل سے بہت مضبوط ہو کے اور بہت ٹوٹ کے واپس آیا۔ بھون آ کے اُس نے ایک خاص غرض سے پارو کی زبانی یہ افواہ اُڑوا دی کہ جگ دیپ نے راج کماری کنول کے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا اور مہاراجا نے آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ اُسی رات راہ داری میں جمشید کو سندھیا ملی سندھیا، ذیشان کی ایک نوخیز اور شریر بھانجی تھی وہ جب بھی جمشید سے ملتی ایک دم چھلانگ لگا کے جوان ہو جانے کی کوشش کرتی۔ اُس وقت وہ بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جمشید نے اُسے لائبریری کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں سندھیا نے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا۔ سندھیا کم عمری کے باوجود جمشید سے اس حد تک متاثر تھی کہ کچھ مدت قبل اُس نے اشا دلیری نامی ایک راج کماری کی زبان سے جمشید کی بُرائی سُن کے اُسے چپکے سے شوٹ کر دیا تھا اور آج اُس نے جمشید کو یہ بتا کے سر سے پاؤں تک دہلا دیا کہ بڑی حویلی کی حالیہ واردات اُس کے غصے کا کرشمہ تھی کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ اُس کے دلیتا موہن داس پر تیر کہاں سے پھینکے جاتے ہیں۔ اُسے افسوس تھا کہ جگ دیپ بچ گیا۔ جمشید سُن ہوگیا اور اُس نے بے اختیار اُسے اپنے سینے میں بھر لیا۔ دونوں رات بھر ایک دوسرے کے سینے میں چھپے ہوئے روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور رونے کا وقت نہ رہا۔

جمشید نے دھڑکتے ہوئے دل سے اُسے رخصت کیا۔ نیچے ایک اور قیامت اُس کی منتظر تھی۔ سادھو دیو راج اُس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ جمشید کا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں سادھو نے اُس کی اور سندھیا کی گفتگو سُن لی ہو لیکن ابھی وہ ریاست میں سادھو دیو راج کا اقبال دیکھ چکا تھا۔ جمشید نے ایک چور کی طرح کترا کے آگے نکل جانا چاہا لیکن سادھو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُسے روک لیا اور دل سوز لہجے میں اپنا پرانا مطالبہ دہرایا کہ بس اب چلا چل۔ تمھے نکل جانے گا اور تو روتا رہے گا: جمشید نے زچ ہو کے یہ پوچھنے کے بجائے کہ یہ تم بار بار کہاں چلنے کو کہتے ہو کہ میرا انتظار ہے اور سے کیوں نکل جائے گا سادھو کی بات تسلیم کر لی۔ البتہ اُس نے معنی خیز انداز میں یہ کہا جسے میرا انتظار ہے یہ دیر بھی شاید اُسی کی طرف سے ہے۔ جمشید نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی لاعلمی سادھو دیو راج اور پنڈت ایشوری لال پر آشکار ہو۔ سادھو اُسے اس طرح بھگا رہا تھا جیسے جمشید کوئی بہت بڑی نعمت ٹھکرا رہا ہو تاہم اُس کا لہجہ تنبیہی اور التجائی تھا۔ جمشید نے پھر ایک بار اُسے ٹال دیا۔ پھر وہ اُسے عزت و احترام سے مندر میں چھوڑ کے آرہا تھا کہ راستے میں ترنم نظر آگئی۔ وہ رُک گیا۔ ترنم ایک حسین لڑکی جس کا بن پھولوں کا بن تھا۔ وہ جمشید پر ایک بوجھ بنی ہوئی تھی۔ جمشید نے عاجزی سے اسے پھر واپسی کی ترغیب دی اور ریاست کے منتشر حالات سے ڈرایا مگر وہ کسی بات سے خوف زدہ نہیں ہوئی۔ اُس نے کہا کہ ہم تو اب بندھ چکے ہیں اور ہماری واپسی ممکن نہیں ہے۔

اُدھر ذیشان کے محل میں ریاست کے دو اعلا پولیس افسر اور بڑی حویلی کی واردات کے سلسلے میں آئے ہوئے تین اشخاص بیٹھے تھے۔ انھوں نے جمشید کو دلچسپ نظروں سے دیکھا اور طنز کیا کہ ہم نے ان کی بڑی شہرت سُنی ہے۔ جمشید ضبط کر گیا۔ اُس نے اُنھیں مشورہ دیا کہ تفتیش کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں اس ریاست کی آب و ہوا، مٹی اور محل وقوع سے بھی پوری واقفیت ہونی چاہیے۔ وہ چلے گئے لیکن اُن کے تیور ایسے نہیں تھے جو بھلی ملاقات والوں کے ہوتے ہیں۔ گمان ہوتا تھا کہ اُن کی آمد ضرور رنگ لائے گی۔ اُن کے جانے کے بعد جیسے ہی تخلیہ ہوا ذیشان نے اپنے دوست موہن کی توجہ کنول اور جگ دیپ کے بڑھتے ہوئے مراسم کی طرف دلائی۔ جمشید اُس سے یہ نہ کہہ سکا کہ یہ افواہ اُسی کے کرشمہ ساز ذہن کا شاخسانہ ہے۔ وہ ذیشان کو اگر بتا دیتا تو ذیشان کے چہرے پر چھائے ہوئے حزن و ملال میں تصنع پیدا ہو جاتا چنانچہ اُس نے ذیشان کی غلط فہمی دُور نہیں کی بلکہ کنول کو فون کر کے اُکسایا کہ بعض ناگزیر وجوہ کے سبب اُس کا بڑی حویلی میں ایک آدھ چکر لگانا مفید ہوگا۔ دوسری طرف اُس نے پولیس کی توجہ بٹانے کے لیے ایک گم نام فون کے ذریعے لاکھی پور کے سرکشوں اور ریاست کے دو ایک دشمنوں کے نام پولیس کے گوش گزار کر دیے۔ اِدھر نوخیز سندھیا کو اُس نے تنبیہ کی کہ کہیں وہ چھلک نہ پڑے۔ اُس نے اُسے سمجھایا کہ اب سندھیا کی تمام تر دلچسپی کھیلوں اور کتابوں کی طرف ہونی چاہیے۔ سندھیا نے اور ہی بات کہی کہ اب اس ماحول میں اُس کا دل ہی نہیں لگتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ وہ اُسے کہیں اور لے چلے۔ بھون میں جمشید اور پارو کی اُڑائی ہوئی افواہ رنگ لا رہی تھی۔ ہر طرف یہی سرگوشیاں تھیں کہ راج کماری جگ دیپ اور کماری کنول ایک دوسرے سے منسلک ہونے والے ہیں۔ اس افواہ کے نتائج حسب منشا برآمد ہوئے۔ راج محل میں جگ دیپ کی آمد بڑھ گئی اور پریت کے چہرے پر زردی اُمڈنے لگی مگر ایک اور حادثہ ہوگیا۔ بھون کی ایک کماری ہیمالنے اچانک خودکشی کر لی۔ اُس نے وصیت کی تھی کہ اُس کی ارتھی کو صرف کنور جگ دیپ آگ لگائے۔ یہ وصیت چھپائی گئی۔ ہیما کی ارتھی اٹھی تو جمشید کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ پارو کا دل ڈول رہا تھا۔ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ کالج کی گڑیا ہیما چھپ کے کنور جگ دیپ سے اس حد تک وابستہ ہو سکتی تھی۔ بھون پر سوگ چھا گیا۔ ہیما کی موت کے دوسرے دن خلاف توقع کرنل ہارڈنگ کا فون آیا۔ اُس نے جمشید کو چھاؤنی طلب کیا۔ جمشید شدید تذبذب اور تردد میں بھون سے روانہ ہوا۔ راستے میں راج محل پڑتا تھا۔ اُس نے سوچا کرنل کی طلبی پر فوراً حاضر ہو جانا مناسب نہیں ہوگا چنانچہ وہ راج محل میں راج کماری کی بارگاہ میں حاضر ہوگیا۔ کنول اُسے اچانک دیکھ کے کھِل اُٹھی لیکن اس نے شاردا اور مہاراجا کے سلسلے میں ذیشان کی سرد مہری کا شکوہ کیا اور کہا کہ مہاراجا اپنے دل میں شاردا کو نقش کیے بیٹھے ہیں۔ جمشید نے سر جھکا کے یہ سب کچھ سُنا اور وعدہ کیا کہ وہ ذیشان چند کی خدمت میں راج کماری کا شکوہ پیش کر دے گا پھر وہ راج محل سے نکل تو آیا مگر اُس سے گاڑی نہیں چلائی جا رہی تھی۔ وہ دیر تک سڑکوں پر منتشر رہا پھر جب وہ چھاؤنی پہنچا تو کرنل نے اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور اُسے ہدایت کی کہ وہ فی الفور ریاست چھوڑ کے رینا کے ساتھ انگلستان چلا جائے۔

جو کچھ
مسز جمشید عالم
پر گزری
اگر وہ آپ پر
گزرتی؟



کرنل میرے جواب کا منتظر تھا۔

میں نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور میری ٹھٹھری ہوئی انگلیاں میرے گالوں کا گوشت نوچنے لگیں۔ کرنل اپنی نشست سے اُٹھ کے ہلکے قدموں سے میرے پاس آیا۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے کُرسی پہ بٹھا دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں برف کی کرسی پہ بیٹھ گیا ہوں اور وہ آہستہ آہستہ زمین میں دھنس رہی ہے۔ کرنل کچھ دیر تک گُم سُم میرے نزدیک کھڑا رہا۔ پھر الماری سے بوتل نکال کے اُس نے پیگ میں کچھ اور شراب انڈیلی اور ایک ہی گھونٹ میں اُسے پی گیا۔ "شاید" اُس کی دھندلی آواز اُبھری۔ "شاید تمھارے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع ہو' مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے مگر مجھے یقین ہے" اُس کے لہجے میں یکسانی نہیں تھی "میں نے سوچنے کے لیے ایک مناسب وقت صرف کیا ہے اور ان حالات میں یہ ایک برمحل فیصلہ ہے۔"

میری زبان پتھرا گئی تھی اور مجھے اُس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ کرنل دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور رُومال سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگا۔ میرے لب کچھ کہنے کے لیے کھُلے مگر لرز کے ساکت ہو گئے۔ میرے ہاتھوں میں سکت ہی نہیں تھی ورنہ جیب سے پستول نکال کے اُس کے سامنے رکھ دیتا کہ ایک برجستہ فیصلے کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے اور اُس نے شاید اس پہلو پر نہیں سوچا ہے۔ کرنل نے اپنی نگاہ میرے چہرے سے ہٹالی تھی اور آتش دان پر رکھی ہوئی ریتا کی تصویر گھور رہا تھا "وہ بالکل اپنی ماں کی طرح ہے" اُس کی بوجھل آواز کمرے میں گونجی "وہی صورت' وہی مزاج' اُس کی ماں نے جب تک وہ زندہ رہی' مجھے خوش رکھا۔ مجھے اُمید ہے ریتا بھی تمھیں اُسی کی طرح خوش رکھے گی۔ اور تم۔ تم بھی۔۔۔۔۔"

کرنل کی آواز بتدریج ڈوبتی گئی۔ کمرے پہ پھر ایک مہیب سناٹا طاری ہو گیا۔ کرنل کی مضطرب نگاہ پھر میرے بُت پہ آ کے جم گئی۔

میرا بُت ڈگمگانے لگا۔ میں نے اپنی سانسیں استوار کرنے اور گلا تر کرنے کی کوشش کی "کرنل! میں کہنا چاہتا تھا' بس کرو' ایک غریب اور درماندہ آدمی سے ایسا مذاق مت کرو' میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں' مگر مجھ سے کچھ نہ کہا جا سکا۔ میرے حلق میں گانٹھیں پڑی ہوئی تھیں اور سینے میں ایک بے حرف و صوت شور اُمڈ رہا تھا" میں چلا جاؤں گا کرنل صاحب! "میری گھٹی گھٹی ہوئی آواز بہ مشکل تمام میرے سینے سے برآمد ہوئی" میں چلا جاؤں گا۔"

"کہاں چلے جاؤ گے؟" کرنل نے لرزیدہ لہجے میں پوچھا۔

"کہیں بھی چلا جاؤں گا' بہت دُور چلا جاؤں گا۔"

"اوہ نہیں" وہ اپنا سر تیزی سے ہلانے لگا اور بھاری آواز میں بولا۔ "میں بھی تو تمھیں دُور ہی جانے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ غالباً تم نے میری بات توجہ سے نہیں سُنی؟"

"میں نے سُن لی ہے کرنل صاحب!" میں نے نظریں جھکا کے شکستہ لہجے میں کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہاں سے بہت دُور چلا جاؤں گا اور آپ کو۔۔۔ آپ کو خود سے شرمندگی بھی نہیں ہو گی۔"

کرنل اُٹھ کے کھڑا ہو گیا "مجھے اُمید تھی کہ تم یہی جواب دو گے۔ ایک لائق اور متوازن نوجوان کا جواب یہی ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ میری آنکھیں کوئی غلطی نہیں کر سکتی"۔ وہ پُرجوش لہجے میں بولا "بے شک تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔ تم ایک نوجوان آدمی ہو اور عام نوجوانوں سے مختلف۔ میں تمھارا مشاہدہ کر چکا ہوں' تم جو کہتے ہو اُس پہ عمل کرنے کی قوت بھی رکھتے ہو لیکن تم اکیلے نہیں جاؤ گے' تم ریتا کے ساتھ جاؤ گے' اگر تم اکیلے گئے تو وہ شریر لڑکی ساری دُنیا میں تمھیں ڈھونڈتی رہے گی اور مجھ سے کبھی بات نہیں کرے گی۔ میں نے یہاں تمھیں بے سبب نہیں بلایا ہے' میں تم دونوں کے درمیان سے اپنی دیوار ہٹاتا ہوں' میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں' خدا کرے تم۔۔۔۔"

"کرنل' کرنل!" میں نے ہیجانی لہجے میں کہا "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا' میں آپ سے کیا کہوں کرنل! یا تو آپ مجھ سے بہت بڑا مذاق کر رہے ہیں یا اپنے آپ سے۔ میں آپ کے رتبے سے واقف ہوں مگر آپ میری کم مائگی اور تہی ذہنی سے یکسر ناآشنا ہیں۔ میں آپ کو یاد دلاتا ہوں' زیادہ وقت نہیں گزرا' میں اس جگہ سے کچھ ہی دُور آپ کے زنداں میں مقیم تھا اور میری زندگی کے سارے چراغ بجھ چکے تھے لیکن شاید کوئی کرن باقی رہ گئی تھی جس کی لَو سے دوبارہ آپ کے سامنے نظر آ رہا ہوں۔ آپ نہیں جانتے کہ میں کہاں سے چل کے آ رہا ہوں' کیا آپ سب کچھ بھول گئے؟ کرنل! اگر یہ بھی کوئی آزمائش ہے تو میں برملا اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔"

کرنل نے اپنا ہاتھ اُٹھا کے مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی "تم بھول گئے ہو کہ میں نے ابھی کیا کہا تھا" اُس نے کسی قدر پُرسکون لہجے میں کہا "میں نے کہا تھا کہ تم جو بھی ہو' جیسے بھی ہو' ریتا کے لیے میں تمھیں قبول کرتا ہوں اور میں نے تم سے کہا تھا کہ جو کچھ تمھارے ساتھ پیش آیا۔ میں اُس کے لیے معذرت خواہ نہیں ہوں' میرا خیال ہے' ہمیں پیچھے مڑ کے نہیں دیکھنا چاہیے جب کہ آگے ایک سرسبز اور کشادہ راستہ نظر آ رہا ہے۔ آدمی کو آدمی سے یوں بھی دیرپا توقعات وابستہ نہیں رکھنی چاہئیں۔ بہت سیدھے چلتے ہوئے آدمی بھی اکثر اچانک راستہ بدل دیتے ہیں' ریتا تمھاری زندگی کے باقی سفر کے لیے ایک عمدہ رفیق ثابت ہو گی کیونکہ اُس نے تمھارے متعلق بہت کچھ سوچا ہے اور تم بھی اُس کے لیے بہترین ساتھی ثابت ہو گے کیونکہ تم نے اُسے اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا ہے اور خود اُس کی رفاقت کے آرزومند رہے ہو۔ یہ تمام باتیں ایک خوش آیند وقت کی علامت کہی جا سکتی ہیں۔ کاش صورتِ حال اس طرح پیش نہ آتی۔ کاش میں یہاں راجے پور میں کوئی عہدے دار نہ ہوتا اور یہ سماجی و سیاسی پیچیدگیاں نہ ہوتیں۔ میں تم سے غیر ضروری انکسار برتنے سے احتراز کرنے پر اصرار کروں گا۔ وقت بہت مختصر معلوم ہوتا ہے" وہ متذبذب سا بولا "اس وقت

ں یہاں ہوں کل ہائی کمان مجھے کسی اور جگہ کی ذمّے داری تفویض کر سکتی ہے اور حالات ناقابلِ تصور حد تک بدل سکتے ہیں۔ مائی پوبر سن! تمھارے یے میرے پاس اس سے بہتر کوئی مشورہ نہیں ہے کہ تم کسی تاخیر کے بغیر اں سے چلے جاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تم دونوں کو ایک ساتھ رخصت ہیں کر سکتا۔ ریتا تمھیں بمبئی میں مل جائے گی پھر تم دونوں ایک ہی جہاز سے پنے نئے سفر پر روانہ ہو جاؤ گے۔ باقی تفصیلات تم ریتا سے طے کر لینا۔"

"مگر کرنل! کرنل!" میں نے گھُٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ...."

"اور کچھ نہیں۔" اُس نے میری بات کاٹ دی اور آنکھیں میچ کے لا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہو گے۔ راج کمار دنیش چندر! انھیں ایک ہے آدمی کی حیثیت سے اُن کا خیال یقیناً ہونا چاہیے۔ وہ تمھاری کمی شدت ے محسوس کریں گے لیکن میری کوشش ہوگی کہ انھیں یہ کمی محسوس نہ ہونے ں۔ میں اس سلسلے میں کوئی حتمی وعدہ نہیں کر سکتا لیکن انھیں بہتر مشورے نے سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ اگر تم اُن سے اجازت حاصل کرو گے تو ایک شریف ہمدرد آقا یا دوست کی طرح وہ تمھاری شادکامیوں کے راستے میں حائل نہیں ں گے۔ گو اُن سے اِس قسم کا تذکرہ نامناسب ہوگا۔ راج کمار دنیش تمھاری کمی سا نہیں، دس آدمیوں سے پوری کر سکتے ہیں۔ اُن کی ایک جنبشِ نگاہ اور حسنِ بیر سے نمک خواروں کی ایک فوج تیار ہو سکتی ہے۔ وہ بہرحال ایک راج کمار ں۔ ایک راج کمار! انھیں یہ نکتہ بطورِ خاص ذہن میں رکھنا چاہیے اور تم...؟ ارا اور ریتا کا تعلق راج کمار دنیش سے مختلف ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ بھلا دونوں ایک دوسرے کی کمی کس طرح پوری کرو گے؟ اگر یہ کمیاں اتنی آسانی سے ی ہو جایا کرتیں تو میں سب سے پہلے اُس کا علم حاصل کرنے کی جستجو کرتا۔ اور ہیں یہاں بلانے کی زحمت نہ دیتا۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بھے لہجے میں بولا۔ "تم نے ریاستوں کے مزاج کا خوب جائزہ لیا ہوگا۔ سب کچھ ے سامنے ہے، جو ہو رہا ہے اور جو ہو سکتا ہے۔ مجھے اندازہ ہے، تم میں ں و تعبیر کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے اور تمھاری نگاہ اس ریاست باہر کی زمینوں تک دیکھ سکتی ہے۔ ہر شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے ے میں سنجیدہ ہو۔ اپنے بارے میں سنجیدہ ہونے سے مُراد دوسروں سے غیر سنجیدہ نہیں ہے۔ بہرحال، تم ابھی کہہ رہے تھے کہ تمھیں باتوں سے نہیں بہلایا جا سکتا۔ اری خواہش کے مطابق میں نے تم سے عمودی گفتگو کی ہے۔ مجھے ایک لمک میں شرکت کرنی ہے۔" اُس نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ "ہائی کمان سے لِ کی ایک اور ٹیم کی آمد متوقع ہے۔ شاید میری مصروفیت بڑھ جائے۔ تمھیں ں بات کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو مجھ سے ابھی سوال کر سکتے ہو حالانکہ ی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تمھارا یہاں بار بار آنا مناسب نہیں ہوگا اور یتا کا باہر جانا مناسب ہوگا۔ تم جتنی جلدی خود کو موجودہ رابطوں سے آزاد کر لو اتنا ہی بہتر ہوگا۔" کرنل خاموش ہو گیا اور سگریٹ جلا کے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"لیکن، لیکن کرنل!" میں نے بہکے ہوئے انداز میں کہا۔ کرنل نے اس دفعہ درمیان میں دخل نہیں دیا۔ وہ آتش دان کے قریب رُک کے میرا چہرہ تکنے لگا۔ میری زبان لڑکھڑا کے خاموش ہو گئی۔ مجھ سے اپنا سر نہیں سنبھالا جا رہا تھا۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے؟" وہ جھجک کے بولا۔

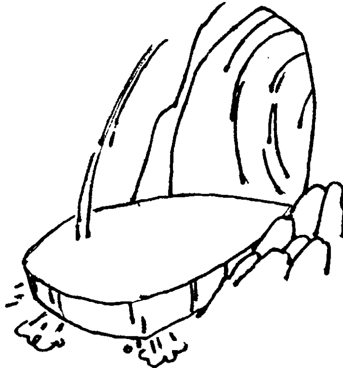
میں نے اپنی کمر کرسی کی پُشت سے ٹکا دی۔ مساموں سے ٹھنڈی پھوار رِسنے لگی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جلن سے آنکھیں بھنچی جا رہی تھیں۔ منہ میں کانٹے اُبھر آئے تھے۔ میری گردن خود بہ خود شانے پہ ڈھلک گئی۔ اب تک اتنا احساس باقی تھا کہ جگہ کون سی ہے، سامنے کون شخص ہے۔ اب یہ احساس بھی ختم ہوا۔ مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ کرنل کچھ دیر تک اپنی جگہ چُپ چاپ کھڑا رہا، پھر اُس نے دبے قدموں میرے پاس آ کے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انھیں زور زور سے دبانے لگا۔ "میں ریتا کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ تمھیں اُس کی ضرورت ہے۔ اُس کا حال بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ میں نے اُسے نہیں بتایا تھا کہ تم یہاں آ رہے ہو۔ وہ جب سُنے گی تو اُس کے رخساروں پر وہ لالی ضرور آئے گی جسے دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترس گئی ہیں۔ اُس نے لباس اور غذا کی طرف سے اتنی بے توجہی پہلے کبھی نہیں برتی تھی۔ پروفیسر! تم سچ کہتے تھے کہ تم نادیدہ قوتوں سے آشنا ہو۔ تم نے میری سلیم الطبع اور ہوش مند لڑکی کو ہوا پہ زندہ رکھا ہے۔ تمھارا خیال اُس کے خون میں رچ بس گیا ہے مگر... مگر دیکھو، اُسے مجھ سے چھین مت لینا۔"

کرنل تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔



پتہ نہیں کتنی دیر ہوئی تھی کہ کہیں قریب ہی سے جھکتی چاپیں سُنائی دیں۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ دروازے پہ ایک بجلی سی چمکی۔ ریتا نے پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھا، پھر جب اُس کی نظر مجھ پہ آئی تو اُس کے منہ سے ایک سہمی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ وہ بے تحاشا بھاگتی ہوئی میرے پیروں پہ آ کے ڈھیر ہو گئی اور اُس کا سر میرے زانوؤں پہ مچلنے لگا۔ مجھے اُس کا چہرہ کسی قدر اجنبی لگا۔ میں نے جھجک کے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھوں نے بے تابانہ اُس کا چہرہ سمیٹ لیا۔ اُس کے رُخسار جل رہے تھے اور آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ پھر ایک پل بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ ٹوٹ کے برسنے لگیں۔ میرے ہاتھ بھیگ گئے۔ اُسے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ آج میں نے اُسے بہت دن بعد دیکھا تھا، پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے، لباس پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں، چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں، اُس کے گلاب سے چہرے پہ سفیدی چھا گئی تھی۔ اتنے مختصر عرصے میں وہ کتنی بدل گئی تھی۔ اُسے دیکھ کے میرا سینہ کٹنے لگا۔ میں نے اُس کے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ لیے اور کرسی سے اُٹھ کے بے اختیار اُسے گلے لگا لیا۔ کرنل نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا کہ مجھے اس وقت ریتا کی ضرورت ہے۔ اُس کی مُراد یہ ہوگی کہ ریتا کی معرفت اُس کی





کہی ہوئی باتوں کی توثیق ہو جائے اور مجھے یقین آ جائے کرنل نے اپنی بیٹی کا حال بیان کرنے میں انکسار برتا تھا یا بخل کیا تھا یا شاید اُس نے اُسے سینے سے نہیں لگایا تھا۔ آدمی کا سینہ آئینہ ہوتا ہے۔ جب میں نے اُس کا تپیدہ اور لرزیدہ سراپا اپنے سینے میں محصور کیا تو مجھے اُس کا آئینہ نظر آیا اور کرنل کی باتوں کی شدت کا اندازہ ہوا۔ ریتا نے گزشتہ دنوں کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔ اُس نے اپنے نگار خانے میں ایک ہی تصویر بنانے میں وقت صرف کیا تھا۔ مجھے اُس کے شیشے میں اپنا عکس دیکھ کے جھرجھری آ گئی۔ لوگ سچ کہتے ہیں، آدمی کبھی کبھی اپنے ہی سائے سے ڈرنے لگتا ہے۔ جب سے کرنل نے اُس پر پابندیاں نرم کی تھیں، وہ ہر دوسرے تیسرے دن یا کبھی دن میں دو تین بار مجھے فون کرتی تھی مگر جو باتیں آدمی کی زبان نہیں کہہ پاتی، آنکھ بیان نہیں کر سکتی، اُن باتوں کا اظہار سینہ کر دیتا ہے۔ مجھے پہلے بھی کئی بار اُس کا سینہ دیکھنے کا موقع ملا تھا لیکن پہلے اُس میں اتنا ہیجان اتنا تلاطم اتنا شور نہیں تھا۔ ایسی تپش نہیں تھی جو آدمی کا شعور خس و خاشاک کر دے۔ وہ سسکاریاں بھرتی رہی اور اُس کے نرم و نازک بدن پر میرے بازوؤں کا حلقہ تنگ ہوتا گیا۔ جیسے جیسے وہ میرے جسم میں پیوست ہوتی گئی، مجھ پہ پھر یہ شبہ غالب آتا گیا کہ کرنل نے مجھ سے کوئی فریب کیا ہے، کوئی اپنی عزیز اور نادر چیزیں اس طرح دوسروں کے سپرد نہیں کرتا۔ کرنل نے مجھے یہاں میری کم تری کا احساس دلانے کے لیے طلب کیا ہے۔ ایک شخص جس کا رنگ، جس کی نسل مختلف ہو اور جس کا کوئی نام و نشان نہ ہو، غلاموں کے اس غلام کے ساتھ، اس خاک نشین کے ساتھ کوئی اچانک اتنی دریا دلی کا مظاہرہ کیسے کر سکتا ہے، وہ ایک مجسمہ تھی، جس کے خد و خال کسی ماہر نقاش نے تراشے تھے۔ سرو قد، لالہ بدن۔ وہ ایک گڑیا تھی جو بولتی تھی، ہنستی تھی، روتی تھی۔ یہ گراں بہا کھلونا بے صلہ کون کسی کو بخشش میں دے سکتا ہے۔ لوگوں میں تو صلہ دینے کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا، یہ کون سا اعتراف تھا، نشانے بازی کا اعتراف؟ چھاؤنی کی سلاخوں کے پیچھے جسم پہ نشانات کھانے کا صلہ؟ میں نے اُسے خوب زور سے جھنجوڑنا شروع کیا۔ وہ کوئی اور لڑکی نہیں تھی، وہ وہی تھی، وہ ریتا تھی، آفیسران کمانڈ کرنل ہارڈنگ کی بیٹی ریتا۔ اُس کے رخساروں کی مخمل جل رہی تھی اور اُس کی آنکھوں کے شیشے چھلک رہے تھے اور اُس کے بدن کا پارا تھرک رہا تھا اور وہ اپنا سراپا آنسوؤں میں تحلیل کرنے کے لیے بُری طرح بے چین تھی۔

میں نے اُسے ایک فاصلے پہ کھڑا کیا اور اُس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کے اُسے ایک ٹک تکتا رہا۔ وہ میری خیرہ نگاہوں کی تاب نہ لا سکی اور کسمسانے لگی۔ مجھے خود سے ندامت ہونے لگی۔ یہ پیمائشی نگاہیں، یہ ترازو و انداز، میں نے شدت سے خواہش کی کہ اُس کے چہرے پر داغ پڑ جائیں اور بدن پہ کانٹے اُگ آئیں تاکہ میری آنکھوں کو ان آلودہ لمحوں کے گناہ کی اچھی سزا ملے۔ میں نے سرزنش میں بے محابا سر جھٹکا اور اُس کی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آدمیوں کے پاس بینائی نہ ہوتی تو وہ پیمانوں کے یہ کشکول لیے نہ پھرتے، وہ سینہ ٹٹولتے اور چھاؤں میں بیٹھ جاتے۔ آدمی کے پاس یہ اُوپری بینائی نہ ہوتی تو اُس کے اندر کی بینائی ٹھیک طرح کام کرتی۔ کرنل ہارڈنگ کی لڑکی کا ستاروں کو شرمانے والا چہرہ، اُس کا کشیدہ، مرصع بدن، اُس کے اندر دھڑکتے ہوئے ایک جوہر کے حسن و جمال میں اضافے کا سبب تھا۔ یہ اس لطیف جوہر کا رتبہ بڑھاتا تھا۔ اس دُنیا میں ہر چیز مل جاتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں، شہد ملتا ہے، سبزہ اُگتا ہے، پھل ہوتے ہیں، ساز بجتے ہیں، پرندے گنگناتے ہیں، صبح ہوتی ہے، چاندنی بکھرتی ہے، تارے مسکراتے ہیں، ریشم ہوتا ہے، رنگ ہوتے ہیں، برسات ہوتی ہے، خوشبو ہوتی ہے اور جو نہیں ہوتا تھا، وہ انسانوں نے بنا لیا ہے۔ قسمت یاوری کرے تو تشنہ لبوں کو سبھی چیزیں مل جاتی ہیں مگر ان سب سے نادر ایک اور شے ہے جسے آدمی زندگی بھر ڈھونڈتا رہتا ہے، یہ جوہر کسی کو ملتا ہے کسی کو نہیں ملتا، زندگی یوں ہی گزر جاتی ہے ایسے بدنصیب بھی ہوتے ہیں جنھیں اس کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑتی مگر اُنھیں وہ راس نہیں آتا، وہ اُس کے متحمل نہیں ہو پاتے۔

میرے سامنے ریتا کھڑی تھی اور کرنل کی مضطرب صداؤں کی بازگشت



ر کانوں میں گونج رہی تھی، دل میں ٹبلبلے اُٹھتے تھے۔ ایک لہر رگِ جاں
ں نشّہ بکھیرتی ہوئی اُٹھتی تھی، دوسری لرزہ پیدا کر دیتی تھی۔ کبھی آنکھوں کے
منے روشنیاں جگ مگاتی تھیں، کبھی دُھند چھا جاتی تھی۔ ریتا نے میری
ھوں سے اپنے ہاتھ ہٹا کے اُنھیں میری گردن میں حمائل کر دیے اور تھرکتے ہوئے
ہا کھولے۔ "سب ٹھیک ہے نا؟" وہ منتشر آواز میں بولی۔

"ہاں"۔ میں نے جواب دینے کی کوشش کی۔ "گھڑی چل رہی ہے۔"

"اور تم..... تم آج کیسے آ گئے؟ مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"میرا خیال تھا، تمھیں معلوم ہوگا۔ مجھے کرنل نے طلب کیا تھا۔"

"ڈیڈی نے!" وہ حیرانی سے بولی۔ "انھوں نے یقیناً تمھیں پریشان کیا
ہوگا۔ کیا کہتے تھے؟" اُس کی جبیں پر شکنیں پڑ گئیں۔ "کرنل بہت ظالم
ی ہے موہن!"

"وہ بہت خوب صورت آدمی ہیں، بہت عجیب۔" میں نے کھوئے
ئے لہجے میں کہا۔ "تمھیں فخر ہونا چاہیے کہ تم اُن کی بیٹی ہو، وہ ایک سچے باپ ہیں۔"

"باپ!" وہ زہر خند سے بولی۔ "وہ ایک فوجی ہیں، ایک منصب دار،
ایک بندوق ہیں۔ اُن کا دل ایک مشین ہے۔ انھوں نے تمھیں بے وجہ نہیں
یا ہوگا، کوئی حکم دیا ہوگا، آنے والے اندیشوں سے سہمایا ہوگا۔ اس فن میں وہ
ی مہارت رکھتے ہیں۔"

"کیا تمھیں انھوں نے کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔ "کیا بات ہے؟"

"اُنھی سے پوچھ لینا۔" میں اُسے اپنے ساتھ لیے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میری اُن کی زیادہ بات نہیں ہوتی، تم بتاؤ۔" وہ بے تابی سے بولی۔

میں نے اُس کے گیسو درست کرتے ہوئے کہا۔ "مگر تم نے اپنا یہ
حلیہ بنا رکھا ہے، ناگوار باتوں سے اتنا مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ زندگی میں
کچھ بھی برداشت کیا جاتا ہے جو دوسروں کو پسند ہوتا ہے۔" "مجھے اپنی باتیں
ہی اجنبی اجنبی محسوس ہوئیں۔"

"موہن!" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ "جو تم کہہ رہے ہو، وہ میں بھی
سوچتی ہوں لیکن اپنے آپ پر میری گرفت کمزور ہو گئی ہے۔ میں نے بہت
بُرے دن گزارے ہیں، ہر وقت یہ گمان ہوتا تھا جیسے تم آ رہے ہو، راستے
میں ہو، ہر لمحے تمھاری فکر رہتی تھی۔ یہاں چھاؤنی کے افسروں کے درمیان ہونے
والی سرگوشیوں سے مجھے ہول آتا تھا اور وہ راج کمار کنور جگ دیپ جب بھی
یہاں آتا تھا، مجھے اختلاج ہونے لگتا تھا۔ یہ بہت سے دار پہلے بھی سنگینیں لیے
ہوئے یہاں کھڑے رہتے تھے مگر پہلے ان کی شکلیں کبھی اتنی ڈراؤنی نہیں لگتی
تھیں۔ میرے پاس تمھاری خیر رکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، نہ مجھے ریاست
میں ہونے والی سرگرمیوں کا کچھ پتہ چلتا تھا۔ ڈیڈی اِن دنوں بہت خاموش،
بہت فکر مند نظر آتے تھے اور مجھے باہر کے حالات بتاتے ہوئے کترانے
لگے تھے لیکن اُن کا چہرہ چغلی کھاتا تھا۔ ایک رات جب میں چھاؤنی کے
کلب گئی تو وہاں افسروں کی بیویوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کے
مجھے وحشت ہونے لگی۔ پھر میں نے گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا۔ جب ڈیڈی
نے مجھے اجازت دی تو تمھارا لہجہ بھی گھبرایا ہوا تھا۔ بڑی حویلی کی واردات
کی خبر سن کے مجھے تمھاری طرف سے بہت فکر رہنے لگی۔ پھر کماری ہیما
کی خبر آئی۔ میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا تھا کہ اگر انھوں نے جلد ہی کوئی فیصلہ
کن قدم نہ اُٹھایا تو اور بھی بہت سے خون اُن کی گردن پر ہوں گے۔ پھر چھاؤنی
یہاں کیوں قائم ہے اور یہ گورے یہاں اپنے ہتھیاروں اور فوجوں کے ساتھ
کیوں دھرنا دیے بیٹھے ہیں، کیا تماشا دیکھنے کے لیے۔ اگر وہ ریاست کے
لوگوں کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتے تو یہ ناٹک کیوں رچایا ہوا ہے،
میں نے ڈیڈی سے کہا تھا کہ اُن کی یہ غفلت مجرمانہ ہے، یہ چشم پوشی ایک
گناہ ہے۔ انھیں کھل کے سامنے آنا چاہیے اور اگر مقامی لوگوں کے درمیان
کوئی ابہام ہے تو انھیں اُسے دُور کرنا چاہیے۔ میں نے ڈیڈی سے بہت
سی باتیں کی تھیں مگر جب ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو میں نے خاموشی
اختیار کر لی۔ میں نے اُن کے سامنے آنا، اُن سے بات کرنا ہی بند کر دیا۔ یہاں

ہر طرف سے خون کی بُو آتی ہے۔ اس دہشت سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں نے تمھیں فون پر اس خیال سے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ یہاں چھاؤنی کی مشکوک سرگرمیوں کی کوئی خبر دے سکتی تھی کہ تم اور پریشان ہو جاؤ گے لیکن میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ کسی وقت چھاؤنی سے نکل کے تمھارے پاس پہنچ جاؤں اور تمھیں اس آفت زدہ علاقے سے نکال کے کہیں دُور لے جاؤں۔ پھر سوچتی تھی کہ اس طرح تو تمھارے لیے اور فتنے کھڑے ہو سکتے ہیں وہ کہاں موجود نہیں ہیں اور اپنے کئی لوگوں کی موت کے بعد تو وہ آج کل بے حد حساس ہو گئے ہیں۔ موہن!" وہ ہیبت زدہ لہجے میں بولی "کوئی صورت یہاں سے دُور ہونے کی نکالو۔ چھاؤنی کی قید سے باہر آنے کے بعد تمھاری وہ اذیت ناک حالت میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ واقعات پھر دُہرائے جا سکتے ہیں۔ کرنل بھی حکم کا غلام ہے۔ اُوپر سے کوئی بھی حکم آسکتا ہے۔ راج کمار دنیش چندر سے کہو کہ وہ کچھ دنوں کے لیے یہ ریاست چھوڑ دیں۔ پھر میں بھی یہاں سے چپکے سے نکل جاؤں گی اور ہم کسی ایسی جگہ مل کے رہیں گے جہاں آدمی کندھوں پر بندوقیں سنبھالے نہ پھرتے ہوں جہاں ایسی سردی ایسی گرمی نہ پڑتی ہو اور جہاں آدمی اتنا ارزاں نہ ہو۔ موہن! تم کہتے تھے کہ اچھے دن جلد آنے والے ہیں کہیں اچھے دنوں کے انتظار میں سب کچھ ہاتھ سے نکل نہ جائے، ہر لمحے یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں تم گم نہ ہو جاؤ۔ یہ بہت عذاب ہے موہن!" وہ سسکتی ہوئی بولی "کوئی میرا دل بار بار مٹھی میں جکڑ لیتا ہے۔"

میں اُسے سُنتا اور دیکھتا رہا تھا اور جو کچھ وہ نہیں کہہ رہی تھی، وہ بھی سُنتا رہا تھا اور میرے ذہن میں اُس کی بے شمار تصویریں اُبھر رہی تھیں۔ اُس کے عکس اُس کے خاکے، نت نئے لباس میں، کبھی سمندر کے کنارے، کبھی چاندنی کے تلے، روتے ہوئے، ہنستے ہوئے، گاتے ہوئے، باورچی خانے میں شامی کباب تلتے ہوئے، میرے کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے، میرا سر اپنے زانو پر رکھے ہوئے، اپنے لبوں کا لمس پیش کرتے ہوئے، شکایت کرتے ہوئے، ڈانٹتے ہوئے، روٹھتے ہوئے، پیٹ میں گدگدی سے کھِل کھِلا کے ہنستے ہوئے۔ اُس نے میرا بازو جھنجوڑا تو مجھے ہوش آیا۔ سارے خاکے منتشر ہو گئے۔ میں نے ہڑبڑا کے اُسے دیکھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" وہ دردیدہ لہجے میں بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے خفت سے کہا۔ "میں یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔"

"اور میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہی تم نے کچھ سُنا؟"

"ہاں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "بہت سُنا۔"

"مگر تم اتنے چُپ چُپ کیوں ہو؟ تمھاری وہ تیز بیانی اور نکتہ رسی کیا ہوئی؟ تم نے آج مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں تم سے کچھ سُننا چاہتی ہوں۔ یقیناً تم نے بہت سوچا ہو گا۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا لیکن تم..... تمھارا ذہن بہت زرخیز ہے۔ تم نے ضرور کچھ سوچ رکھا ہو گا۔ بتاؤ کیا کریں موہن؟" وہ ہانپتی ہوئی بولی اور اُس نے اپنا سر میرے کندھے پر ڈھلکا دیا۔

"اب شاید سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ستارے بدل رہے ہیں۔"

"کیا؟" وہ چونک کے بولی۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"لیکن رینا! تم نے کبھی صحرا میں پھول کھلنے کی روایت سُنی ہے؟ صحرا ہمیشہ پھولوں کی آرزو کرتا ہے۔ اس میں نہ صحرا کی غلطی ہے نہ پھولوں کی۔"

"مجھے بتاؤ کیا بات ہے، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ بے چین ہو گئی۔ اُسے کچھ یاد آیا اور وہ آنکھیں پٹ پٹاتی ہوئی بولی۔ "ہاں تم نے بتایا نہیں، ڈیڈی نے تمھیں کیوں بُلایا تھا؟ وہ اچانک اتنے مہربان کیسے ہو گئے؟ اس میں بھی اُن کی کوئی مصلحت ہو گی۔ ڈیڈی مصلحت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ مجھے وہ کچھ نہیں بتا پائیں گے اور نہ میں اُن سے پوچھ سکوں گی۔ آخر تم کیوں چھپا رہے ہو، ضرور کوئی بہت بُری بات ہے؟"

"نہیں، بہت اچھی بات ہے۔" سوچا اُسے بتا دوں کہ کرنل نے اس بار کتنی بڑی مصلحت کا ثبوت دیا ہے، کتنے بڑے اعزاز سے نوازنے کا حکم جاری کیا ہے۔ دریا کا دھارا موڑ دینے کا ارادہ کیا ہے مگر زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اپنی پراگندہ ذہنی کا خیال آتا تھا، شک تھا کہ شاید اُن ردِعمل کا اظہار نہ ہو پائے جن کی وہ یہ ناگہاں مژدۂ جاں فزا سُنتے ہوئے توقع کرتی ہو گی، کرنل نے ایسے وقت میں اپنی نوازش کا خزانہ لُٹایا تھا جب ہر سو ویرانی، بے امانی تھی، تردد کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ کرنل نے سلاخوں کی نہیں شاخِ گُل کی پیش کش کی تھی۔ کرنل نے رینا کا حوالہ دیا تھا اور رینا وہ لڑکی تھی جس کے حصول کے لیے لوگ ایک عمر محنت کرتے ہیں، محل کھڑے کرتے ہیں، زندگی کی ساری خوب صورت چیزوں کا انبار لگا دیتے ہیں تب کہیں رینا کی بے نیاز نگاہ اُٹھنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ کرنل کے حکم میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی، کوئی جھول نہیں تھا، یہ ایک کرنل کا حکم تھا، آفیسر ان کمانڈ کا حکم، تعمیل میں رینا کا معاوضہ تھا، رینا معاوضے میں نہ ہوتی تب بھی وہ ایک حاکم کا حکم تھا جس کے صرف ایک اشارے پر ایک بڑی فوج دندناتی ہوئی میدان میں اُتر جاتی تھی۔ اگر حالات کی روش یہ نہ ہوتی اور کرنل اس طرح چھاؤنی میں طلب نہ کرتا اور رینا جیسی کوئی لڑکی آکے کسی نوجوان کو اپنی پریشان زُلفیں، اپنے جلتے ہوئے رخسار، اپنا چاک گریباں دکھاتی تو اُس کے قدم لرزنے لگتے۔ آدمی موت اور زندگی میں عموماً زندگی کا فیصلہ کرنے کا عادی ہوتا ہے چاہے اُس زندگی میں پاؤں لہولہان ہو جائیں، لباس تار تار ہو جائے۔ یہاں تو رینا تھی اور رینا مصر کے بازار سے خریدی ہوئی کسی امیر کی کنیز نہیں تھی جو سخاوت کی ترنگ میں کسی غلام کو سونپی جا رہی ہو، وہ ایک ملکہ تھی جو ایک غلام کی مدعی تھی۔ غلام کا ذہن اپنی یا وہ خیالیوں سے اتنا سہم گیا کہ اُسے یقین آنے اور یک سُو ہونے میں دیر لگی۔ پیچھے بہت سی صدائیں آرہی تھیں۔ کانوں کو سمجھاتے سمجھاتے دیر لگ گئی، نوشتہ پڑھتے میں دیر لگ گئی۔ نوشتہ بھی کیا چیز ہے، جو حرف پہچانتے ہیں، اُنھی کو اسے پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

ہیں کرنل اور رینتا کے سامنے ایک ہی جواز پیش کر سکتا تھا کہ یہ میں ہوں
میرا نام وہ نہیں ہے جو لیا جاتا ہے میں ایک بھگوڑا شخص ہوں میرے ہاتھ
لال ہیں اور میرے دل میں یہ آرزو اور اُمیدوں کے جو حباب اُٹھتے ہیں میں
اُن کا اہل نہیں ہوں میں وہ زندہ آدمی ہوں جس نے موت کا حق بہ جبر چھین رکھا
ہے۔ایک نیکی کی اجازت دو کہ روح اگر کوئی چیز ہے تو اُس کے سکون کا
سامان ہو جائے ہیں نہ کرنل کو نہ رینتا اور نہ کسی اور کو اپنا چہرہ دکھانے اپنی
پہچان بتانے پہ قادر ہو سکا میرے لفظ میرے منہ ہی میں گھٹ گھٹ کے
پانی ہوتے رہے اور میں اس کسیلے کڑوے پانی سے اپنا خشک گلا تر کرتا رہا۔
مجھے اُن لوگوں کی یاد آئی کیونکہ میرے اندر کسی نہ کسی قدر ایک آدمی
کے جرثومے موجود تھے جو میری گم شدگی پر پریشان ہوں گے، جنھیں میری
یاد بہت ستائے گی مگر وہ لوگ میری موت کے بعد کیا کریں گے؟ میری
گم شدگی اور موت اُن کے لیے یکساں ہے کرنل کے حکم سے انکار میں موت
مضمر ہے اور یوں میری نہیں نور بینا کی ہلاکت ہے اور رینتا کا شمار بھی ایسے
لوگوں میں ہوتا ہے جو مجھے زندگی سے جابرانہ رشتہ قائم رکھنے پہ اُکساتے ہیں
میں سب کچھ صاف نظر آ رہا ہے۔تمام لوگوں کے لیے مر کے ایک شخص کے لیے
زندہ رہنا ٹھیرا اُس شخص کے لیے جس کی رفاقت کے احساس سے میرے سیاہ
خانہ دل میں روشنی کی کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں۔سوا ایک شخص کو تو میری
لاش سے کچھ فراہم ہوا جاتا ہے ورنہ کسی کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا اور میرا اختیار
ہی کہاں رہے کہ میں اپنا ورثہ کسی خاص شخص کے نام تفویض کر سکوں ملال کا بھی
یا جواز ہے کہ اس ترکِ اختیار کے بدلے میں رینتا پیش کی جا رہی ہے۔کرنل کے
حکم میں دونوں پہلو موجود ہیں زندگی بھی اور رینتا بھی۔
میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔وہ مچلتی اور پریشان ہوتی رہی اور اُس
کے چہرے پہ رنگوں کا سیل آتا جاتا رہا۔میں یہ منظر غور سے دیکھ رہا تھا
کیونکہ وہ چہرہ اب مجھے اپنا ہی چہرہ نظر آتا تھا۔میرا چہرہ میرے رنگ
میری آنکھیں میرے ابرو میری زلفیں۔میری زمین پہ گلِ لالہ اُگ آیا تھا۔
مجھے معلوم تھا کہ چھاؤنی کے اس دروازے سے ایک راستہ ریاست
سے باہر جانے کا بھی ہے۔سعادت مندی کا تقاضا تھا کہ کرنل کے ارشاد
کی تعمیل فی الفور ہو۔اب شہر کی طرف جانے اور پرکاش بھون میں چند ساعتیں
چند دن گزارنے کا جھوٹ کیوں بولا جائے۔جو طے ہو گیا ہے اُس میں
لغزش کے امکان کو کیوں ہوا دی جائے۔راج کمار دنیش اور وہاں کے
مکینوں کو خدا حافظ۔لوگ مر بھی تو جاتے ہیں آئے دن مرتے ہی رہتے ہیں میجر
ملبین کے ساتھ چلنے والی گولی کا نشانہ چند انچ بدل جاتا تو کیا ہوتا۔مرنے کے
بہت سے مواقع بھی آئے اگر ایک موقع بھی سچّا ثابت ہو جاتا تو لوگ کیا کر لیتے،
رتش چندر کے سر پہ پھر بھی آسمان رہتا۔سادھو پنڈت کا کہا درست نکلا آخر
یہی ہوا۔ذرا سی ترمیم کے ساتھ کہ اُن کے قول کے مطابق دُور پہاڑیوں میں

وہ ایک شخص جو میرے انتظار میں تھا، اُس کا دیدار نصیب نہ ہوا۔ دانہ کہاں کہاں لے گیا۔ الٰہ آباد سے کلکتے کی گلیوں میں لے گیا، وہاں بھی برداشت نہیں کیا۔ شہروں شہروں رُسوا کرتا رہا، پھر یہاں لے آیا۔ اب سمندر پار لے جانا چاہتا ہے۔ سرزمین کہیں تو اپنی کشش کی سچائی پر عمل پیرا ہوگی۔ راج کمار دنیش کی گاڑی میرے پاس تھی۔ مجھے واپس پرکاش بھون پہنچ کے حاضری لگانی تھی۔ کرنل کو یہ کبھی پسند نہ ہوگا کہ وہ خود پر ایک شخص کی گم شدگی کا الزام عائد کرنے کا اندیشہ مول لے۔ اُس نے انگشت درازوں اور نکتہ طرازوں کے خوف سے مجھے سمندر پار بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ کندھے پر ہتھیار موجود ہونے کے باوجود اُس میں آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرأت مفقود تھی۔ اپنے ہم رنگ رفیقوں سے تو وہ کچھ کہہ سن لیتا کہ اُس کی عزیز بیٹی مشرق کے سحر کی اسیر ہوگئی تھی اور اُس کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تھا حالانکہ اس ضمن میں اُن سے بات کرنا اور انھیں قائل کرنا بھی سُبکی کی بات تھی لیکن مقامی کالے لوگوں کی مسکراہٹ تو ناقابلِ برداشت ہوتی۔ کوئی نجیب الطرفین انگریز اسے گوارا نہ کرتا۔

کرنل واپس نہیں آیا اور نہ اُس کے آنے کی ضرورت تھی۔ میں نے ریتا سے دوبارہ جلد، بہت جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے جانے کی اجازت طلب کی۔ وہ بہت جز بز تھی لیکن اس کش مکش کے عالم میں آنے والے سنہرے دنوں کی کوئی کرن، کوئی رمق ضرور اُسے نظر آگئی تھی۔ مجھے یہاں بُلا کے اور اُسے یہاں میرے پاس بھیج کے کرنل کا جُدا ہو جانا ایک ذہین لڑکی کے لیے جہاں تشویش کا سبب تھا وہاں مثبت سوچ کی طرف بھی اشارہ کرتا تھا۔ ایک گوشہ ہمیشہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید وقت کی نیت بدل جائے۔ نامراد لوگ اسی تنگ گوشے میں پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور جب اس میں بھی عافیت نہیں ملتی تو آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ میں نے اُس کی آنکھیں چومیں کیونکہ وہ جاگتے جاگتے، روتے روتے اور سمتیں تکتے تکتے ویران ہوگئی تھیں۔ میں نے اُس کے گالوں پہ ہلکے ہلکے طمانچے مار کے اُن کی سُرخی واپس لانے کی کوشش کی۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھتی تھی اور لرزہ براندام ہو جاتی تھی۔ میں نے اُسے کئی بار اپنے بازوؤں میں بھرا، سمیٹا اور گدگدایا۔ بہت وقت گزر گیا تھا، چھاؤنی میں پرکاش بھون کے ملازم کا اتنی دیر تک قیام کرنل جیسے زود حس شخص کے لیے اذیت کا سبب بن سکتا تھا۔ میں نے کرنل کو اپنے جانے کی رسمی اطلاع دینا ضروری سمجھا اور مضطرب ریتا کو فوراً لباس بدلنے اور اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجانے کی تلقین کرتا ہوا چھاؤنی سے باہر آگیا۔

▲

دھوپ نرم پڑ چکی تھی، ابھی میں نے چند ہی فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ پیچھے سے ہارنوں کا شور سُنائی دیا۔ میں نے بازدید شیشے میں دیکھا تو کئی مسلح فوجی جیپیں آگے نکلنے کے لیے بے چین تھیں۔ میں نے گاڑی ایک کنارے کر لی۔ دو جیپیں آگے نکل گئیں، باقی دو پیچھے رہ گئیں۔ میں نے اُن کے نکلنے کا بھی انتظار کیا لیکن اُنھیں اپنے ساتھیوں کی طرح آگے نکلنے کی عجلت معلوم نہیں ہوتی تھی چنانچہ میں نے بھی گاڑی سڑک کے درمیان ڈال دی۔ رفتار ایسی کوئی تیز نہیں تھی، دل کی دھڑکن کے مطابق تھی۔ آگے والی دونوں جیپیں کچھ دُور تیز چل کے معتدل پڑ گئیں۔ یہی حال پیچھے آنے والی گاڑیوں کا ہوا۔ آگے پیچھے چاروں جیپوں کے درمیان میری گاڑی تھی اور سڑک سنسان تھی۔ چھاؤنی کی حدود سے نکلنے کے بعد لاکھی پور کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ ریاست کی پولیس کی ناراضی کے ان دنوں میں لاکھی پور والوں کی طرف سے کسی چھیڑ چھاڑ کا امکان نہیں تھا اور اگر کچھ امکان تھا بھی تو وہ گردوں سے لدی ہوئی ان جیپوں کی وجہ سے یکسر ختم ہو گیا تھا۔ تنگ اور ویران راستے، جہاں دونوں طرف پہاڑ تھے۔ وہ بھی گزر گئے مگر جیپوں کا مقررہ فاصلہ برقرار رہا اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اُن کی یہ رفتار اتفاقاً نہیں اہتماماً ہے۔ میری نگرانی کی جا رہی تھی، اسے تعاقب نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں خود چھاؤنی سے واپس آرہا تھا۔ اگر ناگواری ہوتی تو اتنی دُور کیوں آنے دیا جاتا۔ میں نے رفتار تیز کر کے دیکھی۔ جیپوں کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ راجے پور کی شہری حدود تک انھوں نے میرا ساتھ دیا۔ جیپوں نے آنکھ مچولی کھیلنے کی کوشش نہیں کی، گویا کرنل کو وقت اور راستے کی نزاکت کا پوری طرح احساس تھا۔

میں چوک میں آگیا۔ یہاں سے مختلف راستے، مختلف سمتوں میں جاتے تھے۔ ایک راستہ راج محل جا کے ختم ہوتا تھا۔ وہاں راج کماری کنول رہتی تھی، ایکسی لیٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ کمزور پڑتا گیا۔ وہی شہر، وہی لوگ، میری گاڑی کی جانب اُٹھتی ہوئی مشکوک نگاہیں۔ میں نے گاڑی پرکاش بھون کے گیراج میں چھوڑ کے فوراً واپس ہونے کا ارادہ باندھا۔ بہت سے ملازم گواہی دینے کے لیے تیار ہوں گے کہ ملازم مسمّی موہن داس چھاؤنی سے بھون واپس آیا تھا۔ اندر عمارتوں میں جا کے اپنا چہرہ دکھانے اور دوسروں کا چہرہ دیکھنے کی آزمائش میں نہ پڑنا ہی بہتر تھا۔ جانے والے پیچھے مُڑ مُڑ کے دیکھتے رہیں تو کبھی سفر نہ کر سکیں۔ سفر کے لیے دل کی مضبوطی شرط ہے۔

راج کمار کی مخصوص گاڑی دیکھ کے صدر دروازہ پورے اہتمام سے کھول دیا گیا۔ یہ کماری ہیما کی موت کے سوگ کا دوسرا دن تھا۔ بہت سی نئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور آسمان کے نیچے آ کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُور تک محلات کے سلسلے تھے اور درخت تھے۔ اُس طرف اصطبل تھا، اِدھر فیل خانہ۔ پچھواڑے ملازم رہتے تھے۔ بائیں جانب باغ تھا۔ دائیں جانب پیلس کا میدان تھا۔ لوگ اِدھر سے اُدھر گزرتے رہے۔ میں پیپل کے تنے سے کمر ٹکا کے دیر تک گُم سُم کھڑا رہا۔ وہ سامنے دنیش چندر کا سفید محل تھا۔ دنیش اِس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ سوگواروں کے ہجوم میں گھرا بیٹھا ہوگا۔ ممکن ہے میرے انتظار میں اُس نے کھانا بھی نہ کھایا ہو۔ سے لمحے لمحے دروازے

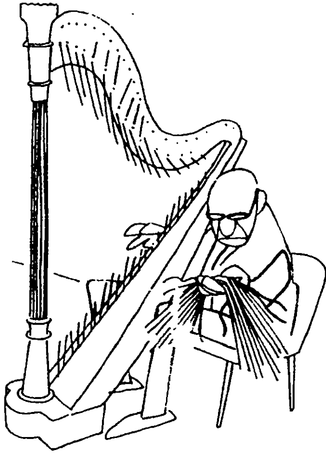
پہ نگاہ جاتی ہوگی اور شاردا اندر سے آ کے بار بار نگاہوں نگاہوں میں اُس سے سوال کرتی ہوگی، یا پھر شاید وہیں بیٹھی ہو، وہ میرے خاص کمرے میں اب تک دس مرتبہ مجھانک کے دیکھ آئی ہوگی اور وہ سندھیا کی بتّی دال گئی تھی۔ ممکن ہے وہ میری ہدایت کے مطابق کتابوں میں دھیان بٹا رہی ہو مگر کتابوں میں اُس کا جی کہاں لگ رہا ہوگا۔ پریت ہوگی، گزشتہ رات اُس پہ نہ جانے کیسی گزری ہو، ممکن ہے ابھی تک رو رہی ہوگی۔ وہ اپنا بیشتر وقت مہما کے ساتھ گزارتی تھی اور یہ کچھ فاصلے پہ مہمان خانہ ہے۔ ترنم ستار پر ریاض کر رہی ہوگی اور گلے میں دُنیا بھر کا سوز کھینچ رہی ہوگی۔

میں نے اپنی مٹھیاں زور سے بند کرلیں۔ میرا جسم اکڑ گیا اور اس سے پہلے کہ کوئی تماشا بنتا، میں نے آہستہ آہستہ اپنا وزن اُٹھا کے صدر دروازے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ بس ایک شخص کو دیکھ لیا جائے۔ ڈالی سے اشارہ کر دینے میں کوئی حرج نہیں کہ مجھے ایک لمبا سفر درپیش ہے۔ اتنے دلوں تک میرا انتظار کرے، میں نہ آؤں تو پھر کلکتے میں ایک شخص رہتا ہے، جارج اُس کا نام ہے اُس کے پاس چلی جائے، کہہ دوں گا کہ میں وہیں آ جاؤں گا۔ وقت گزر جائے گا تو خود ہی سنبھل جائے گی اور جارج اگر اُسے مل گیا تو کسی میم صاحب کی طرح اُس کی پزیرائی کرے گا۔ اُس در بدر کو گھر مل جائے گا، اپنے پاسبان دونوں تھکے ہوئے ہوں گے، ایک دوسرے سے مل کے ایک ہی راگ الاپنے لگیں گے اور دنیش چندر کے نام ایک خط لکھ کے کیوں نہ جاؤں تاکہ وہ میرے انتظار کی زحمت سے بچ جائے۔ شاردا کو بھی اُسے سمجھانے بجھانے میں آسانی ہوگی۔ کوئی معقول بہانہ کر کے وہ وقت گزروائے گا جو بے چین روحوں کے قرار کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

میرے قدم ماند پڑ گئے۔ کدّے کو پیار کرنے کے لیے ہونٹوں میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ اب جانا، تب جانا، جانا ہی ہے تو کیوں نہ ایک ہی بار سب کو جی بھر کے دیکھ لیا جائے۔ کرنل نے عجلت کا تقاضا بے شک کیا ہے مگر کوئی وقت بھی مقرر نہیں کیا۔ اُس سے کچھ وقت قرض مانگا جا سکتا ہے۔ میرے قدم کوارٹروں کی طرف جانے والے راستے پر خود بخود اُٹھ گئے مگر چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ بھون کا قدیم نمک خوار بوڑھا جانکی داس گھبرایا ہوا اِدھر آتا دکھائی دیا۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ جانکی داس ہانپتے ہوئے لہجے میں دُور ہی سے بولا "کدھر ہو موہن داس جی! بھیتا اپنے راج کمار کا مزاج ناساز ہے، کئی بار تمھیں پکار چکے ہیں۔"

"کیسی طبیعت ہے اُن کی؟" میں نے بوکھلا کے پوچھا۔

"بھیتر کا حال بھگوان جانے، وہ چھوکری مالتی بولتی تھی کہ راج کمار بستر پر ہیں۔ مہمانوں سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ دھیرج نہیں رہا ہوگا موہن داس جی! کماری مہیا، راج کمار کی بہن تھی، یاد آ رہی ہوگی۔ کوئی کب تک دھیرج رکھ سکتا ہے۔ جتنا مرا اُسے چھوٹے راج کمار پہ آیا ہے یہاں کسی پر نہیں آیا، جاؤ



اندر جا کے دیکھو۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور جانکی داس کو اپنے سامنے سے ہٹاتا ہوا دنیش چندر کے محل کی جانب بھاگنے لگا۔ راہ داری میں کئی لوگ نظر آئے مگر میں اُن سے نظریں چراتا ہوا ملاقاتی کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں اکا دکا ملازموں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے دنیش کی خواب گاہ کے دروازے پر جا کے دم لیا۔ شاردا اپنے بھائی کے سرہانے بیٹھی تھی اور دنیش کی آنکھیں بند تھیں، مجھے دیکھ کے شاردا نے بوجھل انداز میں گردن اُٹھائی اور کچھ کہا نہیں مگر میرے سارے جسم پہ جیسے چیونٹیاں پھینک دیں۔ میں نے دنیش کی مسہری پر جھک کے اُس کی دلائی تیزی سے ہٹائی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے ٹٹولنے لگا۔ دنیش کی آنکھ کھُل گئی۔ نقاہت سے مجھے دیکھا، ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آ گئی، اُٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کے کندھے پہ دباؤ ڈال کے اسے بستر پر لیٹا رہنے دیا۔ "کیا حال ہے آپ کا؟" میں نے کسمساتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"طبیعت بہت گھبرا رہی ہے موہن!" اُس نے نحیف لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے دیر ہو گئی۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "کوئی خاص بات؟"

"نہیں۔" اُس نے شاردا کی طرف دیکھ کے کہا۔ "بس یوں ہی بیٹھے بیٹھے دل بیٹھنے سا لگا۔ تم تو ٹھیک ہو؟ باہر کا موسم کیسا ہے؟" اُس کے لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"دن ڈوب رہا ہے اور شام حسبِ معمول اُبھر رہی ہے، باہر سب خیریت ہے۔" میں نے اُس کی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔ "اب باہر کی تمام فکروں سے بے نیاز ہو کے آنکھیں بند کر لیجیے اور خوب آرام کیجیے، کتنی راتیں جاگتے ہوئے ہو گئیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں باہر کھڑا رہوں گا اور کسی کو اندر نہیں آنے دوں گا۔"

"اور تم؟" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ "تم بنسرے ناراض ہی رہو گے۔

یہ شاردا بھی بہت تنگ کرنے لگی ہے۔ تم اسے سُلادو موہن!" وہ لجاجت سے کہنے لگا۔ "میری بات نہیں سُن رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں انھیں بھی دیکھتا ہوں۔ بھیا! آپ فکر مت کیجیے۔"

"تمھاری فکر۔" وہ کرب سے بولا۔ "تم تو دیکھ رہے ہو، تمھیں نہ نیند آتی ہے نہ بھوک لگتی ہے۔ صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔ شاردا!" وہ شاردا سے مخاطب ہو کے کہنے لگا۔ "ذرا موہن کے لیے کچھ کھانے کو لے آؤ۔ اس کا رنگ اُترا ہوا ہے۔ دیکھ رہی ہو، کیسا بیمار معلوم ہو رہا ہے۔"

شاردا نظریں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ دنیش کے تخاطب پر اُس کی پلکیں جھل مِلانے لگیں۔ اُس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا اور بے ساختہ اُٹھ کے دروازے کی طرف جانے لگی۔ مجھے بھوک بالکل نہیں لگ رہی تھی لیکن میں نے اُسے روکا نہیں۔ وہ فوراً واپس آگئی اور آ کے کسی دُلھن کی طرح بیٹھ گئی۔ اُس کے سر پہ ساڑی کا پلّو تھا۔ نگاہیں فرش پر تھیں۔ میں دنیش سے کہہ رہا تھا کہ اُس نے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا۔ وہ جواب میں مسکرانے لگا۔ پھر خواب گاہ پہ ایک گہری خاموشی مسلط ہو گئی جیسے کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا ہو۔ اتنی دیر میں باندی آگئی اور یہ سکوت کہیں چینی کے برتنوں نے درہم برہم کیا۔ شاردا نے باندی کو لوٹا دیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ چھوٹی میز پر کھانا چُن دیا گیا لیکن میں نے اُس وقت تک ہاتھ نہیں لگایا۔ جب تک وہ دونوں میز کے گرد نہ بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے لقمے بنا کے دنیش کے منہ میں ڈالنے شروع کیے۔ اُس کے لبوں پہ بے اختیار ہنسی پھوٹنے لگی۔ غذا غم کی تو ہین ہے۔ آدمی کو یہ ناروا کام نا وقت کرنا پڑتا ہے۔ شاید ایسے موقع پر ہر شخص اپنے آپ سے جھینپتا ہے۔ میں دنیش کے سامنے دنیش شاردا کے سامنے اور شاردا میرے سامنے، ہم تینوں ایک دوسرے کے سامنے پلیٹیں بڑھاتے رہے۔ اِس طرح سارا کھانا ختم ہو گیا۔ پھر میں نے دنیش کو بہ جبر مسہری پر لٹا دیا۔ اُس کے چہرے پہ پہلے کی نسبت سکون کے آثار عیاں ہو رہے تھے۔ ہم دونوں خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے باہر آگئے۔ شام پوری طرح فضا پر محیط ہو گئی تھی۔ ملاقاتی کمرے کے باہر ایک دربان تعینات کر دیا گیا تاکہ وہ ہر آنے والے سے معذرت کرتا رہے۔ باندیاں باہر بھیج دی گئیں۔ میں اور شاردا ملاقاتی کمرے میں تنہا رہ گئے۔

اور مجھے اچھی طرح اُسے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر بے حس و حرکت بیٹھی اپنی ساڑی کے اُبھرے ہوئے پھول نوچ رہی تھی۔ راجے پور کی ہونے والی مہارانی، شان و شکوہ اُس میں پہلے ہی تھا۔ سر پہ جب ایک طلائی مکٹ ہوگا تو اُس کے حُسن کا جلال اور اُبھر کے آئے گا۔ میرے جی میں آئی کہ میں اُسے گود میں اُٹھا کے اندر کمرے میں لے جاؤں اور اس کے پیروں پر سر رکھ کے التجا کروں کہ اُسے میری قسم، میری قسم سے بڑی اُس کے لیے کوئی اور قسم نہیں ہوگی، میری جان! کچھ کھیل ستاروں کا بھی ہوتا ہے اور دنیا میں صرف دو ہی آدمی نہیں رہتے، تیسرا بھی رہتا ہے۔ میری بات غور سے سن لے۔ اِس بھون کی بگڑی ہوئی قسمت تیرے ہاتھ میں ہے۔ مہاراجا امرناتھ کی بات مان لے۔ یہ سراپا راج محل کے شایانِ شان ہے۔ تیرا قد سرو جیسا، تیرے بال گھٹاؤں جیسے، تیرے خدوخال پریوں جیسے، تیرا رنگ گلاب، تیرا دل دریا جیسا، تیرا درجہ بہت بلند ہے۔ سمجھ لے کہ ایک خواب دیکھا تھا۔ سمجھ لے فریب ہو گیا۔ اپنے عزیز بھائی دنیش کا کچھ خیال کر لے۔ اس طرح اُسے کنول کی مُراد مِل جائے گی۔ خراب ہونے والی بات اب بھی سنبھل سکتی ہے۔ سمجھ لے کہ ایک مجہول، کج فہم، آوارہ، اوباش، غیر متوازن، ایک پاگل شخص سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ جھونپڑی جس کی تُو آرزو مند ہے، اس میں بڑا عذاب ہوتا ہے۔ بارش ہوتی ہے تو پانی ٹپ ٹپ گرتا ہے۔ زمین پر کیچڑ ہو جاتی ہے۔ سخت زمین پر چلتے چلتے تیرے پیروں میں چھالے پڑ جائیں گے۔ راج محل میں دُنیا کی ہر چیز موجود ہے۔ مہاراجا امرناتھ عام راجاؤں سے بالکل مختلف ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں، انھیں بھی کتابوں کا شوق ہے۔ وہاں رانیوں کی کثرت نہیں ہے، محل میں تیرا ہی راج ہوگا۔ ہر سمت تُو ہی تو گنگنائے گی۔ پتھر رکھ لے شاردا! یہ میں کہہ رہا ہوں، میں، ہاں میں۔ دیکھ میں کتنا بے غیرت ہوں۔ نیچ چھوٹے دل کا، میری طلب میں بیابان ہیں لیکن مجھ سے اپنی جگہ سے اُٹھا نہیں جا سکا۔ اُس نے بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ پھر میرے جی میں آئی کہ اس کا ایک اور حل بھی ہے۔ وہ یہ کہ میں اندر جا کے سوتے ہوئے دنیش کو گولی مار دوں اور اِدھر شاردا کو، پھر اطمینان سے اپنے جسم میں آگ لگا لوں۔ "شاردا!" میری بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ اُس نے اپنی بپھری ہوئی نگاہ میری جانب کی۔ میں بھول گیا کہ مجھے اُس سے کیا کہنا تھا۔ وہ تڑپ کے میرے پاس آگئی۔ میں خاموش رہا تو وہ زیرِ لب بولی۔ "تم نے مجھے آواز دی تھی؟"

"ہاں۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "تم مجھ سے ناراض ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تو پھر ایسے کیوں بیٹھی ہو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔ تم مجھ سے بہت ناراض ہو۔ میں تمھارے لائق نہیں ہوں، میں بہت . . . ." میں یہ سب کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے اپنے لفظوں پر قابو نہیں تھا۔

اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "موہن! موہن!" وہ بلکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم سے کیا بات کروں، تم بھی شاید یہی سوچ رہے تھے۔ اب کچھ بولا نہیں جاتا موہن! نہ اب کتابوں میں جی لگتا ہے۔ سارے لفظ بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ تم سے بس ایک بنتی ہے کہ تم اتنی دیر دیر تک غائب مت ہو جایا کرو اور مجھے بتا کے کہیں جایا کرو۔ تمھیں نہیں معلوم، جب تم سامنے نہیں ہوتے تو میرا کیا حال ہوتا ہے۔ میرا رُواں رُواں کانپتا رہتا ہے۔ یہ جو دنیش ابھی کہہ رہا تھا کہ اُس کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ وہی حال میرا ہوتا ہے بلکہ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں لیکن ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ میں کسی سے کچھ بھی کہہ نہیں سکتی۔ موہن! میں تم سے ناراض کیسے ہو سکتی ہوں۔ اسے ناراضی نہیں کہتے۔ اسے نہ جانے کیا کہتے ہیں۔

میں پوچھتی ہوں موہن! - اب کیا ہوگا، مجھے معلوم ہے کہ اس کا جواب تمھارے پاس نہیں ہے لیکن یہ سوال بار بار تنگ کرتا ہے۔ کل اچانک ہیما چلی گئی۔ بتاؤ کیا ایسے وقت میں میرا دل تمھاری طرف سے پریشان نہیں ہوتا ہوگا۔ ہر طرف اندھیرا ہے موہن! بہت اندھیرا ہے۔ کیا ہوگا؟" وہ کرب ناک لہجے میں بولی اور اُس نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"اوہ شاردا!" میرا سینہ پھٹنے لگا۔ "کچھ نہیں ہوگا، اندھیرا دُور ہوگا، اندھیرا دُور ہوگا۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "دیکھو اب ہمارا مت پڑنا، ہمت رکھنا شاردا! میں تم سے بار بار یہی کہتا ہوں، تم نے تو کتابوں میں ایک دُنیا دیکھی ہے۔ وقت سب پر آتا رہتا ہے، تم اگر اوسان کھو بیٹھیں تو دنیش بھی ہمت ہار بیٹھیں گے۔ وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

وہ میرا ہذیان سنتی رہی اور میرے ہاتھ اسے دلاسا دینے کے لیے کلستے رہے۔ میں نے انھیں جکڑے رکھا۔ نہیں نہیں، میرا منہ ٹیڑھا ہوگیا۔ میں نے اپنی زبان دانتوں سے کاٹ لی۔ میں نے اپنی انگلیاں منہ میں دے لیں۔ میرے دانت انھیں بھنبھوڑنے لگے اور پاؤں فرش پر پٹخنے لگے۔ شاردا نے خوف زدہ انداز میں مجھے دیکھا تو گھبرا کے پیچھے ہٹی اور جھپٹتی ہوئی مجھ سے چمٹ گئی۔ "اوہ نہیں موہن! نہیں۔" وہ میرے ہاتھ اپنے قابو میں کرتی ہوئی بولی۔ "تم تو مجھے حوصلے کی تلقین کررہے تھے، نہیں موہن! میں وعدہ کرتی ہوں، میں چپ رہوں گی، سب کچھ دیکھتی رہوں گی، میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ بات کرو، اپنا حال ٹھیک کرو، دیکھو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ میرا اتنا سخت امتحان نہ لو، میں پاگل ہوجاؤں گی۔" وہ چیختی ہوئی بولی اور اُس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ میرے بازو اینٹھنے لگے اور مجھے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔



دوسرے لمحے میری آنکھ کھلی تو کمرہ روشن تھا۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ نہ وہاں شاردا تھی، نہ دنیش تھا۔ یہ ملاقاتی کمرہ بھی نہیں تھا۔ میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا اور میں نے وحشیانہ انداز سے چاروں طرف نظریں گھما کے دیکھا۔ میں کسی اور کمرے میں تھا۔ اس کی دیواریں پہچاننے میں مجھے بہت دیر لگی۔ گھڑی ٹک ٹک کررہی تھی۔ نو بجے تھے اور کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ دنیش ہی کے محل کا ایک کمرہ تھا۔ مجھے آنکھیں کھولے ہوئے چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ باندی جگنی بھاگتی ہوئی میرے پلنگ تک آئی اور پٹ پٹاتی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔ میں نے اُس کا بازو کھینچ لیا۔ "مجھے یہاں کون لایا تھا؟"

"مجھے پتہ نہیں موہن بابو!" وہ سہم کے بولی۔ "شاید رات ڈاکٹر آیا تھا اور اُس نے آپ کو سوئی لگادی تھی۔ شاردا دیوی اور راج کمار رات کو کئی بار آپ کو دیکھنے کے لیے آئے اور آپ کو سوتا دیکھ کے واپس چلے گئے۔ انھوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ جیسے ہی آپ کی آنکھ کھلے، انھیں فوراً خبر کردی جائے۔ میں ابھی



پر ایک معمر خاتون اپنا بیگ اُٹھانے میں دقت محسوس کررہی تھی۔ معاً ایک دراز قد بوڑھا اُس کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ اُس نے خاتون کا بیگ اٹھا کے فٹ پاتھ پر ایک طرف رکھا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ معاً خاتون کی نظر اُس کے چہرے پر پڑی۔ وہ کسی قدر حیرت سے بولی "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟"

"دراز قد بوڑھے نے وقار سے کہا۔ "جی ہاں، ہوسکتا ہے کہ آپ نے میری تصویر دیکھی ہو۔ میں ناروے کا بادشاہ ہاکن ہوں۔"

ناروے کا بادشاہ ہاکن ایک دراز قد آدمی تھا۔ بادشاہ ہونے کے باوجود اُسے لوگوں کی خدمت کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔

ابھی باہر گئی تھی کہ آپ کی آنکھ کھل گئی۔ ٹھیریے، میں جا کے انھیں خبر کرتی ہوں۔" وہ واپس بھاگنے لگی مگر میری آواز نے اُسے روک لیا۔

ایک سموچی رات گزر گئی اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ آخری لمحے میں میرے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے تھے اور وہی کیفیت طاری تھی جو گھر میں ہوا کرتی تھی۔ وہی دورہ جو بہت ہول ناک خواب دکھاتا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا۔ مجھے کوئی خواب یاد نہیں تھا جو میں نے اس طویل غفلت میں میں نے دیکھا ہو مگر نہ جانے میں نے بے خبری میں کیا کیا بکا ہوگا، میں کس طرح قابو میں آیا ہوں گا، شاردا اور دنیش میرا اکڑا ہوا جسم کس طرح اُٹھا کے اندر لائے ہوں گے۔ ندامت سے مجھے پسینہ آنے لگا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس منہ سے اُن دونوں کے پاس جاؤں۔

مجھے جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دنیش کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ مجھے پلنگ پر بیٹھا دیکھ کے وہ بے تابی سے میرے پاس آیا اور باندی کو باہر جانے کا اشارہ کرکے قریب بیٹھ گیا۔ "خوب سوئے۔" وہ مسکرا کے بولا۔

"دنیش بابو!" میں نے زچ ہو کے کہا۔ "میں بہت ....."

"فضول باتیں مت کرو۔" اُس نے میرے گال کی چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ۔ میں تمھیں چند منٹ کی اجازت دیتا ہوں۔ نہا دھو کے کپڑے بدل کے فوراً واپس آجاؤ۔ میں اتنی دیر میں ناشتہ منگواتا ہوں۔ شاردا رات بھر بے چین رہی ہے۔ صبح میں نے بڑی مشکل سے اُسے سُلایا ہے۔ اُس کے جاگنے سے پہلے تمھیں چاق و چوبند ہوجانا چاہیے۔"

اُس کے لہجے میں ایسا حکم تھا کہ انکار کُجا، جھجک کی مجال بھی نہیں تھی۔ میں پشیمانی سے اُٹھ کے غسل خانے میں داخل ہوگیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہاں میرا لباس موجود تھا۔ رات کو کسی وقت شاردا نے رکھا ہوگا۔ جب میں باہر نکلا تو دنیش چائے تیار کررہا تھا۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میرا خیال ہے میرا حال دیکھ کے تم ٹھیک تھے، تمھارا حال دیکھ کے مجھے تن درست ہونا پڑا۔" وہ اُداسی سے بولا۔ "بیمار ہونے کا بھی یارا نہیں ہے۔ آج ہیما کا تیجا ہے۔ یہاں دن بھر لوگوں کا ہجوم رہے گا۔ شاید تم سے بات کرنے

کا موقع نہ مل سکے۔ لہٰذا غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھے بتانے کی کوئی بات ہو تو فوراً بتاؤ۔ کل تم نے بہت تشویش میں مبتلا کیا۔ تم چلے کہاں گئے تھے؟"

میں اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ سوچنے لگا کہ اُسے کیا بتاؤں۔ کل اُس کے سامنے ہی فون آیا تھا۔ سرلا نے فون پر کسی کا انگریزی لہجہ پہچان لیا تھا اور دنیش نے درمیان میں دخل دے کے اُس کا تجسس پانی کر دیا تھا۔

"میں چھاؤنی گیا تھا۔" میں نے تذبذب سے کہا۔ اُس نے گردن ہلائی، کچھ بولا نہیں۔ میں نے کہا۔ "وہ کرنل کا فون تھا۔"

"کرنل کا!" وہ حیرت سے بولا۔ "اچھا!"

"ہاں!" میں نے آہستگی سے کہا۔ "وہ مجھ سے ریاست کے موجودہ خلفشار پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا تھا، وہاں ریتا بھی تھی اور اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، مجھے دیر تک رُکنا پڑا۔"

"بس اتنی سی بات"؟ وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں بس یہی۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "اِن دنوں کنور جگ دیپ یہاں بہت گردش کر رہا ہے۔ یہ بات مجھے ریتا نے بتائی۔ ادھر ہائی کمان کی طرف سے کرنل پر کچھ زیادہ ہی دباؤ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو وہ ہیما کی وجہ سے بُلا نہیں سکتا تھا، مجھے آپ کا نمایندہ سمجھ کے طلب کر لیا۔ کہتا تھا کہ جلد ہی ایک اور ٹیم اُوپر سے آنے والی ہے اور ریاست میں کسی سیاسی تبدیلی کا امکان رَد نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے، وہ سودے بازی کے موڈ میں تھا۔ کچھ ٹٹولنا چاہتا تھا مگر میں پوری طرح محتاط تھا۔" مجھے احساس تھا کہ میری اکھڑی اکھڑی باتوں میں کوئی وزن نہیں ہے۔ دنیش جیسے ذہین شخص کو یہ اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہیں آئے گی کہ میں اُس سے کچھ چھپا رہا ہوں۔

"پھر تم نے کیا کہا!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"میں نے؟ میں نے کہا کرنل صاحب! تمام فیصلے آپ کے ہاتھ میں ہیں، بہتر یہی ہے کہ اِس موقع پر ریاست میں کوئی سیاسی تبدیلی نہ ہو۔ موجودہ مہاراجا میں ایک باتدبیر حکمراں کی تمام خوبیاں موجود ہیں، اگر آپ واضح طور پر اُن کی طرف اپنا جھکاؤ ظاہر کریں تو ریاست میں یہ رسّا کشی بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں ایک کمزور بات کہہ گیا ہوں، اس کا مطلب کچھ اور نہ لیا جائے حالانکہ کرنل خود بھی بڑی حویلی میں ہونے والی کسی واردات کا پرکاش بھون سے اور پرکاش بھون میں ہونے والی واردات کا بڑی حویلی سے سلسلہ ملاتا ہوگا۔ میں نے کہا، دیکھیے صاحب! صاف صاف بات یہ ہے۔ میری دلی خواہش ہونی چاہیے کہ اگر ریاست میں اقتدار کی کوئی تبدیلی عمل میں آئے تو قرعہ میرے آقا دنیش چندر کے نام نکلنا چاہیے لیکن ہم کوئی ایسی کرسی قبول نہیں کریں گے جو کچی زمین پر رکھی ہو اور اُس پر دھوپ بارش، ژالہ باری اور سنگ ساری سے دفاع کے لیے سایہ موجود نہ ہو۔ بہرحال مجھے کرنل کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ آپ کے اور اُس کے تعلق کی تجدید ہونی چاہیے۔ ہم کرنل کی کلیدی حیثیت نظر انداز نہیں کر سکتے۔ شاید یہ میرا گمان نہیں ہے کہ وہ پرکاش بھون کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ آپ کی شخصیت میں زیادہ کشش محسوس کرتا ہے، البتہ وہ اپنے تین کرنیلوں کی موت پر بہت متوحش تھا۔" دنیش نے سرسری انداز اور سپاٹ چہرے سے میری باتیں سُنیں، میں اُسے اس سے زیادہ اور کیا بتا سکتا تھا۔ جو باتیں میں نے اُس کے گوش گزار کی تھیں، وہ اپنے جزو میں سچائی پر مشتمل تھیں گو اُن میں وہ سنسنی نہیں تھی جس کی وہ توقع کرتا ہوگا حالانکہ چھاؤنی کا ذکر اور کرنل ہارڈنگ کا نام ہی سب سے بڑی سنسنی تھا۔

"کیا تمھاری بات ختم ہو گئی؟" اُس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں!" میں نے اُداسی سے کہا۔ "تقریباً۔"

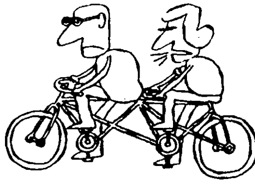
"مجھے معلوم ہے، باقی باتیں بھی اس سے مختلف نہیں ہوں گی۔ جس وقت کل تم واپس آئے تھے۔ میں ایک عجیب کشمکش سے گزر رہا تھا لیکن اب میں بڑی حد تک مطمئن ہوں اور تمھیں اپنا ایک فیصلہ سنانا چاہتا ہوں۔" وہ پُرسکون آواز میں بولا۔ "چھاؤنی کا کرنل کس فکر میں مبتلا ہے اور ریاست کے حالات کن اقدامات کے متقاضی ہیں، اب ان معاملوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ ہم راج پاٹ کے کاموں کے لیے ناموزوں لوگ ہیں۔ مجھے زندگی میں اس سے زیادہ دلچسپیاں نظر آتی ہیں۔ میرے فیصلے کی وجوہ کے بارے میں تم سب کچھ جانتے ہو۔ میں نے طے کیا ہے کہ برطانیہ سے نریش چندر کو واپس بُلا لیا جائے، چاہے اُس کی تعلیم ادھوری رہ جائے۔ ادھوری تعلیم اُن کاموں کے لیے شاید زیادہ سودمند ثابت ہو سکے۔ ہم ایک طویل مدت کے لیے اور ہو سکا تو ہمیشہ کے لیے یہ ریاست چھوڑ دیں گے۔ شاردا اور تم میرے ساتھ چلو گے، سُن رہے ہو؟" اُس نے ٹھہر کے پوچھا۔ "میں کوئی تبصرہ سننا نہیں چاہتا اور میں سمجھتا ہوں، مجھے یہ حق حاصل ہے کہ تمھیں کوئی ایسا حکم دے سکوں۔"

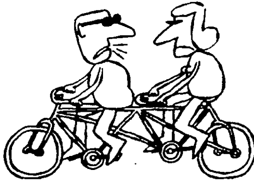
میں نے اپنی زبان نہیں کھولی۔

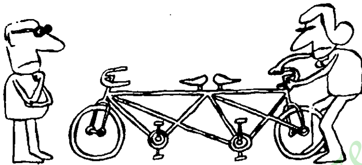
وہ میری خاموشی پر جزبز ہوا اور اُس نے مجھے چائے کی ایک اور پیالی بنا کے دی۔ میں نے اسے فوراً میز پر رکھ دیا کیونکہ ہاتھوں کی لرزش بھی ایک قسم کا تبصرہ تھا۔ کل جب تم یہاں سے گئے تھے تو کچھ دیر بعد وہ تینوں سراغ رساں بھون میں آئے تھے جو بڑی حویلی کی واردات کی تفتیش کر رہے ہیں، بظاہر وہ ہیما کا پُرسا دینے آئے تھے لیکن اُن کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ انھوں نے بڑے لطیف طور پر تمھارا ذکر چھیڑ دیا اور تمھارے بارے میں ناقابلِ برداشت سوالات کرنے لگے۔ تفتیش کی ابتدا ہی میں اگر تفتیش کرنے والوں کی توجہ کسی خاص سمت مبذول کر دی جائے تو وہ اُسی کو اپنی فکر کا محور بنا لیتے ہیں۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے اور اُن کی بے چینی صاف ظاہر کرتی تھی کہ پھر ایک اذیت ناک صورتِ حال پیش آ سکتی ہے۔ اس بات کی تصدیق پولیس

فسر کھنّا کی اچانک آمد سے بھی ہوتی ہے' وہ ان افسروں کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد مجھ سے اپنے خصوصی تعلق کے حوالے سے متنبہ کرنے آیا تھا کہ موہن! اس کے خلاف از سرِ نو ایک فائل تیار ہو رہی ہے' پرسوں ہیما مر گئی' کل کوئی اور مر سکتا ہے۔ ارتھیاں' گولیاں' زہر' آہ و زاریاں' پولیس گوریے' خون' دھمکیاں' بے یقینی' بے ضمیری کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ ہم اُن سے نمٹنے کی بے شک زیادہ موثر تدبیریں کر سکتے ہیں۔ گولی کے بدلے گولی' خون کے بدلے خون' ہم نے یہی کیا اور آئندہ بھی یہ سلسلہ تمام تر شدت سے جاری رکھا جا سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیوں؟ پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہیے کہ ہم کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں جب تک ہم اپنے آپ کو متعین نہیں کریں گے' بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں گی' ہم کیا چاہتے ہیں موہن! میں تم سے پوچھتا ہوں' تم کیا چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ایک زندگی ہو جس کے آنگن میں پھول کھلتے ہوں۔ تمہاری آنکھوں کے پھول۔ جہاں ایک حسین لڑکی مہکتی ہو اور یہ زندگی خود کیا ہے' سوچو گے تو بہت سے ہیولوں کا بھرم کھل جائے گا۔ آدمی ہر جگہ اپنا یقین چاہتا ہے۔ جہاں فائلیں کھلتی ہوں اور آگے ہر قدم پر ایک گڑھے کا امکان ہو اور جہاں لوگ پاگل ہو گئے ہوں' یہ فانوس' یہ قالین' یہ عمارتیں' یہ کرسیاں' یہ باندیاں' یہ غلام' بہت خوب صورت چیزیں ہیں بشرطیکہ آدمی کو یقین حاصل ہو۔ چھتیں گرنے کا اندیشہ نہ ہو۔ باندیاں جام میں زہر ملا کے نہ دیں۔ تنک کے سائے نہ ڈراتے ہوں' رشتے محترم ہوں' جس جگہ بیٹھو اُس جگہ کا اعتبار ہونا چاہیے کہ مٹی مضبوط ہے' تمہارا وزن سہار جائے گی جس کرسی پر براجمان ہو' اُس کے نیچے کوئی چھپا نہ بیٹھا ہو۔ زندگی ایک اعتبار ہے میری جان! مجھ پر تمہارا' تم پر میرا اعتبار۔ میں اس نتیجے پر بہت سوچ سمجھ کے پہنچا ہوں کہ تمہاری اور تشاردا کی رفاقت میں زندگی اس جیون سے زیادہ خوب صورت ہو گی کیونکہ تم میرا اعتبار ہو۔ تشاردا بھی اعتبار ہے۔ پتہ چلا کہ ایک آدمی کو کمانا مشکل ہوتا ہے۔ اس سرمائے کی حفاظت کرنی چاہیے۔ صبح سے میں خود کو بے وزن محسوس کر رہا ہوں' یہ کیفیت آدمی پر اُس وقت طاری ہوتی ہے جب وہ رسائی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ اُس کے لہجے میں عزم نمایاں تھا' وہ ایک بدلی ہوئی آواز تھی۔ میرا سر اپنے سینے پر جھک گیا۔ "ہم اس جہنم میں نریش کی واپسی تک ہیں گے۔" میرے کانوں میں اُس کی تمتماتی ہوئی آواز اُبھری "وہ ایک سلجھا ہوا نوجوان ہے' اسی ماحول کا پروردہ ہے' یہاں کے گئے ہوئے دو ایک ہی سال ہوئے ہوں گے' بات کم کرتا ہے' سوچتا زیادہ ہے' شاہانہ خو ہے' عمر کم ہے لیکن جلد ہی بدلتے ہوئے حالات میں خود کو ایڈجسٹ کر لے گا۔ ہماری بات خراب ہو گئی ہے۔ اب ہمارا یہاں گزر نہیں ہے۔ کنور جگ دیپ کی کوئی گولی اگر کارگر ہو جاتی تب بھی نریش چندر کو یہاں آنا پڑتا۔"

وہ چپ ہو گیا' میں نے اپنا سر نہیں اُٹھایا۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس کے اُٹھنے کی آواز آئی اور اُس کا ہاتھ میری ٹھوڑی تک دراز ہوا۔ اُس نے میرا بھیگا ہوا چہرہ اُٹھایا۔ "ارے"۔ وہ گھبرا کے بولا "یہ کیا؟"







اُس نے مجھے کھینچ کے گلے سے لپٹا لیا۔ "اس میں شکست کا کوئی پہلو نہیں ہے' میں تو تم سے بہت پہلے سے کہتا تھا۔ مہیش چندر کے مرنے کے بعد مجبوراً یہاں ٹھہرنا پڑا اور نہ مجھے اس کی کوئی طلب نہیں تھی۔" اُس کا گلا رُندھنے لگا۔ "ہاں ایک طلب تھی۔ وہ پوری نہ ہو سکی' بہرحال۔ یہ بھی کچھ ٹھیک ہی ہوا۔ وہ ایک راج کماری تھی' اُس کے ساتھ مجھے بھی ایک راج کمارین کے رہنا پڑتا۔ کوئی بات نہیں' میں نے اس عرصے میں کچھ کھویا نہیں' پایا ہے۔ تمہیں اور تشاردا کو پایا ہے۔ اب چلو' ٹھیک طرح کھڑے ہو۔ اور سنو' اب کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ یہ وقت جیسے تیسے کٹ جائے۔ میں نریش کو آج ہی تار دے دوں گا۔"

اُس نے میری کمر تھپتھپائی اور کمرے سے چلا گیا۔



وہ بین بجا کے چلے گئے' میری رگوں میں سانپ سرسرانے لگے۔ میں نے زور سے مسہری کا تکیہ پکڑ لیا۔ آدمی کا دماغ جنگ کا میدان نہیں ہے۔ راج کمار ذمیش چندر' میرے آقا حکم دے کے چلے گئے اور بھول گئے کہ ہر آدمی کی ایک سرحد ہوتی ہے۔ وہ اتنا ہی دوڑ سکتا ہے' جہاں تک اُس کی سرحد ہو' وہ اپنی زمین کتنی بڑھائے گا۔ ساری دُنیا پر چھا جائے گا مگر دُنیا سے آگے کہاں جائے گا۔ حکم دیتے وقت انھیں یہ خیال نہیں رہا کہ آدمی تو اپنی سرحدوں میں رہتا ہے' ہر ایک کا ایک جزیرہ ہے' آنکھ بس ایک دیوار تک دیکھ سکتی ہے اور دیوار دُور ہو تو وہ بھی نظر نہیں آتی۔ سماعت کی سمائی بھی محدود ہے۔ آواز ذرا اُونچی ہو تو کان

چھٹ جاتے ہیں اور یہ آدمی کا خیال' اس کی پرواز بھی کوتاہ ہے کہ جب تک وہ خیال ہے' آزاد ہے جب اسے گرفتار کیا جاتا ہے' پابند ہوجاتا ہے خیال لامحدود' اُس کی تشکیل محدود' خواب لامحدود' اُس کی تعبیر محدود ہے۔ میرے مالک نے جوشِ عطا اور شوقِ نگاہ میں اِن باتوں کا خیال نہیں رکھا' مجھے ہنسی آگئی اور میری آنکھیں سوج گئیں۔

ایک دن اور گزر گیا تھا۔

ایک دن کی کوئی بات نہیں تھی۔ کرنل نے جب اپنی بیٹی کو بتایا ہوگا کہ اُس نے کیا فرمان جاری کیا ہے تو ریتا کے عارض گل گوں ہوگئے ہوں گے اور اُس نے اپنے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دی ہوں گی' باپ کے خون کی گردش تیز ہوگئی ہوگی لیکن وہ ریاست میں میرے قیام کے لیے مزید چند دنوں کی توسیع کرسکتا تھا۔ ریاست کا نقشہ اُس کی آنکھوں میں ہر وقت موجود رہتا تھا، کرنل کو اپنی بیٹی کی تبدیلی پہ ایک ذرا سکون محسوس ہوا ہوگا مگر دوسری جانب وہ میری' ناخیر سے پریشان بھی ہوگا کیونکہ اُس کی بیٹی کی سُرخی قائم رکھنے کے لیے میرا صحیح و سالم واپس آنا ضروری تھا۔ مجھے پہنچنے میں جتنی دیر ہوگی کرنل کی فکریں اُتنی ہی بڑھتی جائیں گی۔ کرنل ایک ایک لمحہ گن رہا ہوگا کیونکہ مجھ پہ چلنے والی کوئی بھی گولی ریتا کے سینے میں اثر کرے گی۔ کسی کا نشانہ بار آور ثابت ہوگیا تو وہ ریتا کو کیا جواب دے گا کہے گا کہ اُس نے بیٹی سے مذاق کیا تھا۔

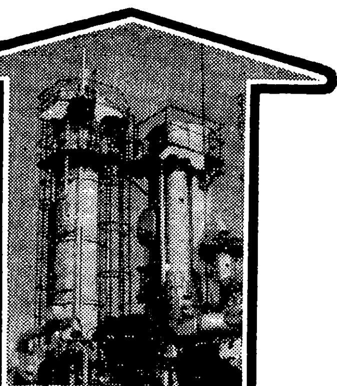
بڑی حویلی کی واردات کی تفتیش کرنے والے افسروں کی سرگرمیوں سے کرنل کو لمحہ بہ لمحہ آگاہ کیا جا رہا ہوگا۔ اُس کے پیشِ نظر اوپر والی کمان سے آنے والے افسروں کی آمد پہ پیچیدگی پیدا ہونے سے پہلے مجھے ریاست سے نکل جانا چاہیے اب اِدھر دنیش چندر بھی حکم دے کے گئے تھے۔ اُن کے ساتھ اور شاردا کے ساتھ اِن ہنگاموں سے دُور ایک زندگی کا تصور میرے خوابوں اور خیالوں سے ماورا تھا۔ وہ ایک طلسم تھا۔ راج کمار دنیش چندر نے کوئی نیا فیصلہ نہیں سُنایا تھا۔ وہ یہ ذکر اس سے پہلے بھی کئی بار کرچکے تھے۔ البتہ آپ کے تیور نئے تھے۔ دنیش کے ساتھ چپکے سے باہر نکل جاؤں' اُسی طرح' جو طریقہ کرنل نے سوچا تھا' کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی۔ اتنی دُور جانے کے بعد خود بہ خود قرار آجائے گا کہ قرارِ جاں شاردا ساتھ ہوگی۔ مہارانی شاردا' شیلے کی محبوبہ' یونان کی سیفو' مصر کی قلوپطرہ، مائکل انجلو کا شاہکار شاردا' جب کوئی آدمی ایک پڑھے لکھے آدمی سے ملتا ہے تو وہ ایک آدمی سے نہیں ملتا' وہ بہت سے آدمیوں سے ملتا ہے۔ وہ سقراط سے ملتا ہے' بقراط سے ملتا ہے' مارکس سے ملتا ہے' اشپنگلر سے ملتا ہے' گوئٹے سے ملتا ہے' نطشے سے ملتا ہے۔ یہ سب میرے پڑوسی ہوں گے اور ان سب سے بڑا میں ہوں گا کیونکہ کوئی اور شاردا سے اس قدر قریب نہیں ہوگا اور میں ایک طرح کا راج کمار ہوں گا' ایک راج کمار کا دوست' ایک راج کماری کا ساتھی' جب ہم دونوں شطرنج کھیلیں گے تو شاردا

عجب مخمصے میں ہوگی' کبھی دنیش کا ساتھ دے گی' کبھی مجھے چال بتائے گی' دنیش چھیڑے گا کہ وہ میرا ساتھ دے رہی ہے' میں کہوں گا کہ وہ بھائی کا پاٹ لے رہی ہے' پھر وہ ہاتھ جوڑ کے وعدہ کرے گی' بس بابا' اب میں بالکل چُپ رہوں گی۔

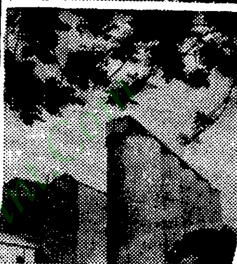
اور کرنل سوچتا رہ جائے گا مگر ریتا! معاملہ صرف کرنل کا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ ریتا تو یکسر خفا ہوجائے گی۔ کرنل اُسے سنبھال نہیں سکے گا اور یہاں دنیش چندر اپنے بھائی نریش چندر کو بُلا لیں گے اور بھون کا کاروبار اُس کے سُپرد کرکے بری الذمہ ہوجائیں گے لیکن نریش چندر۔ اگر یہ گتھیاں نہ سلجھا پایا تو بھون کے مکینوں اور بھون سے وابستہ سینکڑوں ملازموں اور باندیوں کا کیا ہوگا۔ نریش چندر اپنے بھائی دنیش چندر کی اگائی ہوئی تلخیاں کہاں تک اور کب تک کاٹتا رہے گا۔ دماغ میں چھالے پڑجائیں گے۔ کرنل اس طرف برہم ہوگا' مہاراجا' شاردا کے گم ہونے کے بعد اپنے دل میں ایک پھانس چبھو لیں گے۔ جگ دیپ کے شیشے میں سدا کا بال ہے۔ ان حالات میں جواں سال نریش کتنے دنوں تک زندہ رہ سکے گا اور کتنے دنوں تک اُسے زندہ رہنے دیا جائے گا۔ کنور جگ دیپ کو دنیش سے نہیں' بھون کے ہر اُس شخص سے نفرت ہے جو ریاست کی کرسی کے ورثے کا دعوے دار ہے۔ بھون میں افراتفری مچ جائے گی' دنیش چندر دنیا کی سیر میں گم ہوں گے اور یہاں سارا باغ اُجڑ رہا ہوگا جس کا جدھر منہ اُٹھے گا چلا جائے گا۔ نریش چندر یہ کثافت سونگھ کے اگر مصلحت اور مفاہمت سے کام بھی لیں اور اپنے بھائی کی ناکردہ لغزشوں کی معافیاں بھی مانگیں تو بھی بھون کے آمال کا سورج گرہن میں رہے گا۔ نریش چندر کو سنبھلتے سنبھلتے سمجھتے سمجھتے دیر لگ سکتی ہے۔ اُس وقت تک کنور جگ دیپ اپنے بیج نم مٹی میں ڈال چکے ہوں گے' موسم بھی مناسب ہوگا اور ہر طرف انھی کے پودے لہلہا رہے ہوں گے۔ ممکن ہے' نریش چندر اپنے آں جہانی بھائی مہیش چندر اور خود پرکاش چندر آں جہانی کے بغیر یہ نام نامکمل سا لگتا ہے' جیسی صلاحیتوں کا حامل ہو اور آتے ہی وہ تدابیر لڑائے کہ سب انگشت بدنداں رہ جائیں لیکن اس حادثے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں' یہ مہیش چندر کا زمانہ نہیں ہے۔ اُس زمانے میں یہاں ایک شخص موہن داس وارد ہوگیا تھا جس نے کنور جگ دیپ کا گھوڑا الٹ دیا تھا اور زہر کا پیالہ لوٹ دیا تھا اور نشانے لوٹا دیے تھے۔ اس بار ہولی کے دن بھون کے بُرج پر مضبوط قدموں سے نریش کا کھڑا ہونا ایک کرشمہ ہوگا۔ اتنے بہت سے لوگوں کو ایک اندھے کرشمے پر چھوڑ کے دنیا کی سیر کرنا ایک جرأت ہے۔

اور دنیش چندر نے یہ جرأت کیوں کی۔ دنیش کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ میں نے اُسے یہ نہیں بتایا تھا اور نہ یہ بتانے والی بات تھی کہ بڑی حویلی کی حالیہ واردات کس ستم گر کی رگوں میں دوڑنے والے آتشیں خون کا شاخسانہ ہے۔ دنیش کو یقین نہ آتا' کسی کو بھی یقین نہ آتا' تو خیر سندھیا جانتی تھی کہ وہ ہر شبہے سے بالاتر ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے ماہرین

آپ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کیلئے بی-آئی-ایم کی کوشش پیہم











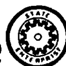


آپ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کیلئے بی-آئی-ایم اپنے دائرہ کار کی توسیع میں مسلسل مصروف ہے۔ ۱۹۷۲-۷۳ء کے مقابلے میں بی-آئی-ایم کے کارخانوں نے ۱۹۷۴-۷۵ء کے دوران اپنی پیداوار میں ۴۶.۲ فیصد کا اضافہ کیا ہے۔ بی-آئی-ایم اس عالمی کساد بازاری کا بھی مقابلہ کر رہا ہے جس کے سامنے بڑے بڑے صنعتی ملک بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔

بی-آئی-ایم اپنے اس مقصد کے حصول میں بھی انتہائی تندہی سے مصروف ہے۔ جن کا مقصد ۱۹۸۰ء تک تیل کی صاف سازی، سیمنٹ، کیمیاوی کھاد موٹرسازی، بھاری اور ہلکی انجینئرنگ اور کیمیاوی اشیاء کے بنیادی اور اہم کارخانوں کی منصوبوں کے مطابق تکمیل ہے۔ تاکہ پاکستان دنیا کا ایک نیا صنعتی ملک بنکر ابھرے۔ ۱۹۷۸ء ہی میں کراچی اسٹیل مل کی پہلی بلاسٹ فرنس بھی کام کرنا شروع کر دے گی۔

پاکستان کے عوام کی آئندہ خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے بی-آئی-ایم نے جن منصوبوں پر کام شروع کردیا ہے وہ ۱۹۸۰-۸۵ء تک مکمل ہوں گے اور ان پر ۲۸۰۰ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی۔

فیڈرل کیمیکل اینڈ سرامکس کارپوریشن
فیڈرل لائٹ انجینئرنگ کارپوریشن
نیشنل ڈیزائن اینڈ انڈسٹریل سروسز کارپوریشن
نیشنل فرٹیلائزرز کارپوریشن
پاکستان آٹوموبائل کارپوریشن
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
پاکستان اسٹیل ملز کارپوریشن
اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن
اسٹیٹ ہیوی انجینئرنگ اینڈ مشین ٹول کارپوریشن
اسٹیٹ پٹرولیم ریفائننگ اینڈ پٹرو کیمیکلز کارپوریشن۔



بورڈ آف انڈسٹریل مینجمنٹ

چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہا دیتے تب بھی اُن کا ذہن رسا سندھیا کی جانب رسا نہیں ہو سکتا تھا۔ سندھیا نے واردات کے وقت احتیاطاً دستانے پہن لیے تھے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کا چہرہ اُس کا سراپا ہی ایک دستانہ تھا۔ سندھیا نے ہر وہ آنکھ بجھا دی تھی جس نے اُس کے ہاتھ میں پستول اور آنکھوں میں شعلے دیکھے تھے۔ میری گڑیا سندھیا نے اپنی نازک انگلیوں اور اپنے اَدھ پکے دماغ سے یہ کام کیا تھا۔ شروع شروع میں مجھے بھی بہت سے اندیشے لاحق ہوئے تھے کہ کسی نے کہیں اُسے دیکھ نہ لیا ہو، اُس نے کہیں کوئی نشان نہ چھوڑ دیا ہو۔ اب بھی یہی خدشہ تھا کہ سندھیا اِدھر اُدھر ہونے والی سرگوشیوں سے ڈگمگا نہ جائے اور مبادا خود اپنے دل میں اُمڈتا ہوا طوفان نہ چھپا سکے۔ وہ راتوں میں سوتے ہوئے کہیں بہکنے نہ لگے، اُسے بھوت نہ ڈرائیں۔ دنیش چندر کو کیا معلوم تھا کہ وہ سندھیا تھی اور وہ سندھیا نہیں تھی، وہ تو میں تھا۔ سندھیا تو میرا پرتو تھی۔ اُس کا سبب میں تھا لیکن وہاں میں نہیں تھا۔ تفتیش کرنے والے اپنے پیشے سے وفا کرتے تو میرے وجود پر سُرخ نشان لگاتے۔ دنیش چند اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اُس رات میں بھون میں تھا۔ اینا بھی اس کی گواہ تھی، پارو بھی گواہ تھی مگر دنیش کو تفتیش کرنے والوں کی اُس حِس کا خطرہ تھا جو ابہام میں پھلتی پھولتی ہے اور ریاستوں میں بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ سندھیا کا نام نہیں لیا جا سکتا تھا۔

پھر وہ کون تھا جو بڑی حویلی کی اُونچی چار دیواری پھلانگ کے اندر جا گھسا اور ٹھن ٹھن کر کے دندناتا ہوا، محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوا باہر آ گیا؟ اصولاً راجے پور کے اُمرا، مہاراجا اور کرنل کی نگاہیں پرکاش بھون کی جانب اُٹھنی چاہیے تھیں، جو اُٹھیں۔ دنیش کا خوف بجا تھا کہ میرا اور اُس کا تعلق اور پرکاش بھون میں میری بتدریج اُبھرتی ہوئی حیثیت، میرا قد، میرا چہرہ، میری باتیں اب ریاست کے گلی کوچوں میں عام ہو گئی تھیں۔ مہاراجا کی دعوت میں مَیں اپنے نشانے کی سچائی ثابت کر چکا تھا۔ دنیش کی طرح کرنل بھی اسی خوف میں لپٹا ہوا تھا۔

دنیش کو بہت سے واقعات معلوم تھے مگر جو معلوم نہیں تھے، وہ اُس کے دماغ کو بار بار تنگ کرتے ہوں گے۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ بڑی حویلی میں اس سے پہلے ہونے والی واردات کے عقب میں بھی اُس کا غلام موہن داس موجود تھا گو وہ پولیس افسر ٹیلر کی کارستانی تھی۔ میں ہوتا تو شاید دنیش کے چھوٹے بھائی سُریش چندر کو نشانہ بناتے ہوئے لڑکھڑانے لگتا لیکن ٹیلر کیا تھا، ٹیلر بھی تو میرا ہی پرتو تھا، اُس کے بھائی مہیش چندر کی موت کا راز دار بھی میں تھا، اُس کے باپ پرکاش چندر کو مارنے کے لیے بھی مجھے تعینات کیا گیا تھا۔ مینا رانی اور کنور پردیپ کی زندگیوں کے چراغ بھی میں نے ہی بجھائے تھے۔ اُس کی بہن آشا دیوی کو اُس کی بھانجی سندھیا نے دُنیا سے اُٹھایا تھا مگر سندھیا کس کوشش میں اپنی موسی سے برانگیختہ ہوئی تھی؟ لاکھی پور کے چند بدمعاش اور دو انگریز پارو نے مٹی میں ملا دیے تھے مگر پارو، اُس چمکتی ہوئی بادہ خوار اور پُرشکوہ لڑکی کے ارادے کی پشت پر کون سا محرک تھا۔ دنیش چندر کو صرف چند کہانیاں یاد تھیں۔ اس سے زیادہ اُس کی سماعت متحمل بھی نہ ہوتی۔ دنیش کا ذہن ان تیز ہواؤں میں پرے ڈھونڈتا رہتا ہوگا۔ جگ دیپ کو آگہی کی یہ آسودگی حاصل تھی کہ وہ ایک شخص ہے فلاں قد و قامت کا ہے، نام یہ بتاتا ہے، پیشہ غلامی ہے، پرکاش بھون میں رہتا ہے۔ یہ سب اُسی کا جلوہ ہے مگر دنیش چندر کے سامنے جگ دیپ کی طرح کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس کا حلیہ اور نام پتہ اُسے معلوم ہو۔

آج ہیما کا نیجا تھا اور ہیما کا دل کش بدن کسی بد نگاہ نے اپنی نگاہ سے داغ دار نہیں کیا تھا۔ پارو جانتی تھی کہ ہیما نے ساری دُنیا سے روٹھنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ وہ کون شخص تھا جس نے اُسے اس فیصلے پر مجبور کر دیا۔ جیکسن، بارٹ، تینوں کرنیل، سنتری، بدمعاش، دنیش چندر کا علم بہت محدود تھا۔ میرے مضمون کے بارے میں ہر ایک کا علم محدود تھا۔ ڈالی، شاردا، پارو، سندھیا، رینا، کنول ترنم، راج کماری کنول، سب کا علم محدود، ناپختہ اور ادھورا تھا۔ آدمی کا عرفان نہ ہو سکا۔ کنور جگ دیپ دُور بیٹھ کے سب کچھ سمجھ گیا تھا بلکہ کچھ زیادہ سمجھ گیا تھا۔

اور میں اپنے دنیش چندر سے یہ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ سرکار! آپ ذرا میری بات سنیے، ذرا ٹھیریے، سانس لیجیے۔ یہ جاگیر آپ کی، یہ ریاست آپ کی ہے۔ آپ چلے جائیں گے تو میں تھوڑی یہاں رہ جاؤں گا۔ مجھے بھی تو آپ اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ تو پھر مجھے خود ہی جانے دیجیے۔ میں چلا جاؤں گا تو ہر بات درست ہو جائے گی۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا تو میری یہ پیشانی بھی ساتھ جائے گی۔ میرے یہ ہاتھ بھی ساتھ جائیں گے جن پہ آڑی ترچھی لکیریں کشیدہ ہیں۔ میں نے بانو کو دربدر کر دیا۔ آپ یہیں قیام کیجیے۔ کرنل نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری عدم موجودگی میں آپ کا خیال رکھے گا۔ اِدھر مہاراجا شاردا کے طلب گار ہیں اور ریاست میں دوسرا کوئی نہیں ہے جو راج کماری کنول کے ترازو پہ آپ سے زیادہ پورا اُترے۔ دیر میں سہی، حجت کے بعد سہی مگر یہ چپ آپ ہی کے نام کی نکلے گی۔ جب راج محل اور بھون کے تعلقات استوار ہو جائیں گے اور کرنل کا سایۂ التفات ساتھ ہوگا تو کنور جگ دیپ کو اپنے پتھر راستے سے سمیٹنے پڑ رہے گے۔ شاردا کو ہموار کرنے میں البتہ وقت لگے گا مگر وہ ایثار پیشہ لڑکی ہے اور ایسے لفظ ایجاد ہو گئے ہیں جو اس موقع پر مناسب انداز سے استعمال کیے جائیں تو تیر بہ ہدف ثابت ہو سکتے ہیں۔ بھون کے اتنے بڑے وقار کے لیے اور اپنے بھائی اور اپنے لوگوں کے لیے آلِ کار وہ ہیر ڈال دے گی۔ خود کو حوالے نہیں کرے گی تو اپنا بدن حوالے کر دے گی۔ مہاراجا کو تسلی دے دیجیے کہ فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوگا۔ جب میں سامنے نہیں رہوں گا اور میرا کوئی اتا پتہ نہیں ہوگا تو اتنی مشکل شاید پیش نہیں آئے گی۔ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے بشرطیکہ کرنل کے قول کے مطابق برداشت، احتیاط اور حُسنِ تدبیر سے کام لیا جائے۔ آپ کا یہاں رہنا اور میرا جانا ضروری ہے۔ مجھے آپ کی یاد بہت آئے گی۔ جب میں یہ سوچتا ہوں تو ایک ہلچل مچ جاتی ہے، آپ بھی مجھے بہت یاد کریں گے مگر یہ

آدمی ایک دوسرے سے جُدا ہونے کے لیے ہے، کوئی آگے، کوئی پیچھے میں ذرا تیز آگے نکل گیا۔ وفا کا ہر معاہدہ اجل گرفتہ ہوتا ہے، یہ سمجھ لیجیے گا کہ وہ پہلے چلا گیا میرے آقا! جُدائی کا وقت آرہا ہے میری بہت سی دعائیں میرے بہت سے سلام۔ آپ کو میرا اصل نام نہیں معلوم، ایک یہ بھی کھٹکا رہا مگر مجھے یقین ہے کہ میرا نام کوئی بھی ہوتا، آپ کا ماتھا میرے لیے شکنوں سے مبرا ہوتا کیونکہ آپ بہت سرتاج آدمی ہیں۔

میں نے خود کو مسہری سے اُٹھایا، قدم فرش پر رکھے، بہت بھاری تھے لیکن میں انھیں گھسیٹتا ہوا ملاقاتی کمرے میں آگیا۔ وہاں سوگواروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ میری ایک اُچٹتی ہوئی نظر اِس طرف سے اُس طرف تک گزر گئی۔ کیبدے چہرے، خمیدہ نگاہیں، پارو بے ساختہ اُٹھ کے کھڑی ہوگئی۔ وہ دوڑ کے میرے پاس آنا چاہتی تھی مگر اُس کے پیر وہیں تلملا کے رہ گئے۔ پیر بھی اُسی طرح محسوس کرتے ہیں، جس طرح سر محسوس کرتا ہے۔ سُنا ہے پہلے پیروں کی جان نکلتی ہے۔ گویا پیر سر سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ پارو نیم جاں انداز میں اپنی نشست پر بیٹھ گئی تو اُس کی اوٹ سے پریت کا چہرہ نمودار ہوا۔ پریت کی بھی کچھ کم اہمیت نہیں تھی۔ مجھ میں اور اُس میں بہت سی قدریں مشترک تھیں، مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھیں بدبدائیں شاید اُس نے ایک گہری سانس لی ہوگی، میں نے سوچا، اُس کے کان میں جاکے کہوں تمھیں مجھ سے بہت سی شکایتیں تھیں، بس لو میں جارہا ہوں۔ ایک بار مسکرا کے دیکھ لو اور ہوسکے تو اب اپنے سوتیلے بھائی کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ جگ دیپ کا تیور تم نے دیکھ لیا، اُدھر اُس نے تم سے کیا کچھ نہ کہا ہوگا، اِدھر ہیما سے اس قدر کہا کہ ہیما کا جام چھلک گیا۔ اور بھی نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے، کُسُم ہوگی، ششی بھی ہوسکتی ہے، پہلے پارو بھی تھی۔ کنور جگ دیپ نے سب سے کچھ نہ کچھ کہا ہوگا۔ اُس نے ڈالی کو بھی اپنی ہوس کی کمان پر چڑھایا تھا۔ میں نے پریت کو اشارہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اب حفظِ مراتب کی کوئی جھجک بیکار تھی لیکن میں اُسے کوئی اشارہ نہیں کرسکا اور راہ داری میں چلا آیا۔

اندر خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور لُو چل رہی تھی، مجھے ایسا لگا جیسے یہ جسم کھنڈر بن گیا ہے۔ میں نے خود کو ڈالی کے کوارٹر پر موجود پایا، اندر وہ موجود تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور مجھے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے جھپٹ کے اُسے زور سے بھینچ لیا اور جیسے ہی اُس کے بدن کا لمس میرے جسم میں پیوست ہوا میری ہچکیاں بندھ گئیں پھر ڈالی نے اپنے بازوؤں کا شکنجہ میری کمر پر سخت کرلیا۔ میرے جسم میں کچھ اور نہیں تھا، آنسو ہی آنسو بھرے تھے۔ ڈالی کا شکنجہ جتنا تنگ ہوتا گیا، آنسو اتنے ہی نچڑتے گئے مگر ڈالی جلد ہی نڈھال ہوگئی اور آنسو پھر بھی باقی رہ گئے۔ اُس نے مجھے اندر کمرے میں لاکے بستر پہ دھکیل دیا اور میرے سینے پہ چھا گئی۔ "شیرو جانی! میں ابھی

مکئی کے دانے

ایک شخص تنخواہ کے دن دفتر نہیں جاسکا۔ صبح اُس نے اپنے ایک دفتری ساتھی سے کہہ دیا تھا کہ میری تنخواہ تم لیتے آنا۔ اُس کے ساتھی نے پختہ وعدہ کرلیا تھا مگر جب وہ شام کو لوٹا تو خالی ہاتھ تھا اور اُس کے چہرے پر تردد کے آثار تھے۔ وہ آتے ہی کہنے لگا۔ "دوست! مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس اور دکھ ہے کہ میں تمھاری ساری تنخواہ گنوا بیٹھا۔"

"گنوا بیٹھے؟ وہ کیسے؟"

دوست نے جواب دیا۔ "وہ تو اچھا ہوا کہ میں کلب سے جلدی اُٹھ گیا ورنہ اپنی تنخواہ بھی ہار جاتا۔"



ایک مشہور پہلوان کسی سنسان راستے سے گزر رہا تھا۔ اچانک کوئی ٹھگ کہیں سے نمودار ہوا اور اُس نے پہلوان کو لوٹ لیا۔ چند روز بعد پہلوان نے اپنے ایک دوست کو یہ واقعہ بتایا۔ اُس کے دوست نے حیرانی سے پوچھا۔ "پہلوان جی! تم تو اتنے طاقت ور ہو، بھلا تم نے ٹھگ کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا ہے؟"

"نہیں" پہلوان نے سادگی سے کہا۔ "میں پانچ ہزار سے کم میں کسی کے ساتھ مقابلہ نہیں کرتا۔"

رمیش چند اور عتیق احمد کی جانب سے

زندہ ہوں میں تیرے تمام آنسو پی جاؤں گی، وہ دھاڑیں مارتے ہوئے بولی۔ پگلی! خود رو رہی تھی اور کہہ کیا رہی تھی۔ پہلے اپنی آنکھیں تو تھام۔ میں نے پوچھا "گڈا کہاں ہے؟" اُس نے سوتے ہوئے گڈے کو میری گود میں ڈال دیا۔ میں نے اُس کے گالوں کو اتنا پیار کیا کہ وہ جاگ گیا اور منمنانے لگا، پھر اُس نے میری صورت دیکھی تو بہت حیران ہوا۔ میں نے کہا "ہاں گڈے! یہ میں ہوں، مجھے اتنی اجنبی نظروں سے کیوں دیکھ رہا ہے؟" شاید وہ میری بات سمجھ گیا اسی لیے میری گردن سے چمٹ گیا۔ میں نے کہا۔ "گڈے! تو بہت بڑا آدمی بنے گا، بنے گا یا نہیں۔ جواب دے؟ اپنی ماں کو سہارا دینا۔ جلدی بڑا ہوجا اور سن۔" میں نے اُس کا چہرہ اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "اِس کا دل مت دُکھانا اور اسے کام مت کرنے دینا۔ سمجھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟" گڈے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اُلٹا مجھے مارنے لگا۔

"یہ تو گیا، کیا کہہ رہا ہے رے!" ڈالی نے بھر کے پوچھا۔

"چپ رہ، مجھے گڈے سے باتیں کرنے دے۔" میں نے اُسے جھڑک دیا اور گڈے کو مخاطب کیا۔ "گڈے! ذرا غور سے سُن، تیری ماں کی تو مت ماری گئی ہے۔ میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے، میں کسی بھی وقت یہاں سے فرار ہوسکتا ہوں تو اپنی ماں کے ساتھ کلکتے شہر چلا جانا، وہاں ہاوڑا اسٹیشن کے اِدھر اُدھر ایک بہت اچھا آدمی جابج رہتا ہے۔ وہ اسٹیشن کے باہر تھرڈ کلاس کے کسی شیڈ میں بینچ پر لیٹا ہوگا یا چائے کی دُکان پر اوٹ پٹانگ باتیں کررہا ہوگا۔ اُس کا کوٹ میلا اور پھٹا ہوا ہوگا، بال اُلجھے ہوئے ہوں گے۔ شاید داڑھی بھی بڑھی ہوئی ہو، حلیے کا کچا، دل کا پکا آدمی ہے، تو اُس سے کہنا

تو میرے اُس دوست کا بیٹا ہے جو کلکتے میں کبھی تیرے ساتھ تھا۔ وہ فوراً پہچان لے گا اُس پہ بھروسا کرنا اور اسے ساتھ ہی رکھنا میں وہیں آجاؤں گا۔ وہ مجھے جام تیسڈ کہتا تھا اگر وہ تجھے نہ ملے تو وہاں ایک بینک ہے الٰہ آباد بینک اُس میں ایک بڑا افسر ہے عابد شیرازی اُس سے کہنا کہ پرکاش بھون کے موہن داس نے آپ کے پاس بھیجا ہے میری ماں گھر کا کام کرے گی اور آپ پر بوجھ نہیں بنے گی۔ وہ بھی بہت اچھا آدمی ہے۔ اُس کی بیوی ساجدہ کا ہاتھ بٹانا اور اُس کے کسی معاملے میں دخل مت دینا۔ دوسروں کے معاملے میں جتنا کم دخل دو بہتر ہوتا ہے۔ عابد شیرازی تجھے پڑھائے گا بھی۔ دونوں میں سے ایک ضرور مل جائے گا میرے بارے میں زیادہ کریدمت کرنا اور گڈے والے ایک راز سمجھ کے اپنے سینے میں دفن کرلینا۔ سمجھا' چاہے حالات کیسے ہی ہو جائیں' کسی کو بتانا مت کہ میں نے تجھ سے یہ باتیں کی ہیں ورنہ ہم سب کے لیے پریشانیاں کھڑی ہو جائیں گی۔ بس' جیسے ہی حالات درست ہوئے' وہاں آجاؤں گا، اُس وقت تک اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا۔ دل مضبوط رکھنا۔ لونا مت' میں آؤں گا۔ مگر میں کب آؤں گا' یہ میں تجھے نہیں بتا سکتا۔ میرے جانے کے کچھ دنوں بعد تو یہاں سے چلا جانا۔ تیری ماں کے پاس اچھے خاصے پیسے ہیں۔ کاش میں کچھ اور دے جاتا مگر میں نے اب تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا ہے۔ میری بات قائم رہنے دے جو کچھ ہے اسی میں گزارہ کرلینا۔"

ڈالی نے گڈے کو مجھ سے چھین لیا اور میرا گریبان کھسوٹتی ہوئی بولی۔

"مجھ سے کیوں بات نہیں کرتا؟ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی۔"

"سمجھا کر ڈالی! بھلا میں تجھے کیسے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ میں نہ جانے کن راستوں سے جاؤں گا۔ بس اب چپ رہ۔ میں ہر پھر کے تیرے پاس آجاؤں گا۔ بھول گئی' تو تو خود بار بار کہتی تھی کہ یہاں سے اپنا منہ کالا کرلے۔ اب تیرے میرے دفان ہونے کا وقت آگیا ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں اُس پر عمل کر۔"

"پر شیرو! میں نے اس طرح جانے کو کب کہا تھا۔ بھلا میں کہاں ماری ماری پھروں گی اور اگر تو نہ آیا؟"

"میں ضرور آؤں گا' آؤں گا کیوں نہیں' اور اگر میں جلد ہی نہ آسکا یا مجھے راستے میں کہیں پکڑ لیا گیا تو' تو تو عزت کے ساتھ رہے گی۔ یہاں سے تو نکل جائے گی۔ میری واپسی کی دعا کرتی رہنا۔ وہ لوگ تجھے مل جائیں گے۔ انھیں تو میرا حوالہ دے گی تو دونوں تیرا ساتھ دیں گے مگر ڈالی! اب اپنے بدن پہ پردہ ڈال کے رکھنا اور اپنے منہ پہ خاک مل لینا تاکہ تجھ پر بُری نظریں نہ پڑسکیں' مرتی مرجانا پر سڑک پر مت بیٹھنا اور وردی والوں کو اپنے جسم کی بخشش مت دینا۔ روکھی سوکھی کھالینا، اور دیکھ' میرے جانے کے بعد تجھ سے بہت سے سوال کیے جائیں گے۔ جواب میں تیری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلنا چاہیے اور اُس لڑکی ترنم کو بھی کچھ نہ بتانا۔ ورنہ وہ تیرے ساتھ جانے کی ضد کرے گی' تو اُسے بتائے بغیر چپکے سے نکل لینا' پھر وہ بھی خود ہی چلی جائے گی۔"

"شیرو...." اُس نے میرے سینے پر سر مارنا شروع کردیا۔ گڈا بھی اپنی ماں کی نقل کرنے لگا۔ میں نے ان دونوں کو اپنی چھاتی میں دبا لیا۔ وہ بکتی جھکتی رہی مگر میں نے اپنے کان بند کرلیے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ کب تک چیختی رہے گی، آخر خود ہی چپ ہوجائے گی لیکن ایک بار خوب چیخ پکار کرلے تو اچھا ہے' دل میں حسرت تو نہ رہے گی کہ شیرو سے کچھ کہہ سُن نہ سکی۔ کاش کرنل مجھے اُسے اور گڈے کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دیتا۔ یہ وہاں رہ کے ریتا کی خدمت ہی کرتی مگر کرنل کو یہ کیوں گوارا ہوتا کہ ہم دونوں کے ساتھ ایک ہندوستانی عورت جائے اور نہ معلوم وہاں کیا صورت پیش آئے۔ فرض کرو' میں ڈالی کو کرنل سے اصرار کرکے ساتھ لے بھی جاؤں اور وہاں کوئی بات نہ بن سکے تو اس کی تیرہ نصیبیوں میں اور اضافہ ہوگا' اس کے سوا کیا ہوگا۔

گڈا بہت مچلنے لگا تھا۔ ڈالی نے اسے بہت نظرانداز کیا پھر وہ اُسے چارپائی سے اُٹھا کے زمین پر پھینکنے والی تھی کہ میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ دُور جاکے گری اور وہیں فرش پر گھٹنوں میں سر دیے ہوئے گڈے کی طرح ہڑکنے لگی۔ جب بہت دیر ہوگئی اور تب بھی وہ نہ اٹھی تو میں اُسے گھسیٹ کے چارپائی پہ لایا۔ میں نے اُس کے ہاتھ چومے۔ اُس کے ہاتھوں سے لہسن کی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے گڈا اُس کے حوالے کیا اور جانے سے پہلے آخری بار اُسے کاکہ کے باہر چلا آیا۔ وہ میری صورت دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس لیے میں نے زیادہ دیر اپنی صورت اُس کے سامنے نہیں رکھی۔



باہر آکے میں نے جیب ٹٹولی چند سکے پڑے تھے جیب سے پستول غائب تھا۔ کل تمام رات کو کسی وقت تشار دانے نکال لیا ہوگا۔ کپڑوں وڑپوں کی گٹھڑی لے جانا ممکن نہیں ہوگا مگر بمبئی تک سفر کے لیے اچھے خاصے روپوں کی ضرورت تھی۔ نہ صرف روپوں کی بلکہ ایک پستول بھی ساتھ ہوتا اور فاضل کارتوسوں کا ڈبا بھی تو بہتر ہوتا۔ ان چیزوں کے حصول کے لیے مجھے دوبارہ ذبیش کے محل میں جانا پڑتا۔ خیر کوئی حرج نہیں' ایک بار اور سہی' ایک بار تشار دا' پاروا اور سندھیا کو دیکھ آؤں گا اور ذبیش؟ ذبیش کی پیشانی کا بوسہ بھی لے لوں گا۔ وہاں سے مجھے کرنل کو بھی فون کرنا ہے کہ سرکار! میں تیار رہوں۔ کوئی اور حکم ہو تو دے دیجیے۔

بڑے ہال میں سب جمع تھے' پنڈت زور زور سے شن تنا ٹن ٹنا رہے تھے اور معطر دھوئیں کے بادل آکاش کی جانب اُڑا رہے تھے تاکہ ہیما کی آتما شانت ہوجائے۔ ہیما کی آتما۔ اُس کی آتما تو جگ دیپ کی آتما ہی سے شانت ہوسکتی تھی۔ میں دروازے پہ کھڑا ہوا اندر جھانک کے دیکھتا رہا، ہال بھرا ہوا تھا۔ سب کے سر عقیدت سے خم تھے۔ آدمیوں سے اچھی تو مورتیاں ہوتی ہیں' آدمیوں کے سر جھکوا لیتی ہیں' وہاں انیتا بھی اپنے بال ساڑی سے ڈھانپے ہوئے فرد کش تھی' اُس کے قریب ہی کنور جگ دیپ تھم سے کمر لگائے

سمٹا بیٹھا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف چلا گیا مگر پستول ہی نہیں تھا ورنہ نشانہ بڑا صاف تھا، ایک ہی گولی میں پنڈت مہیما کی آتما کو شانت کرنے کی زحمت سے بچ جاتے اور سارا معاملہ تلپٹ ہو جاتا۔ پھر یکایک میرے ذہن میں آیا کہ جانے سے پہلے اپنی آتما بھی تو شانت کرتا جاؤں ایک شخص کا سوال ہے اُسے بھگتا لیا تو کم از کم بے خوابی کی شکایت ہی رفع ہو جائے گی میرے دماغ میں بجلیاں کوندنے لگیں۔ کنور جگ دیپ سامنے بیٹھا تھا اور اس وقت میری حیثیت وہی تھی جو چند دن پہلے تھی جب آئی جی مہتا نے مجھے ریاست سے خارج ہو جانے کا مشورہ دیا تھا اور میں نے بعد کے دنوں میں خود کو بڑا محفوظ خیال کیا تھا۔ آئی جی نے مجھے دوبارہ طلب نہیں کیا۔ شاید راج محل میں میری حاضری سے مہاراجا امر ناتھ کے دل میں مروت کی کوئی کونپل پھوٹ پڑی ہو یا آئی جی نے سوچا ہو باہر سے آنے والے ماہرین کی تحقیق میں میرا نام نہیں آئے گا آئی جی کو یقین تھا کہ میں وقوعے والی رات پر کاش بھون میں موجود تھا اور کنور جگ دیپ کی بہن اینیکا نے اس کی گواہی دی تھی یا پھر ممکن ہے آئی جی نے مجھے میرے مقدر پر چھوڑ دیا ہو یا یہ سمجھا ہو کہ میں بھی صاحبِ اثر، صاحبِ اعجاز آدمی ہوں اپنا کچھ نہ کچھ دفاع کر رہا ہوں گا للہذا مجھ سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرنا مناسب نہیں ہے یا لاکھی لڑکے بدمعاشوں کی بے دریغ گرفتاری سے واقعات نئے رُخ سے پیش آنے کا امکان ہو یا ممکن ہے آئی جی مہتا دوبارہ مجھے تنبیہہ کرنے ہی والا ہو مگر اب آئی جی مہتا کی تنبیہہ نا تنبیہہ پولیس کی گرفت نا گرفت سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب آئی جی کو پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں تھی میرے مراسم حاکمِ اعلیٰ ہز ایکسی لینسی عالی جناب کرنل صاحب ہارڈنگ افسرِ خاص برائے امورِ ریاست راجے پور من جانب سرکارِ انگلشیہ سے براہِ راست تھے۔ مجھے اُن کا سایہ نصیب تھا جن کا سورج کبھی ڈھلتا نہیں تھا۔ اُن دنوں میں ریاست راجے پور میں خطاب یافتہ نہ سہی مگر سب سے عزت دار شخص تھا۔ ایک بڑی چھاؤنی، ایک پوری فوج میری پشت پر تھی۔ میں نام زد فرزندِ دل پذیرِ دولتِ برطانیہ تھا۔ اس اعزاز کی حمایت میں اگر میں جانے سے پہلے دو چار گولیاں آزما لیتا تو کرنل کو کوئی خاص اعتراض نہ ہوتا، وہ اتنی معمولی بات خاطر میں نہ لاتا۔ اس سے پہلے کے بڑے بڑے واقعات درگزر کر دیے گئے تھے۔ چند روز اور سہی وقت کے اس بلبے میں کوئی فیصلہ ہو جائے تو دنیش چندر کے لیے زیادہ سہولت ہو سکتی تھی مگر ہر کام کی طرح یہ کام بھی احتیاط اور تنظیم کا تقاضائی تھا کسی واردات کے بعد میری اچانک روپوشی ریاست کے لوگوں اور خود دنیش کے دل میں شکوک و شبہات کی خراشیں پیدا کر سکتی تھی۔ حالانکہ کرنل کی ذات ریاست میں اُٹھنے والے ہر ہنگامے کے لیے ایک تلوار کی حیثیت رکھتی تھی پھر بھی کرنل اور دنیش کی نشاطِ جاں کے لیے کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے ہر معاملے پر ٹھنڈے دل سے سوچ لینا ضروری تھا اور دل ٹھنڈا نہیں ہو پا رہا تھا۔ سامنے کنور جگ دیپ بیٹھا تھا۔ میں اُس پر نظریں



جمائے دُور کھڑا رہا۔

پھر کسی پنڈت نے زور سے نعرہ بلند کیا تو میری نگاہیں گڑبڑا گئیں۔ میں نے سراسیمگی سے گردن پیچھے ہٹائی۔ راج کماری کنول کی تاب ناک نظریں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ مجھے خبر ہی نہیں تھی میرے ہونٹوں پر ایک خفیف مسکراہٹ چھلک پڑی۔ اُس نے بھی ایک زیرِ لب تبسم سے جواب دیا۔ میں فوراً وہاں سے ہٹ گیا اور لپکتا ہوا دنیش کے محل میں آ گیا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ چابیاں ٹٹول کے سب سے پہلے میں نے ایک ریوالور پر قبضہ کیا۔ ریوالور جدید طرز کا تھا۔ پھر میں نے ایک دوسری تجوری جیسی الماری سے چند سو روپے نکال کے جیب میں رکھے اور چابیاں دوبارہ صحیح جگہ رکھ دیں۔ خیال آیا کہ ڈالی کے لیے اور رقم نکال لوں۔ دنیش نے اجازت دے ہی رکھی ہے مگر میں نے دوبارہ الماری نہیں کھولی۔ یہی بہت تھا۔ اب میں خاصا مال دار شخص تھا۔

سب لوگ بڑے ہال میں تھے ستارہ، پاروا اور غالباً سندھیا بھی بہر حال سندھیا کو دیکھنے کے لیے ابھی کافی وقت تھا۔ میں ملاقاتی کمرے کے ایک تاریک اور سرد گوشے میں پہنچ کے قالین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں تیج کی دھار تک ریت ختم ہونے والی تھی، شاید کنور جگ دیپ اس طرف کا رُخ کرے میں کس جگہ چھپوں اور کس روزن سے پستول کی نال اور آنکھ کی پتلی باہر نکالوں، جلد ہی مجھے اپنی جلد بازی کا احساس ہو گیا اور میرے دماغ کے تمام کَل پرزے ڈھیلے ہو گئے۔ پرکاش بھون کنور جگ دیپ کے لیے ایک نہایت نامناسب جگہ تھی۔ کوئی اور ہوتا تو میں اس حماقت پہ اُسے چانٹا رسید کرتا اور مشورے کے لیے کبھی اُسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتا مگر وہ جیسا بھی تھا، میں تھا، مجھے ہی یہ سب کچھ کرنا تھا۔ بڑی حویلی کے واقعے کے بعد کنور جگ دیپ بہت محتاط ہو گیا ہو گا۔ سخت پہرا ہو گا فصیل کے باہر دُور دُور تک مشکوک آدمی کی بو سونگھی جاتی ہو گی، چڑیا بھی حویلی پر پرواز کرتی ہو گی تو ایک لمحے کے لیے شبہ

ہوتا ہوگا۔ یہ حفاظتی انتظام پہلے بھی وافر تھے مگر کون تصور کر سکتا تھا کہ پولیس افسر ٹیلر دل میں کینہ لیے، جسم پر وردی پہنے ہوئے آجائے گا اور مہمان سندھیا اچانک بھک جائے گی۔ کنور کے بہت سے محافظ، دست لاکھی پور کے شہد سے جیلوں میں تھے تاہم کنور کے پاس اپنی حویلی میں محافظوں کی ایک کثیر تعداد اب بھی موجود تھی۔ ایسے میں حویلی کی جانب کوچ کا ارادہ باندھنا اور کنور کے خاص محل تک باریاب ہونا کسی شاعر کا خواب تھا۔ حویلی سے باہر جاتے ہوئے کنور بہت پھونک پھونک کے قدم اٹھاتا ہوگا۔ تین چار سرفروش تو ضرور ساتھ چلتے ہوں گے۔ اعلان کسی اور وقت کا کرتا ہوگا، جاتا کسی اور وقت ہوگا۔ چند سیکنڈ کے تخلیے کی ضرورت تھی اور وہ بھی چند گزوں کے فاصلے پر مگر لمحوں کا یہ عرصہ عطا کرنے میں وقت کا سمندر بخیلی کرتا نظر آتا تھا، چند گزوں کا یہ فاصلہ کھنچ کے قطبین کا فاصلہ ہوگیا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہر سو نظر کا جال پھینکا۔ وہ زمانہ گزر گیا تھا کہ دن اِدھر نقاب اوڑھتا، اُدھر راجے پور کے رئیسوں کے ایوانوں میں جا طلوع ہوتا اور رات باہر پہرا دیتی رہتی، اندر ساغر بکف، پابہ ساز بدن جھل ملانے لگتے۔ فصیلیں اونگھتی رہتیں اور دربان ریاست کے مقامی گیتوں میں مگن ہو جاتے۔ اب ہر طرف طنابیں کھنچی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی بات نہیں تھی لیکن بار بار دنیش چندر کا ترحم بار چہرہ سامنے آجاتا تھا۔ معاملہ یہیں بھون میں نمٹ سکتا تھا۔ عید بھی موجود تھا، صیاد بھی موجود تھا، ریوالور بھی تھا اور ارادہ بھی۔ اپنی صورتِ حال میں اتنی تبدیلی ہوتی کہ سمندر کی طرف جانے کے بجائے اِدھر ہی کسی جوہڑ پر مجمع لگانا پڑتا۔

گھڑی نے ٹن سے آواز بلند کی تو میں بے چینی سے اٹھ گیا اور ملاقاتی کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وقت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف کرنل ہی تھا۔ میں نے اسے اپنا نام نہیں بتایا، صرف اتنا کہا "میں بول رہا ہوں" وہ سمجھ گیا اور اس کی نسبتہً بلند اور متجسس آواز ریسیور میں گونج گئی "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے چند لمحے سوچا پھر تیزی سے پوچھا "وہ کیسی ہے؟" اس نے بتایا "خاصی مطمئن نظر آتی ہے" میں نے کہا "اسے میری طرف سے پوچھ لیجیے اور کہہ دیجیے کہ کچھ ضروری کام آپڑے ہیں، شاید ذرا سی دیر ہوجائے" فون پر چند لمحوں کے لیے خاموشی چھاگئی "مگر، مگر" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے جھجک کے مؤدبانہ کہا "صرف چند دن، بس زیادہ سے زیادہ چند دن۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اس سے پہلے ہی دیکھیے نا، ہر بات عمدگی سے۔۔۔" اس نے ترشی آمیز تذبذب سے میری بات کاٹ دی "لیکن تمہیں بہت عجلت کرنی چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ زیادہ وقت ضائع نہ کرو، میں تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں" میں نے کہا "میں سن چکا ہوں اور مجھے سب کچھ یاد ہے تاہم۔۔۔" میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔ فون بند ہوگیا۔ میں ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑا کھڑا رہا۔ میں نے دوبارہ سلسلہ نہیں ملایا۔ یقیناً کرنل نے دانستہ فون بند کیا ہوگا۔

وقت بہت کم تھا اور کرنل کی گفتگو سے وقت کی مزید کمی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ اس طولِ وقتی سے برہم ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے ہائی کمان سے آنے والی ٹیم کے بارے میں کوئی اطلاع آگئی ہو۔ کرنل کے لہجے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ وقت کی اس آپا دھاپی میں جو کچھ ہونا تھا، ہوجانا چاہیے تھا مگر کیسے؟ میرا ہاتھ بار بار ریوالور پر جاتا تھا لیکن دماغ ہاتھ جھٹک دیتا تھا۔ سیاہ داری میں آوازوں کا شور اٹھا تو میں بھاگ کے ملاقاتی کمرے کے باتھ روم میں داخل ہوگیا اور عقب کی جانب کھلنے والے دروازے سے نکل کے باہر آگیا۔ ہاتھوں میں کھجلی ہو رہی تھی۔ وہ ابھی تک یہاں موجود ہوگا۔ کسی درخت پر چڑھ کے نشانہ تاکوں؟ نقاب اوڑھ لوں اور گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے راستے میں مزاحم ہوجاؤں؟ اس کی گاڑی کے نٹ بولٹ ڈھیلے کردوں؟ میرا ذہن اپنی ہرزہ سرائیوں پر پشیمان ہوتا رہا اور وہ چلا گیا۔

ایک پہر اور بیت گیا۔ میں باغ کے سبزہ زار پر لوٹتا رہا اور سفید خرگوش میرے جسم پر چوکڑیاں بھرتے ہوئے گزرتے رہے۔ ایسا آدمی انہیں کبھی نہ ملا ہوگا۔ پھر شام ہوگئی اور ذہن کے سیاہ خانے میں کوئی چنگاری نہیں لپکی بلکہ تاریکی کچھ اور سوا ہوتی گئی۔ ریوالور میری جیب میں کسمساتا رہا۔ میں اندھیرا ہونے کے باوجود باغ میں پڑا رہا۔ کئی مالی مجھے یہاں دیکھ چکے تھے، اس سے پہلے کہ میری ڈھونڈیا پڑتی، میں خود ہی اٹھ گیا۔ کنور کی زندگی زور کر رہی تھی اور زندگی جب زندہ رہنے پر کمربستہ ہو تو موت کترا کے نکل جاتی ہے۔ زندگی اور موت میں یہ مروت نہ جانے کب سے قائم ہے۔ مناسب یہی ہے کہ کرنل کو فون پر اپنی روانگی کی اطلاع دے دی جائے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا۔ اچانک قریب ہی کہیں جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں اچھل کے ایک درخت کی آڑ میں ہوگیا اور ریوالور نکال کے آواز کا رُخ سونگھنے لگا۔ پھر جب میں نے اپنے سامنے سندھیا کو دیکھا تو انگلی ٹریگر پر کانپ کے رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے بازوؤں میں تحلیل ہوچکی تھی۔ بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور سانس بہت بے ترتیب تھی۔ اسے اس طرح اچانک دیکھ کے مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ یہ باغ ہے اور اس کے بہت سے دروازے ہیں اور سندھیا کی طرح کوئی بھی اندر آسکتا ہے۔ میں نے بدحواسی سے کہا۔ "تم یہاں کیسے آگئیں؟"

"ڈھونڈتی ہوئی آگئی۔" وہ ہانپتی ہوئی بولی "تم نے تو مجھے پریشان کردیا ہے۔ تمہیں تلاش کرتے کرتے دو دن ہوگئے۔ تم کدھر چھپے رہتے ہو؟ کیا تم۔۔۔ تمہیں میری یاد نہیں آتی؟"

"آتی ہے بہت آتی ہے۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "میں تو خود تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا، تم کہیں نظر ہی نہیں آئیں۔ تمہیں دیکھنے اور تم سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔"

"جھوٹ۔" وہ برہمی سے بولی "میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی اور تمہارے بغیر میرا جی کسی کام میں نہیں لگتا۔"

کچھ دیر آسکر وائلڈ کے ساتھ

بعض اہم معاملات میں خلوص سے زیادہ طریقۂ کار کی اہمیت ہوتی ہے۔
بیوقوفی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔
تھوڑا اخلوص خطرناک اور زیادہ خلوص جان لیوا ہوتا ہے۔
جو ظاہر سے باطن نہیں جانچ سکتے، وہ بہت سطحی لوگ ہوتے ہیں۔
آدمی اپنے دشمن کے انتخاب میں زیادہ احتیاط نہیں برت سکتا۔
ہر شخص اپنی غلطیوں کو تجربے کا نام دیتا ہے۔
میں دُنیا میں جس شخص کے بارے میں سب سے جاننا پسند کروں گا وہ خود میں ہُوں۔
معاشرے کا ذکر بُرے پیرائے میں مت کرو۔ ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو معاشرے سے الگ تھلگ رہ جاتے ہیں۔

"ہاں کہا تھا اور میں نے پورا یقین کیا تھا۔"
"پھر!" اُس نے میرا کالر پکڑ لیا۔ "تم نے کیا کیا؟"
"میں نے تمھیں بہت یاد کیا۔ بہت زیادہ۔"
"مجھ سے زیادہ نہیں۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی، پھر بے تابی سے کہنے لگی۔ "موہن! میں نے تمھاری بات پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی مگر میرا دل کتابوں میں یا کسی اور جگہ بالکل نہیں لگا۔ سُن لو اب یہاں سے میرا جی اُچاٹ ہو گیا ہے۔ ہر وقت تو تمھاری فکر رہتی ہے۔ میں تاک جھانک کرتی رہتی ہوں کہ کہیں کوئی تمھارے خلاف تو بات نہیں کر رہا ہے۔ یہاں میں نہ تو پڑھ سکتی ہوں نہ کوئی اور کام کر سکتی ہوں، اسی لیے تم سے کہتی ہوں کہ کسی طرح یہاں سے نکل لو، پھر تم ان لوگوں کی نظروں سے دُور اور ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہو گے۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ پھر میں بہت اچھی لڑکی بن جاؤں گی۔ جو تم کہو گے وہی کروں گی۔ تم کہو گے کہ کنویں میں ڈوب جاؤ تو میں کنویں میں ڈوب جاؤں گی۔ اگر میں نے تمھاری پسند کے خلاف ایک بھی کام کیا تو تم مجھے گولی مار دینا۔ میں یہی بات کہنے کے لیے ہر طرف تمھیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ پھر مجھے یاد آیا، تم نے ایک بار بتایا تھا کہ تم باغ میں لیٹے ہوئے تھے۔ اگر تم یہاں نہ ملتے تو میں صاف دمیش ماما سے پوچھتی۔ چاہے وہ کچھ بھی سمجھتے۔ تم چپ کیوں ہو گئے؟ بولتے کیوں نہیں؟ کیا تمھیں میری باتوں کا یقین نہیں آتا؟"
"سندھیا جی!" میں نے اُس کے بالوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ "مجھے تمھاری ہر بات کا یقین آتا ہے مگر ہم باہر کیسے جا سکتے ہیں؟"
"ابھی نہ سہی تو کچھ دنوں بعد۔" وہ جوش میں بولی۔ "مگر جلد ہی، ورنہ میں بیمار ہو جاؤں گی، میں مر جاؤں گی یا نہیں... مگر نہیں میں، تمھیں گولی نہیں مار سکتی۔"
"مجھے مار دیجیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔
"ہشت! اس سے پہلے میں خود کو مار لوں گی۔"
"سندھیا جی! تمھیں میری وجہ سے یہاں نیند نہیں آتی، کتابوں میں تمھارا جی نہیں لگتا۔ تمھیں ہر وقت پریشانی رہتی ہے کہ کہیں مجھے کچھ ہو نہ جائے؟"
"ہاں یہی بات ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔
"تو پھر میں ایسا کرتا ہوں کہ کچھ عرصے کے لیے یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ پھر تم سکون سے رہ سکو گی اور اپنی تعلیم بھی مکمل کر سکو گی۔ کچھ مدت بعد میں واپس آ جاؤں گا۔ جب تک حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے اور میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ کہو کیسی اچھی ترکیب ہے مگر وعدہ کرو، تم میرا انتظار کرو گی اور۔۔۔"
اُس نے میرے سینے پر ایک گھونسا مارا۔ "تم سمجھتے ہی نہیں۔" وہ جھنجلا کے بولی۔ "میں کہہ رہی ہوں کہ تمھارے بغیر میرا جی نہیں لگتا۔ تم مجھے ساتھ لے جاتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو؟ کیا تمھیں مجھ سے ڈر لگتا ہے کہ میں تمھارے کہنے پر عمل نہیں کروں گی اور میں کھانا نہیں پکا سکتی اور میں اتنے اچھے کپڑے پہنتی ہوں، تم مجھے کپڑے خرید کے نہیں دے سکتے۔ میں اتنے بڑے محلوں میں رہتی ہوں اور تم میرے لیے اتنا بڑا مکان نہیں بنوا سکتے یہی نا؟ موہن! جب تم مجھے اپنے بازوؤں میں لیتے ہو تو مجھے بہت سکون ملتا ہے اور میرا جی کرتا ہے کہ میں تمھارے بازوؤں میں سو جاؤں، مر جاؤں، مجھے تم بہت اچھے لگتے ہو، ساری چیزوں سے اچھے، تم مجھے خود سے بھی اچھے لگتے ہو۔"
میں نے اُس کا منہ بند کر دیا۔ "نہیں، نہیں، بس سندھیا جی! بس کرو۔"
میری آواز حلق میں پھنس گئی۔ "میرے یہ بازو کاٹ کے رکھ لو سندھیا جی! میری اچھی سندھیا جی! تمھیں دُنیا کا حال نہیں معلوم یہاں صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، موسم بدلتے رہتے ہیں، آندھی چلتی ہے، طوفان آتا ہے، آدمی کو زندہ رہنے کے لیے ہر بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میں تم سے کیا کہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن سندھیا! اتنی جلدی مت کرو، ذرا اچھے وقت کا انتظار کرو، آؤ چلو یہاں کوئی آ جائے گا۔" میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا اور میرے پاس وہ لفظ نہیں تھے جنھیں سندھیا سمجھتی تھی۔
"پہلے تم بتاؤ، تمھارے دل میں کیا ہے؟"
"میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔"
"کچھ بھی نہیں ہے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "میں بھی نہیں ہوں؟ تم آج کچھ نئے نئے معلوم ہو رہے ہو، کیا کوئی بات ہے؟ مجھے بتاؤ، کیا کسی نے تمھیں کچھ کہا ہے؟" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔
"نہیں سندھیا! مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا البتہ تم نے بہت کچھ دیا ہے۔ یہ جگہ مناسب نہیں ہے، آؤ کسی اور جگہ چل کے باتیں کرتے ہیں۔"
"میں نے کیا کہہ دیا ہے؟" وہ تنک کے بولی۔ "کہیں تم مجھ سے روٹھے ہوئے تو نہیں ہو؟ ضرور کسی نے میرے بارے میں تم سے کوئی بہت بڑا جھوٹ..."
"نہیں، نہیں" میں نے بے قراری سے اُس کا چہرہ تھام لیا اور اُسے... سے اُٹھا کے آگے بڑھنے لگا۔ اُس کے بالوں میں میرا چہرہ اُلجھنے لگا مگر وہ میرے...

شانے پر ڈھلک گئی۔ میں اُسے گھنے درختوں کے جھنڈ میں لے گیا اور بہت احتیاط سے زمین پر اتارتے ہوئے اس سے کہا۔ "تمھارا خیال ہے کہ کسی نے بہت بڑا جھوٹ بولا ہوگا۔ مجھے تم پر اتنا اعتبار ہے کہ اگر کوئی سر پہ آگ رکھ کے بھی تمھارے بارے میں کوئی بات کہے گا تو میں یقین نہیں کروں گا لیکن سندھیا! میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا "لیکن تم ایسا نہیں کرو گی۔"

وہ اُٹھ کے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔ "اور اگر تم سے کوئی میری بُرائی کرے گا تو بے شک تمھیں یقین نہیں آئے گا مگر تم اتنی غصے ہو جاؤ گی، اتنی غصے ہو جاؤ گی کہ اُسے شوٹ کر دو گی، تمھارا دل بہت چھوٹا ہے، لوگ برداشت کرتے ہیں اور میں تم سے ذرا بھی دور ہوتا ہوں تو تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ فرض کرو اگر میں کبھی کام سے کسی خاص وجہ سے ہفتے دو ہفتے مہینے دو مہینے کے لیے روپوش ہو گیا اور جلدی میں تمھیں بتا کے بھی نہ جا سکا تو تم تو میرا انتظار بھی نہیں کرو گی، تمام احتیاط ختم کر دو گی، نہ جانے کیا کر لو گی۔ ایسے تھوڑی ہوتا ہے، ہم جہاں بھی رہیں گے، آدمیوں کے درمیان رہیں گے اور ہمیں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔ زندگی میں ہر لمحے کوئی کسی نہ کسی کا انتظار کرتا رہتا ہے، زندگی انتظار کا نام ہے اور انتظار برداشت کرتے ہیں۔ دیکھو نا جب زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے تو پھل دوسرے ہی دن نہیں آجاتے۔"

وہ میری باتیں پوری توجہ سے سُن رہی تھی۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں میرے خاموش ہو جانے کے بعد بھی وہ چُپ رہی کچھ سوچتی رہی پھر ایک دم چمک کے بولی۔ "ہاں موہن! یہاں مجھے بہت غصہ آتا ہے کیونکہ یہاں تقریباً سبھی بُرے لوگ رہتے ہیں اسی لیے تو میں تم سے کہتی ہوں کہ مجھے یہاں سے لے چلو، پھر تم دیکھنا، میں صبح سے شام تک تمھارا انتظار کروں گی، تم کہیں کام پر تو جاؤ گے نا، ہمارے پاس سامان نہیں ہوگا، ممکن ہے ہمیں کبھی کھانے کو بھی نہ ملے مگر تم دیکھنا، میں کیسا برداشت کروں گی، پھر بھی میں تمھیں اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ یہ تم نے کہیں جانے کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ ٹھیک ہے، میں نے تم سے کہہ دیا ہے میں اس وقت تک انتظار کروں گی جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے لیکن اس کے بعد میں کوئی بات نہیں سنوں گی، سمجھ گئے؟"

میں نے اپنی پیشانی اُس کے سینے پر رکھ دی اور زبان بند کر لی۔ سندھیا کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور نہ جانے کیا پٹر پٹر بڑبڑاتی رہی میرے کانوں میں مرچیں بھرتی رہی۔ مانوس اندھیرے میں اُس کے خدوخال نمایاں ہو گئے تھے۔ میں اُس کی صورت آنکھوں میں کھبا تا رہا۔ اُس کی صورت، پریوں جیسی چاندنی کی طرح چمکیلی، شفاف، نرم و نازک، بڑی بڑی آنکھوں میں اضطراب اُکھرا اُبھرا بدن، سارے بدن میں پارہ بھرا ہوا، ایک لمحے میں اِدھر ایک لمحے میں اُدھر، ناراض ہو تو آس پاس چنگاریاں سی چھٹکنے کا گمان ہو، مسکرائے تو ادھ کھلی کلیوں کو شرمسار کرے۔ اُسے مسکرانا اور ہنسنا آتا تھا، حسین لڑکیوں کو اگر ہنسنا نہ آتا ہو تو اُن کا حُسن اکارت ہو جاتا ہے۔ ہنسی بھی ایک حُسن ہے۔ وہ جب ہنستی تھی تو اُس کے رخساروں کے زاویے اور تیکھے ہو جاتے تھے۔ وہ گڑھا اُبھر آتا تھا جس میں گرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ جب ہنستی تھی تو اُس کے دودھیا، بُراق چھوٹے چھوٹے دانت چمکتے اور چھپاتے ہوئے نظر آتے تھے اور ہونٹ پھڑکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کا کیا کروں، کیا اُسے کھا جاؤں مگر وہ اتنی بڑی تھی کہ اُسے سینے میں چھپا کے چلا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لمحے گزر گئے۔ وہ مجھے اور میں اُسے، ہم دونوں گم سم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

یہ جگہ نسبتاً محفوظ تھی مگر بہت نامراد نکلی، سب کچھ ایک لمحے میں بکھر گیا یکایک میرے کانوں میں کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی پھر کوئی آہستہ آہستہ میرا نام پکارنے لگا۔ ہم دونوں نے دم سادھ لیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے سندھیا کو اُٹھایا۔ وہ لپک کے میرے جسم کی اوٹ میں ہو گئی۔ پکارنے والا ادھر ہی آ رہا تھا۔ میں نے سندھیا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُسے وہیں بیٹھ رہنے کا اشارہ کیا۔ آگے بڑھتے ہوئے مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے آناً فاناً واپس ہو کے اُسے بے تحاشا سمیٹ لیا۔ چاپیں اور نزدیک ہو گئی تھیں اس لیے مجھے سندھیا سے جُدا ہونا پڑا۔ میں نے آنے والے شخص کو تیز تیز قدموں سے جھنڈ کے باہر ہی جا لیا، میرا خیال درست نکلا۔ شام کو مالیوں نے مجھے یہاں پڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دنیش کی بے تابی شام ہی سے شروع ہوئی ہو گی۔ وہ بوڑھا جانکی داس ہی تھا۔ میں اُسے لیے لیے باغ سے نکل گیا۔

چند منٹ بعد میں سر جھکائے ہوئے دنیش چندر کی خدمت میں حاضر تھا۔ وہاں شاردا کے سوا کوئی نہیں تھا اور اُس کی نظر سب سے پہلے میرے کپڑوں پر لگے ہوئے تنکوں پر گئی۔ میرا جسم چور بن گیا۔ وہ میرے پاس آ کے خاموشی سے انھیں چننے لگی۔ اس دوران میں اُس کی اُنگلیاں میری جیب میں رکھے ہوئے ریوالور سے چھو گئیں، اُس نے اُسے جھٹ نکال لیا۔ میں نے اُس سے ریوالور چھیننا چاہا مگر اُس نے اُسے دنیش کی طرف اُچھال دیا۔ ریوالور بھی چلا گیا، میرے کندھے جھک گئے۔ اُن دونوں نے مجھے کھانا کھلا کے کمرے میں بند کر دیا۔ میں نے باہر نکلنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کمرے میں کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سامنے شاردا بیٹھی ہوئی ہو گی اور اگر اُس کی آنکھ لگ بھی گئی ہو گی تو وہ ذرا سی آہٹ سے جاگ جائے گی۔

رات گزر رہی تھی اور میں بے چینی سے بستر پہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ سندھیا کے باغ میں آنے سے پہلے میرے ناکارہ دماغ میں پارے کی صورت نمودار ہوئی تھی، اس بیابان اندھیرے میں کچھ دبی روشنی کی ایک کرن نظر آتی تھی حالانکہ وہ میری بات سُن کر ہی بھڑک اُٹھتی اور کسی طور میرے ارادے کی تائید کرنے پر آمادہ نہ ہوتی مگر التجا کرنے میں کیا حرج تھا۔ اُس کا زرخیز دماغ اور حرکت مندمل شاید متاثر ہو جاتا مگر اب تو کمرے سے نکلنے ہی کی اجازت

عورت ـ نسوانیت

حُسن اور لطافت کا پیکر...

مگر یہ مَردوں کی طرح شیو کیوں؟

کیسی انوکھی بات! کہ آپ ہیں تو عورت! لیکن اپنے غیر ضروری بالوں کو مَردوں کے انداز میں شیو کر کے دُور کریں!! اور اب تو این فرینچ کریم یا لوشن آپ کے بازوؤں کے نیچے اور ٹانگوں کے بالوں کو یوں صاف کر دیتی ہے جیسے وہاں بال تھے ہی نہیں۔ این فرینچ بہت ہی محفوظ ہے۔ اس کے استعمال کا فائدہ یہ ہے کہ نہ کٹنے کا اندیشہ۔ نہ جلن کی مصیبت۔ نہ ہی داغ دھبے دیکھیے آئندہ نہ تو بلیڈ استعمال کیجیے اور نہ ہی بالوں کو نوچیے یہی نسوانیت کا انداز ہے۔ اسی میں دل کشی ہے۔



اور اب
ایک نئی مسحور کن
خوشبو میں

نیا لیمن سینٹڈ لوشن

این فرینچ

جلد کے غیر ضروری بالوں کو دور کرنے کے لئے سب سے معیاری کریم اور لوشن

لندن ـ پیرس ـ روم

BOND

AFHR (U)-2-74

نہیں تھی۔ پارو ادھر تڑپ رہی ہوگی، جاگ رہی ہوگی، کتنی راتوں سے جاگ رہی ہوگی۔ جاگنے دو، سب کو جاگنے دو، لوگ کب تک نہیں سوئیں گے۔ انتظار میں آنکھیں پھوٹ جائیں گی، پھوٹ جائیں۔ ہمیں تو اپنی لکیروں کے مطابق عمل کرنا ہے۔

ایک دن اور گزر گیا، ایک ویران دن۔

شام کو ریاست کے دیوان کنور کیدار ناتھ نے دنیش سے تخلیے میں ملاقات کی اور شاردا کے لیے مہاراجا کا پیام پہنچایا۔ کیدار ناتھ نے معذرت کی کہ وہ مہیا کی موت کے چوتھے ہی دن مہاراجا کی طرف سے یہ پیام لائے ہیں پھر انھوں نے کہا کہ مہاراجا یہ معاملہ نہایت غیر رسمی انداز میں انجام دینا چاہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ ریاست کے موجودہ حالات پرانی رسوم اور رواجوں کے متحمل نہیں ہیں، مہاراجا چند دنوں بعد اپنی مہارانی کے ساتھ یورپ چلے جائیں گے اور دونوں خاندانوں میں سے کسی ایک خاندان کے سربراہ کو ریاست کی عارضی ذمے داری سونپ جائیں گے۔ مہاراجا نے خواہش ظاہر کی تھی کہ شادی کے ابتدائی مراحل تک یہ معاملہ صیغۂ راز میں رکھا جائے اور وہ کسی تاخیر کے بغیر یہ قدم اٹھانا چاہتے ہیں کیونکہ تاخیر سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لیے جو کچھ ہو وہ فی الفور ہو جائے، ہو سکے تو چند دنوں کے اندر۔ ساتھ ہی مہاراجا نے اپنے مشیر کی حیثیت سے پرکاش بھون کے ملازم موہن داس کو راج محل میں بلانے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ دیوان کنور کیدار ناتھ نے شاردا کے لیے مہاراجا کی طرف سے ایک بیش قیمت ہار اور ہیرے کی انگوٹھی بھی دنیش چندر کی خدمت میں پیش کی اور ریاست کے شمال میں کئی سو گاؤوں پر مشتمل جاگیر بطورِ تحفہ پیش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اعلان کیا کہ کماری شاردا کی حیثیت ریاست کی باقاعدہ مہارانی کی ہوگی، یوں بھی مہاراجا کی کوئی اور رانی نہیں ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ پیام سننے کے بعد دنیش کے ماتھے پر کتنی شکنیں ابھریں اور اس کی رگوں میں خون کی گردش کی رفتار کیا رہی، دیوان کے آنے کے بعد سب کو ہٹا دیا گیا تھا۔ میں نے خود کو خواب گاہ سے ملحق کمرے میں بند کر لیا تھا۔ دیوان کی آمد اور تخلیہ ہی سب کے لیے چونکا دینے والی بات تھی۔ میں نے دنیش کو نہیں بتایا تھا کہ میں پرسوں کرنل ہارڈنگ کے پاس جانے سے پہلے راج محل بھی گیا تھا اور وہاں راج کماری کنول نے بہت اشتیاق سے شاردا کا ذکر چھیڑا تھا کنول سمجھ رہی ہوگی کہ میں نے دنیش سے اس کا تذکرہ کر دیا ہوگا اس لیے اب ریاست کے معزز دیوان کو بھیجنے کی راہ ہموار ہوگئی ہے مگر مجھے دنیش چندر سے نہ ایسی کوئی بات کرنے کا موقع ملا تھا، نہ ہمت پڑی تھی کہ اس نے خود ہی فیصلہ سنا دیا۔

مجھے شبہ تھا کہ دیوان کی آمد کا مقصد اس کے سوا کچھ اور رہو گا۔ کبھی کبھی باہر کی کوئی آواز میرے کمرے میں سرگوشی بن کے آ جاتی تھی۔ دیر تک کوئی آواز، کوئی چہکار نہیں ہوئی۔ دیوان کے جانے کے بعد شاید دنیش چندر بہت دیر تک تنہا بیٹھا رہا۔ پھر وہ میرے کمرے کا دروازہ کھول کے میرے قریب آیا اور اس نے تھکے ہوئے انداز میں اپنے جسم کا بوجھ میرے شانے پر ڈال دیا اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں دیوان کی آمد کا حال سنانے لگا۔ مجھ پر سکتہ طاری تھا، وہ مجھے جھنجوڑنے لگا۔ "بتاؤ موہن! میں اور کیا کہتا۔ مجھے تو یہی کہنا اور یہی کرنا چاہیے تھا۔"

"نہیں، نہیں دنیش بابو! آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" میں نے اپنی آواز قائم رکھنے کی کوشش کی۔ "آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو؟" وہ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بولا۔

"ہاں، یہ میں کہہ رہا ہوں۔ یہ میں ہی ہوں۔" میں نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ مہاراجا ہیں، اس ریاست کے مالک اور میں، آپ کو کچھ پتہ نہیں کہ میں کون ہوں اور کیا۔۔۔۔ کیا میرا نام بھی یہی ہے۔ ممکن ہے میرا نام بھی یہ نہ ہو۔ دنیش بابو! آپ نے برا کیا، آپ نے بہت برا کیا، آپ کو اس معاملے پر از سر نو غور کرنا چاہیے تھا۔ آپ کو کم از کم وہ نشانیاں واپس نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ ہم بھون کا وسیع مفاد کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔"

"موہن! موہن!" وہ برہمی سے بولا۔ "چپ رہو۔"

"میں کیسے چپ رہوں دنیش بابو!" میں نے منتشر لہجے میں کہا۔ "ذرا سوچیے، مہاراجا نے کسی ناروا خواہش کا اظہار نہیں کیا ہے، انھیں بھی شاردا کو پسند کرنے کا اختیار ہے، اس ریاست کا مہاراجا کوئی برا آدمی نہیں ہے۔ اس نے راجے پور کی اتنی لڑکیوں میں سے صرف شاردا کو منتخب کیا ہے اور شاردا کو واقعی ایک ملکہ، ایک مہارانی ہی ہونا چاہیے۔ ہاں اگر مہاراجا اس خواہش کا اظہار نہ کرتے تب بات دوسری تھی۔ اب وہ درمیان میں آ گئے ہیں، آپ کے انکار سے بہت دور رس نتائج نکل سکتے ہیں، ریاست کا پورا نقشہ بگڑ سکتا ہے، دنیش بابو! شاردا مجھے بہت عزیز ہے، بے پناہ عزیز مگر۔۔۔ مگر دیکھیے نا، ہمیں حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔"

"تم مجھے ذلیل کر رہے ہو موہن!" وہ کرب سے بولا۔

"نہیں۔" میں نے شدت سے احتجاج کیا۔ "نہیں، ایسی بات مت کہیے۔ مجھے اپنی نظروں میں اس قدر نہ گرائیے۔"

"تو پھر تم ایک بھیانک مذاق کر رہے ہو۔" وہ تلخی سے بولا۔ "اچھا ہوا کہ تم نے یہ بات شاردا کے سامنے نہیں کہی، وہ تو شاید جاں بر نہ ہوتی۔" اس کا لہجہ مشتعل ہو گیا۔ "میرا خیال ہے، ہمیں اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ جب میں دیوان جی سے انکار کر رہا تھا تو میرے ذہن میں اپنے فیصلے کے تمام نتائج موجود تھے، وہ اگر مہاراجا ہے تو ہم بھی کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو فیصلہ ہو چکا ہے، وہ ہو چکا۔ چاہے ریاست میں آگ لگ جائے اور سارا بھون کھنڈر بن جائے، مہاراجا اس بھون کی کسی اور لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں مگر شاردا سے نہیں، شاردا دی جا چکی ہے۔ اور کسی اور کو نہیں موہن! وہ میرے

دوست کی امانت ہے۔" اُس نے پھر میری طرف دیکھا بھی نہیں اور مجھے آگ میں تنہا جلتا ہوا چھوڑ کے کمرے سے نکل گیا۔



میری گاڑی صدر دروازے پر نہیں روکی گئی۔

آٹھ بج رہے ہوں گے۔ راج محل میں ہر طرف روشنی اور خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے راج کماری کے خاص کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ گھڑی کی سوئی نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ نیلی ساڑھی میں سجا ہوا راج کماری کا سراپا سامنے کے دروازے پر جلوہ گر ہوا۔ میں نے اُٹھ کے اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا کیونکہ اب اُس کی بارگاہ میں کم سے کم اتنی نیازمندی کا اعتماد مجھے حاصل تھا مگر راج کماری بے تابانہ میری طرف بڑھی اور اُس نے میرے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال دیا۔ سو میں نے اُس کی کمر میں اپنے گریزاں اور لرزیدہ بازو حمائل کر دیے۔ "موہن!" وہ سرگوشی میں بولی۔ "تم بہت بروقت آئے۔ اس وقت ہم بہت پریشان تھے اور تمھیں شدت سے یاد کر رہے تھے۔"

"میں جانتا تھا کہ ایسا ہوگا۔"

"تم جانتے تھے؟" وہ اضطراب سے بولی۔

"ہاں۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"ہم تو بہت خوف زدہ ہو گئے تھے۔ یقین کرو ہم خود سے اتنے بیزار کبھی نہیں ہوئے تھے۔ تم نے آ کے ہمیں ہم کو واپس کر دیا۔"

"میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس کے بدن میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی۔ "کیا، کیا؟" وہ پریشان ہو گئی۔ اور کچھ توقف کے بعد سوگوار آواز میں بولی۔ "مگر تم ہمارا خیال رکھنا۔ ہمارا حوصلہ منتشر ہو گیا ہے۔ یقیناً تمھیں دیوان جی کی پرکاش بھون میں آمد اور واپسی کی خبر مل گئی ہے۔ ہمیں بالکل یقین نہیں آتا۔ ہم سمجھتے ہیں دیوان جی جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"دیوان جی نے آ کے جو بتایا ہے، وہ سچ ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

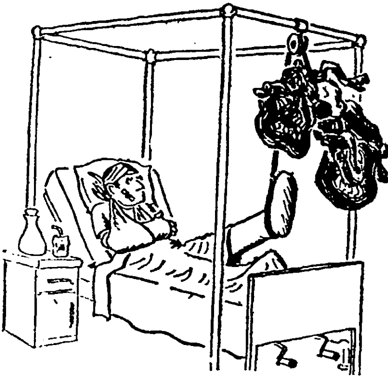
"ضرور، دنیش چندر نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی ہوگی۔"

"نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔ راج کمار دنیش کو معلوم نہیں ہے کہ میں اس وقت راج محل میں موجود ہوں۔ میں اُن کا نمائندہ بن کے نہیں آیا ہوں۔"

"گویا تم اپنی حیثیت سے آئے ہو؟"

"ہاں! اگر میری کوئی حیثیت ہے تو۔ . . ."

اُس نے میری بات پوری نہیں ہونے دی۔ اپنا سلگتا ہوا چہرہ میرے سامنے کر لیا۔ "تمھاری حیثیت۔" اُس کی آواز سے مسرت چھلکنے لگی۔ "تمھاری حیثیت ہماری نظروں میں بڑی مستند ہے۔ ہم بتائیں، جب بھی تم یہاں سے گئے یا ہم نے تمھیں فون کیا یا تمھارا فون آیا تو ہمیں خود سے شکوہ رہا کہ ہم سے تمھاری



حیثیت کے مطابق بات نہ ہو سکی اور تمھارے لیے تپاک میں ہم سے پھر کوئی چوک ہو گئی اور ہم جو کہنا چاہتے تھے، کہہ نہ سکے۔ اب کے ہم نے طے کیا تھا کہ ہم کوئی جھجک نہیں کریں گے۔"

"میں اپنی باتیں بھول جاؤں گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اوہ۔" وہ شرمانے لگی اور اُس کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔

"میں کہہ رہا تھا۔ . . ." میرے ذہن میں لفظ منتشر ہو گئے۔

"بھول گئے نا؟" وہ مسکرا کے بولی۔ "ہم یاد دلائیں؟"

"چلیے، آپ کا مزاج تو خوشگوار ہوا۔" میں نے شائستگی سے کہا۔

"وہ تو تمھیں دیکھ کے ہی ہو گیا تھا موہن!" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "جب ہمیں دیوان جی نے آ کے یہ سب کچھ بتایا تو، ہمیں سب سے پہلے جانتے ہو کس احساس نے ستایا؟"

"کس احساس نے؟" میں نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہم نے سوچا، کہیں تم بھی۔ . . . تم بھی ہمارے پاس نہ آؤ۔" وہ نظریں جھکا کے بولی۔ "ہمیں تمھارے اور دنیش چندر کے تعلق پہ بہت رشک آتا ہے۔ اب ہمارے اوسان تم نے اپنی ایک علیحدہ حیثیت کی بات کر کے بحال کیے۔"

"کنول دیوی! بدقسمتی سے راج کمار دنیش کو ایک ہی حوالے سے پہچانا جاتا ہے، میرا اُن کا تعلق اس بنیاد پر نہیں ہے اور نہ میں انھیں اس حوالے سے پہچانتا ہوں۔ ہاں پہلے کبھی ایسا ضرور تھا مگر جب مجھے اُن کے قریب آنے کا موقع ملا تو مجھ پر اُن کی ذات کے اسرار منکشف ہوئے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اُن کے متعلق اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ ضرور رکھیں۔ اچھے آدمیوں کو تلاش کرنا چاہیے اور اُن سے قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ دُنیا میں اُن کی بڑی کمی ہے۔ میں آپ سے بار بار اُن کا تذکرہ کیوں کرتا ہوں، یوں کرتا ہوں کہ وہ اس تذکرے کے مستحق ہیں۔ میرا اُن کا تعلق اسی سبب سے ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح تلاش کیا ہے، انھوں

سکے مجھے اور میں نے اُنھیں سمجھا ہے۔ اگر آپ کی نظروں میں میری کوئی محترم حیثیت ہے تو میری بات کسی گریز کے بغیر تسلیم کیجیے۔"

"مگر یہ سب کیا ہے؟" وہ اُلجھ کے بولی۔

"یہ سب! میں آپ سے اسی کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔ راج کمار نے انکار کر دیا ہے، میں اپنی حیثیت سے اس انکار پر آپ کو اور مہاراجا کو سنجیدہ نہ ہونے کا مشورہ دینے آیا ہوں۔ مجھے اعتراض ہے کہ دیوان جی کے لئے پرکاش بھون میں جانے کا یہ موقع نہیں تھا۔ یہ مہیما کی موت کا چوتھا دن تھا۔ ریاست میں افراتفری مچی ہوئی ہے، ہر شخص اپنے طور پر بگڑے ہوئے حالات کا اثر لیتا ہے۔ آپ تو راج محل میں بیٹھی ہیں لیکن بڑی حویلی اور پرکاش بھون کے مکینوں پر عافیت کی ایک رات گزر جاتی ہے تو وہ صبح مندر میں جا کے بھگوان کی مورتی چومتے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے راج کمار کے دُکھ محسوس کر کے ان کا دھیان بٹانے کے لیے یہ قدم اُٹھانا ضروری سمجھا ہو، آپ کے پیام میں ریاست کی ایک سنورتی ہوئی صورتِ حال کا بھی اشارہ تھا۔ یہ اشارہ یقیناً راج کمار دنیش کے لیے سکون کا سبب ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس لیے نہیں ہوا کنول دیوی کہ دنیش چندر ایک بہت نازک آدمی ہیں۔ اُنھوں نے دیوان جی سے سچ کہا ہے کہ کماری شاردا کی صحت ٹھیک نہیں ہے، اُس کے صحت یاب ہونے میں وقت لگے گا، ایک وقت گزرنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بات بھی سچ کہی ہے کہ وہ یورپ جانا چاہتے ہیں۔ مہاراجا کا یہ بابرکت رشتہ کون مسترد کر سکتا ہے۔ آپ نے اس پہلو پر نہیں سوچا۔"

"ہماری سمجھ میں یہی بات تو نہیں آتی، شاردا اگر بیمار ہے تو اُس کا علاج ہو سکتا ہے۔ راج کمار دنیش چندر کم از کم مہاراجا کی وہ نشانیاں رکھ سکتے تھے جو ہم نے پیام کے ساتھ بھیجی تھیں مگر انھوں نے تو کوئی روا داری ہی نہیں برتی، ہمیں تو مہاراجا کا خیال ہے کہ وہ زندگی میں صرف ایک لڑکی سے متاثر ہوئے تھے اور اُسے بھی حاصل نہیں کر سکے۔ تم اندازہ کرو، مہاراجا کو کس قدر صدمہ ہو گا۔"

"میں اندازہ کر سکتا ہوں اور یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ مہاراجا دنیش چندر کے انکار سے دل برداشتہ نہ ہوں، وہ ایک نوجوان آدمی ہیں، جذباتی اور حساس بھی، انھیں رموز سمجھنے میں دیر لگ سکتی ہے۔ آپ مہاراجا کو میری جانب سے بتائیں کہ شاردا انھی کی طرح ایک مختلف قسم کی لڑکی ہے، اُس کے اطوار مختلف ہیں، فکر جُدا ہے، ممکن ہے اُس نے بھی مہاراجا کی طرح اپنے آپ سے یہ عہد کر رکھا ہو کہ وہ اُن روایتی بندشوں سے آزاد رہے گی اور ممکن ہے بعد میں وہ مہاراجا ہی کی طرح فیصلہ دے۔"

"کیا ایسا ہے؟" وہ تجسّس سے بولی۔

"ہو سکتا ہے کماری شاردا عمر کی جس منزل میں ہے، وہاں عجب عجب آئیڈیل بن جاتے ہیں، ممکن ہے وہ اپنے بھائی دنیش چندر سے جُدا ہونے پر آمادہ نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کی نظر میں کوئی اور بسا ہو؟"

"ہاں ہاں" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی: "ہو سکتا ہے۔"

میں نے تیزی سے کہا: "یہ سب میرا قیاس ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دنیش چندر کے انکار کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ان وجوہ سے دیوان جی کو آگاہ کرنا ضروری نہیں تھا لیکن جب ریاست کے حالات اعتدال پر آجائیں گے اور دنیش چندر کبھی سُبک ہواؤں کے رُخ پر بیٹھیں گے تو میں سمجھتا ہوں وہ اپنے انکار پر شرمندہ ہوں گے اور اُن میں شرمندگی کا اعتراف کرنے کی صلاحیت ہے، جرأت بھی ہے بشرطیکہ مہاراجا کی نگاہوں میں گداز ہو اور اُن کی پیشانی شرمندہ ہونے والوں کے لیے کبیدہ نہ ہوتی ہو۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا مہاراجا صرف اپنی عزت، وقار، اقتدار اور اختیار کے بل پر اس بات کے مدعی تھے کہ وہ شاردا کو حاصل کر لیں؟ اس کے برعکس اگر اُن کی طلب ایک طلب گار کی طلب ہے تو انھیں اس کا اظہار مختلف طریقے سے کرنا چاہیے۔ شاردا راج محل سے متاثر ہونے والی لڑکی نہیں ہے۔ اُس نے کتابیں پڑھی ہیں اور زندگی کی سچائیاں پہچانی ہیں۔ کتابوں سے اگر زندگی کی پرکھ نہیں آتی تو دنیا کی تمام کتابیں جلا دینی چاہئیں۔ میں بس یہی کہنے آیا تھا، اب یہ کام آپ کا ہے کہ آپ مہاراجا تک میری گزارشات کس طرح منتقل کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے، یہ آپ کی خاصی بڑی آزمائش ہے۔"

وہ ٹکٹکی باندھے مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ سراسیمہ، مبہوت، گُم۔ میرے چپ ہو جانے کے بعد بھی اُس کا یہی عالم رہا۔ "آپ نے توجہ دی؟" میں نے اُسے ٹوکا۔

اُس کے بدن میں جیسے ایک لہر گزر گئی، وہ چونک کے بولی: "ہم کس کس بات پر توجہ دیں؟ مہاراجا تک تمھاری دل نشیں باتیں ہم اپنے طور پر اسی لہجے میں منتقل کرنے کی کوشش کریں گے لیکن ہم ایک اور بات سوچ رہے ہیں۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں؟" میں نے گھبرا کے پوچھا۔

"نہ جانے کیوں ہمیں اپنا خیال آ رہا ہے، ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، ہمارا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے۔"

"آپ کا شمار،" میں نے تذبذب سے کہا: "آپ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی نگاہ کی گرمی سے بستیاں جل جاتی ہیں اور جن کا نقش اگر کندہ ہو جائے تو موت بھی اُسے نہیں مٹا سکتی۔"

"اوہ نہیں،" وہ متوحش لہجے میں بولی: "ہم یہ نہیں سُننا چاہتے۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ تم سے مشورہ کریں، بتاؤ، ہم کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ ہم بہت... بہت ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔"

"کنول دیوی! دُنیا میں نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو اپنے ساتھ اپنا

مصیبتوں کا شکار صرف کاہل لوگ بنتے ہیں۔ کاہل اور بیکار قومیں پاؤں کے نیچے روندی جا رہی ہیں۔ تساہل نے انھیں غارت کر دیا ہے۔ وہ ہر بات میں دوسروں کی دست نگر ہیں اور جو قومیں محنت کی خوگر ہیں، دست و بازو سے کام لیتی ہیں، ہمت و تدبیر عمل میں لاتی ہیں، جو حوصلے اور جرأت سے بہرہ ور ہیں، وہ حکمراں ہیں، فطرت کی طاقتیں بھی اُن کی خدمت میں دست بستہ ہیں۔ دُنیا میں اُن کا ڈنکا بجتا ہے۔

یہ دُنیا ایک میدانِ کارزار ہے۔ اس میں ہر فرد برسرِ پیکار ہے، جو لوگ مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے میدانِ عمل میں پیش پیش رہتے ہیں، بلاشبہ وہی کامیابی کے درشن کرتے ہیں۔ کیا اُس شخص سے فتح کی اُمید کی جا سکتی ہے جو صرف گھر کی چار دیواری میں دبک کر رہنا چاہتا ہے؟

کاشی رام چاولہ کی تحریر — ظفر ذی شان بٹ کا انتخاب

زنداں لیے پھرتے ہیں، ایسے ہر شخص کو ایک مشورے کی ضرورت رہتی ہے جب کہ مشورہ خود اُس کے پاس ہوتا ہے۔ آدمی اپنا سب سے بہتر مشیر خود ہے، اُسے اپنے زنداں سے نجات کے راستے معلوم ہوتے ہیں، یہ نجات اپنے آپ سے کیے جانے والے سمجھوتے پر ممکن ہوتی ہے۔ کچھ ترک کرنا پڑتا ہے، کچھ ضبط کرنا پڑتا ہے، کچھ ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ آدمی کی ذات، اُس کے مقام، گرد و پیش اور اُس کی طلب کے مراتب یکساں ہوتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ کبھی ایک لمحے کی قابو یافتگی نصیب ہو جائے۔ مراتب کا یہ شعور بھی ہوتا ہے۔" میں نے اُس کی جانب دیکھ کے توقف کیا۔

"ہم سمجھ رہے ہیں،" وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے اشتیاق سے بولی۔

"اور پھر وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی نظر میں اُن کی طلب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ وہ سارے مراتب سے دست بردار ہو کے صرف اپنی طلب میں گم ہو جاتے ہیں مگر یہ ایک بہت مشکل اور سخت راستہ ہے۔ بہت سے لوگوں کی سانس راستے ہی میں پھول جاتی ہے، اور کچھ لوگ لہولہان ہو کے بھی اپنی طلب سے باز نہیں آتے۔ انھیں اپنی طلب سے ایک نشہ آنے لگتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر طلب گار کو اُس کا مدعا مل ہی جائے۔ بسا اوقات کچھ بھی نہیں ملتا۔ ساری عمر اسی نشے میں گزر جاتی ہے اور جب ملتا ہے تو گویا ایک کائنات مل جاتی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے، اگر دیر ہو گئی تو راج کمار میری غیر حاضری محسوس کر لیں گے۔"

اُس پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام کے اپنی آنکھوں کا بوسہ دیا، سر جھکایا اور اس انتظار میں کھڑا رہا کہ وہ مجھے جانے کی اجازت دے دے مگر اُس نے مجھے جانے کی اجازت نہیں دی۔ میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ کچھ جھجکی، سہمی اور پھر اُسے نہ جانے کیا ہوا کہ اُس نے بڑھ کے میری پیشانی چوم لی۔ "موہن!" وہ نم ناک آواز میں بولی۔ "ہم طلب کا تماشا دیکھیں گے۔ ہم یہ زہر پینے کی کوشش کریں گے اور نشے میں چور ہو جائیں گے۔"

"لیکن میں نے بہت سی باتیں کہی ہیں۔"

"ہم نے سُنی ہیں۔" اُس نے مسرت سے کہا۔ "تم کب آؤ گے؟"

"ہر آدمی کا دوبارہ ملنا ایک حادثہ ہے۔"

"ہم تمھارا انتظار کریں گے، چاہے جگ بیت جائیں۔"

"نہیں" میں نے وحشت میں کہا۔ "کنول دیوی! میری ایک بات سُنیے۔"

"ضرور، ہم مشتاق ہیں۔"

"میری عمر بہت مختصر ہے، میں جلد ہی مر جاؤں گا۔"

"ہم نہیں سمجھتے کہ تمھارا مطلب کیا ہے؟" وہ ہیبت زدہ آواز میں بولی۔

"شاید میں زیادہ دن نہیں جی سکوں گا۔"

"اوہ"۔ وہ تلملا کے بولی اور ناراضی سے کہنے لگی۔ "آزمائش کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ ہم تمھیں زندہ رکھیں گے۔ تم نے ابھی ہمیں دیکھا نہیں ہے۔" اس کا لہجہ پُرعزم ہو گیا۔ "ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے اندر اتنی قوت ہے کہ ہم کسی کو زندہ رکھ سکیں۔"

"لیکن بہتر ہے کہ آدمی اپنا وصیت نامہ تیار رکھے۔ وہ لوگ خوش بخت ہوتے ہیں جنھیں اپنے عزیزوں کے لیے وصیت کرنے کی مہلت مل جاتی ہے۔ مجھے اس سعادت سے محروم مت کیجیے، میری بات سُن لیجیے۔"

"اُس کی آنکھیں جھل مل کرنے لگیں۔ "ہمیں یہ باتیں ناپسند ہیں۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وعدہ کیجیے کہ اگر میری لکیریں نہ بدلیں تو آپ میری ایک وصیت پر ضرور عمل کریں گی، آپ کی طلب کا عمل جاری رہے گا۔ وہ شخص کہیں نہ کہیں موجود ہو گا جس کی آنکھوں میں آپ محوِ خرام ہوں گی جن میں آپ کی آگ روشن ہو گی۔ وہ آنکھیں آپ کو نظر آ جائیں گی بشرطیکہ آپ کی تلاش ہر آلودگی سے مستثنا ہو۔ میری روح کی طمانیت کے لیے ایسا ضرور کیجیے۔"

اُس کے چہرے پر سارے بدن کا خون سمٹ آیا اور آنکھوں میں جیسے کوئی تنکا پڑ گیا۔ وہ مجھ سے گلے مل کے اپنے آپ کو کھو بیٹھی۔ "اپنے لفظ واپس لو۔" اُس نے بے قابو تمکنت سے کہا۔

"میں واپس لیتا ہوں۔" میری سراسیمہ آواز ابھری۔

"ورنہ ہمیں بھی بہت کچھ آتا ہے۔" وہ جلال سے بولی۔ اُس کا بدن میری بانہوں کے حلقے میں تھرتھرا رہا تھا اور مجھ میں زمین پر قائم رہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔



رات گہری ہو گئی تھی۔

میری گاڑی لڑکھڑاتی ہوئی شہر کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ چوک سے آگے پرکاش بھون جانے والی سڑک کے کنارے ایک سنسان جگہ گاڑی ٹھیرا کے میں نے اسٹیرنگ پر سر ڈال دیا۔ ایک دن اور غروب ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی وہیں چھوڑ کے چوک کے ڈاک خانے جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں سے مجھے کرنل کو اطلاع دینے کے لیے فون مل سکتا تھا۔ مجھے اُس سے کہنا تھا کہ اب اُس کے حکم کی تعمیل کا وقت آ گیا ہے، مجھے اپنی تحویل میں لے لو لیکن میرا ارادہ

گاڑی میں نڈھال پڑا رہا۔ ابھی حجت تمام نہیں ہوئی تھی۔

میں جس وقت ملاقاتی کمرے میں داخل ہوا میرے ماتھے میں چھناکا ہوا۔ وہاں دنیش اور پاروتی کے علاوہ بڑی حویلی کی واردات کی تفتیش کرنے والے تینوں افسران بھی موجود تھے۔ میری آمد سے اُن کے ہونٹوں پر لرزہ طاری ہوا۔ میں نے توجہ نہیں دی اور سرسری انداز میں سلام کرتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا لیکن ایک افسر کی آواز نے میرے قدم راستے ہی میں ٹھٹکا دیے۔ "مسٹر موہن!" وہ دھمکی اور معذرت خواہی کے ملے جلے لہجے میں بولا۔ "ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔"

میں نے مڑکے اُن کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ یکایک وہ افسر اپنی نشست سے اُٹھ کے میرے نزدیک آگیا جس کا نام سراج تھا۔ وہ ہلکی آواز میں بولا۔ "ہمیں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ہمارا خیال ہے آپ کا بیان آپ کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔"

"مگر کس بات کا بیان؟" میں نے ترشی سے پوچھا۔

تینوں افسروں نے مضطرب ہوکے پہلو بدلے اور دنیش کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔ اُن میں سے ایک نے سرد شائستگی سے کہا۔ "مسٹر موہن! آپ کو راجے پور میں ہماری آمد کا مقصد معلوم ہے۔ مسٹر سراج نے بیان کا لفظ غلط کہا ہے۔ ریاست کے موجودہ حالات پر ہم آپ سے چند سوال کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے پرکاش بھون، ریاست کے مختلف لوگوں اور بڑی حویلی کے مکینوں سے انٹرویوز کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ اس بار کوئی نتیجہ ضرور برآمد ہو۔ اس ریاست میں آپ بھی ایک خاصے مشہور آدمی ہیں۔"

"میں احتجاج کرتا ہوں۔ آپ کا لہجہ معاندانہ ہے۔" میں نے آواز بلند کی۔ دنیش اور پاروتی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "آپ پہلے اپنا لہجہ درست کیجیے۔"

افسر سوشیل کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اُس کے ساتھی کیول نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ایسا محسوس کیا لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں، ہمیں ریاست کے ہر شخص سے سوال کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، تاہم ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہر قسم کا تعاون کریں گے۔"

"مجھے یاد ہے۔" میں نے اُن کے سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔ میں نے آپ سے کچھ اور بھی کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ آپ کو بہت دُور تک جانا ہوگا۔ زمین کھودنی ہوگی۔ جڑیں اندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ نے شاید میری بات پر توجہ نہیں دی ورنہ آپ پولیس کے اس فرسودہ طریقۂ کار کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتے۔ مجھ سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"ہم نے ہر پہلو پر نظر رکھی ہے۔" کیول مسکرا کے بولا۔ "اور ہم اسی سلسلے میں آپ سے چند باتیں کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔"

"کیا یہ لازم ہے؟" میں نے تند لہجے میں پوچھا۔

پاروتی نے درمیان میں دخل دیا۔ "موہن! انھیں اس کا اختیار ہے۔"

"مہارانی پاروتی صحیح کہہ رہی ہیں، ہمیں اس کا اختیار ہے اور ہمیں یہاں تک اختیار دیا گیا ہے کہ ہم سوال کرنے کا مقام اور انداز ضرورت کے مطابق خود طے کریں۔"

"اوہ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہاں تک! بلاشبہ آپ کو بڑے وسیع اختیارات حاصل ہیں مگر ضروری نہیں کہ اُن کا اطلاق ہر شخص پر ہوتا ہو یا ہر شخص یہ اطلاق قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

دنیش تجسّس اور دلچسپی سے میری باتیں سُن رہا تھا لیکن اب وہ بڑبڑ ہونے لگا۔ اُس نے آنکھ کے اشارے سے مجھے پُرسکون رہنے کی تلقین کی۔

"ہم آپ کی باتوں سے کیا نتیجہ اخذ کریں؟" افسر سراج نے کبیدگی سے پوچھا۔ "ہمیں احساس ہے کہ یہ ایک معزز راج کمار کا محل ہے۔"

"اس احساس کا شکریہ لیکن آپ ان کی موجودی میں بھی کوئی نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں۔" میں نے صاف آواز میں کہا۔

"شاید یہ موزوں جگہ نہیں ہے۔" افسر سوشیل کے لہجے میں برہمی آگئی اور اُس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرکے کہا۔ "مسٹر موہن کی بات اس حد تک درست ہے کہ یہاں ہم وقت ضائع کررہے ہیں، ہمارے پاس جگہوں کی کمی نہیں ہے لیکن ہم راج کمار دنیش سے توجہ کی درخواست کرتے ہیں۔"

"اور آپ سمجھتے ہیں کیا وہ یہ ہدایت دے دیں گے کہ میں آپ کے بے معنی اور لاحاصل سوالوں کے لیے آمادہ ہو جاؤں؟ جنابِ والا! بس کیجیے میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور نہ میرے دماغ میں اتنی قوت ہے۔" یہ ذکر چھوڑیے لفظوں کی اس آنکھ مچولی سے نہ پہلے کچھ حاصل ہوا ہے، نہ اب حاصل ہونے کی اُمید ہے۔ ازراہِ کرم کوئی نئی بات کیجیے۔ کہیے، راجے پور آپ کو کیسا لگا؟ یہاں کے مناظر بہت دل کش ہیں، ہر طرف سبزہ ہے۔ شکار کثرت سے ہے اور ہر قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔"

"شکریہ۔" سراج نے کہا۔ "ہمیں اجازت دیجیے راج کمار؟"

"کیوں؟" دنیش ہڑبڑا کے بولا۔

"بس اب اجازت دیجیے، ہمیں موہن داس صاحب کو کسی اور جگہ زحمت دینی ہوگی کیوں کہ ان کے تعاون کے بغیر شاید مسائل اتنی آسانی سے حل نہ ہوں۔" سراج صریحاً طنزیہ لہجے میں بولا۔ "موہن داس صاحب کے بارے میں اب تک ہمیں جو تعارف حاصل ہوا تھا، وہ کچھ کم ہی معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت خاصی دلچسپ ہے۔ ان سے دوبارہ ملاقات کرکے خوشی ہوگی اور ہمیں اُمید ہے کہ یہ ملاقات جلد ہی ہوگی۔"

"اور یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔"

"موہن!" پاروتی نے مجھے تنبیہی انداز میں پکارا۔

"یہ ہمارے اختیار کے اطلاق پر منحصر ہے۔"

"آپ کو شرمندگی ہوگی صاحبان!" میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "میں آپ سے گزارش کروں گا کہ اپنے اختیار کا استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح غور و فکر کر لیجیے گا اور بہتر یہی ہے کہ پہلے اِدھر اُدھر اچھی طرح ہاتھ پاؤں مار لیجیے۔ پھر آخر میں میرے پاس آجائیے گا۔ یہ بات میں گزشتہ تجربوں کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کیونکہ اس سے پہلے بھی آپ جیسے کئی معزّزین نادم ہوچکے ہیں۔ آپ اس وقت میرے گھر موجود ہیں اور راج کمار دنیش چندر میرے آقا، میری آنکھوں کے سامنے بیٹھے ہیں، کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید مجھ سے آپ کا یہ لہجہ برداشت نہ ہوتا۔"

"آپ نے بہت بڑی بڑی باتیں کہہ دی ہیں۔" سراج نے تیور سے کہا۔ "زبان آپ نے کھلوائی ہے اور جب یہ حجاب ایک بار ٹوٹ ہی چکا ہے تو پھر تکلّف کیسا؟ مسٹر سراج! مسٹر کپول! مسٹر سونیل! آپ بہت لائق لوگ ہیں، آدمی آدمی کا فرق آپ کو جاننا چاہیے، تھوڑے کہے کو بہت جانیے۔ یہ ایک ریاست ہے، یہ بنیادی بات آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ یہ انٹرویوز تو بہت بعد کی باتیں ہیں، پہلے آپ معاملہ تو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔"

دنیش نے اب تک ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ پارو سخت اضطراب کے عالم میں بیٹھی تھی۔ وہ بار بار مجھے اشارے کر رہی تھی اور خوں خوار نظروں سے گھور رہی تھی اور جب کچھ نہیں بنتا تھا تو گردن جھکا لیتی تھی، جانے سے پہلے وہ خاصے مشتعل ہوگئے تھے پھر بھی انھوں نے رخصت کے وقت دنیش کا احترامِ ملحوظ رکھا۔ میں انھیں اس بار راہ داری تک چھوڑنے بھی نہیں گیا۔ اُن کے جاتے ہی پارو نے دنیش کی پروا نہیں کی مجھ پر بگڑ پڑی۔

"کیا تم ہوش میں ہو؟" اُس نے طیش میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا میں نے کوئی غلط بات کی ہے؟"

"جی نہیں، آپ نے ہر بات درست فرمائی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ تمھیں کیا ہوگیا تھا۔ تمھیں معلوم ہے وہ کون لوگ تھے اور انھیں کس مقصد سے رلجے پور بلایا گیا ہے۔ نہیں نہیں، تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔" اُس کا چہرہ غصّے سے تمتمانے لگا۔ "کیوں دنیش! تم کچھ نہیں بولتے؟"

دنیش نے ایک ٹوٹی ہوئی انگڑائی لی۔ "موہن کی باتیں مجھے پسند آئیں مگر وہ واقعی بہت حیرت انگیز تھیں۔ میں انھیں بہت تجسس سے سُن رہا تھا، مجھے یقین ہے کہ موہن پوری طرح ہوش میں تھا۔ اس نے بے سبب زبان نہیں کھولی ہوگی۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو دنیش!" پارو ناراضی سے بولی۔ "تم نے ان باتوں کے نتائج پر غور نہیں کیا؟ اوہ۔" وہ ہاتھ ملنے لگی۔ "یہ دماغ کی خرابی، بے توازنی اور بدحواسی کا بڑا شدید مظاہرہ تھا۔ موہن مسلسل انھیں اُکسا رہا تھا۔ یہ بے ہودگی تھی، سخت قسم کی غلطی، ناقابلِ تلافی۔ موہن! تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ چیخ کر بولی۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"تمھیں نہیں معلوم؟" وہ دبے دبے سے بولی۔ "ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تم دانستہ اُنھیں تنگ کر رہے ہو۔ تم نے بات بڑھائی۔ اُنھوں نے تم سے کوئی غلط مطالبہ نہیں کیا تھا، اِس میں بُرا ماننے کی کیا بات تھی؟ اب دیکھنا، شاید وہ صبح کا بھی انتظار نہ کریں۔ اُنھیں رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ وہ اپنے اختیار کی ایک شان دار مثال پیش کریں گے۔"

"چھوڑیے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "ایسا نہیں ہوگا۔"

"کس بنیاد پر؟" وہ بھڑک اُٹھی۔

"آپ اطمینان کیجیے مہارانی!" میں نے سکون سے کہا۔ "جو ہونا ہے وہ تو اب ہو ہی جائے گا، جو بات منہ سے نکل گئی اُس پر بعد میں پشیمانی سے کیا حاصل۔ دل کی گرانی دُور کیجیے۔" میں یہ کہتا ہوا خواب گاہ میں آگیا۔ وہاں میں نے خفیہ جگہ ٹٹول کے چابیاں برآمد کیں اور الماری کھول کے ایک پستول جیب میں ڈال لیا۔ پارو ابھی تک دنیش سے جھگڑ رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آگیا کیونکہ مجھے اپنے ناراض دماغ سے عاجزی کرنی تھی۔ صرف ہتھیار پاس رکھنے سے کچھ نہیں ہو جاتا۔



ملاقاتی کمرے سے تیز آوازیں آ رہی تھیں۔ شاردا بھی واپس آگئی تھی۔ پارو اُسے میری یاوہ گوئی کی داستان سُنا رہی تھی اور دنیش سے اصرار کر رہی تھی کہ مجھے کہیں روپوش کر دیا جائے۔ کہہ دیا جائے کہ میں بھون میں موجود نہیں ہوں۔ وہ دنیش سے خفا تھی کہ اُس نے میری زبان کی لگام کیوں نہیں پکڑی اور اب اُسے مہذب انداز میں حکام سے موہن داس کے رویّے کی لیپا پوتی کر دینی چاہیے۔ پارو کا اندیشہ بے سود تھا مگر میں اُسے یہ بتا نہیں سکتا تھا کہ شاید اب وہ لوگ بھون کا رُخ نہ کریں۔ رات کے آخری پہر میں جب شاردا میری پاسبانی سے تھک کے اور میری نیند سے مطمئن ہو کے سو گئی تھی، میں بے آواز قدموں سے عقبی راستے کے ذریعے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا مگر باغ کا طواف کر کے واپس آگیا۔ بھون سے باہر نکلنا آسان تھا مگر شاد کام واپس آنے کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ رتی کی پوٹلی دوبارہ اپنی جگہ چھپا کے میں پارو کے نخلستان میں حاضر ہوا۔ میرا خیال درست تھا، شب بیداری اُس نے اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔ مجھے دیکھا تو میرے وجود پر اُسے یقین نہیں آیا۔ اُس نے جھٹ بازو وا کیے اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیا، میں بہت تھکا ہوا تھا، اُس کی زلفوں کی چھاؤں میں سر رکھا تو غفلت طاری ہو گئی۔ صبح کا گجر بجنے تک وہ مجھے اپنی گرم آغوش کے بستر میں سمیٹے بیٹھی رہی اور میرے سر پر اُس کی اُنگلیاں تھرکتی رہیں، میں اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ایک رات اور گزر گئی۔ ایک دن اور طلوع ہو گیا۔ وہ مجھے اپنے محل کے کسی کمرے میں چھپا لینا چاہتی تھی مگر میں نے اُسے تسلی دی کہ وہ اپنا خوف دل سے نکال دے، کوئی نہیں آئے گا۔ وہ کُریدنے لگی۔ کیوں نہیں آئے گا؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کہنے لگی، مجھے بہتا قرمت دو کہ تم اپنی جان، اپنی پارو سے کچھ چھپا رہے ہو۔ میں تمھارا دل ہوں، تمھاری آنکھیں ہوں، اپنے وجود سے کچھ چھپا رہے ہو بگلے! لیکن میرے لیے اپنے وجود سے یہ بات چھپائے بغیر چارہ نہیں تھا۔

کوئی نہیں آیا، ایک دن اور گزر گیا۔ جس اعتبار میں میں نے تینوں افسروں سے گفتگو کی تھی، وہ اب بھی قائم تھا۔ میں نے احتیاطاً رتیا کو فون کر کے اطمینان دلا دیا تھا کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے آنے میں دیر ہو رہی ہے۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے اُس کی آواز شرما رہی تھی۔ میں تصوّر کر سکتا تھا کہ اُس کے چہرے کا کیا حال ہو گا۔ اپنی بیٹی کی سُرخ رُوئی سے کرنل کی اِس کش مکش میں یقیناً کچھ کمی ہوئی ہو گی جو میری روانگی کی اطلاع میں تاخیر کی وجہ سے ہر لحظے بڑھ رہی ہو گی۔

تینوں افسروں نے پلٹ کے خبر تک نہیں لی۔ اُن پر میرے اقبال کا حال منکشف ہو گیا ہو گا۔ پرکاش بھون سے اپنی اقامت گاہ واپس جا کے جب اُنھوں نے پولیس کے اعلا حکام کو میری فوراً طلبی کی ہدایت کی ہو گی تو حکام نے اپنی معذوری ظاہر کی ہو گی، تب اُن کی آنکھیں پھیل گئی ہوں گی۔ وہ حیران، پریشان ہوں گے کہ یہ کیا رمز ہے؟ کہا گیا ہو گا کہ اُوپر کا حکم ہے۔ اُنھوں نے یہ پوچھا ہو گا کہ بھلا کس نے یہ حکم دیا ہے؟ تفصیل بتانے سے گریز کی گئی ہو گی کہ ہم قاصر ہیں، مت پوچھیے۔ کرنل نے اپنے عزیز موہن داس کے لیے ریاست کی پولیس کو تنبیہی اشارہ کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہو گی کہ اب اُسے مزید نہ چھیڑا جائے۔ اشارہ بہت تھا، سبب پوچھنے کی جرأت کس میں ہو گی۔ اِدھر مہاراجا نے، ممکن ہے اپنے ہونے والے مشیر کے لیے پولیس کو محتاط رہنے کی تلقین کی ہو۔ آئی جی تھا، ریاست کی پولیس کا سربراہ، پہلے ہی اس فیاضی پر آمادہ تھا، اب اسے ایک رمزِ آسمانی سمجھا ہو گا۔ یہ سب کچھ کیا تھا، شہر کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ذرا پردہ کر لیا جائے تو دس خون معاف تھے۔ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا، بہار جلد ہی گزر جاتی ہے، یہ خوش خرام وقت پھر واپس نہیں آئے گا۔ قسمت کا یہ ستارہ زندگی میں ایک بار چمکتا ہے، سب ٹھیک ہی ہو رہا تھا اور لوٹ پیٹ کے سب ٹھیک ہو جانے کی توقع تھی، میری معروضات کے بعد راج محل پر بھی سکون طاری ہو گیا تھا۔ دنیش اپنے بھائی نریش چندر کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا، سراغ رساں مٹی کرید رہے تھے مگر اُن کے ہاتھوں میں جان نہیں ہو گی۔ مہاراجا شاردا سے اپنی طلب کے اظہار کے طریقے سوچ رہے ہوں گے۔ پہلا کام اُنھوں نے یہ کیا کہ شاردا کو براہِ راست فون کر کے اُس کا مزاج پوچھا اور پیش کش کی وہ کچھ دنوں کے لیے راج محل میں مہمان ہو جائے۔ اِدھر میں روز رتیا کو فون کرتا تھا۔ ہائی کمان سے آنے والی ٹیم چپ چپاتے

آگئی تھی اور کنزل کی وحشت سوا ہو گئی تھی۔ وقت سُکڑ رہا تھا۔ کئی دن گزر چکے تھے۔ روز باغ میں جانا اور پاگلوں کی طرح فصیل کے گرد گھومنا میرا کام رہ گیا تھا۔ ایک رات میں نے یہ فصیل عبور بھی کر لی اور آدھے راستے سے لوٹ آیا۔ ایک نہیں، دو نہیں، تین تین ریوالور ساتھ تھے مگر وہ ایک شخص نشانے پر نہیں آتا تھا اور اُسی کا تو نشانے پر آنا ضروری تھا۔ پولیس نے لاکھی پور کے کئی بدمعاش آزاد کر دیے تھے۔ ظاہر ہے، انھوں نے پھر کنور کی پناہ گاہ کا رُخ کیا ہو گا۔ انیتا ابھی تک بھون میں موجود تھی لیکن میں نے دانستہ اُس کی طرف نظر اُٹھانے سے گریز کی تھی۔ ایک مرتبہ اُسے دیکھ کے ذہن میں یہ شوشہ اُبھرا کہ اُسے یرغمال بنا کے کنور سے رابطہ قائم کروں مگر کنور اب کے اس اطلاع پر کان نہیں دھرے گا۔ تو کیا سندھیا سے التماس کروں کہ پیاری لڑکی! مجھے معاف کر دو، ایک بار اور کوشش کرو۔ دیکھنا، اب کے رنگے ہاتھوں واپس آنا، مہندی لگا کے آنا۔ اس کے بعد میں چلا جاؤں گا اور تم روٹھی رہنا، پاگل ہو جانا۔

میں کچھ نہیں کر سکا۔ کنزل کے فون سے چھپا چھپا پھرتا تھا مگر ایک دن اُس نے مجھے فون پر طلب کر ہی لیا اور بزرگانہ انداز میں آگاہ کیا کہ اب مزید تاخیر سے پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ میں نے کہا، بس کچھ مہلت اور دے دیجیے، آیا ہی چاہتا ہوں۔ پاروجگ دیپ کی سرگرمیوں کی خبریں سناتی تھی۔ آج وہ راج محل گیا، آج چھاؤنی پہنچا مگر سب بعد کی خبریں ملتی تھیں۔ کوئی ایسی خبر پیاسے کانوں کو سیراب نہیں کرتی تھی کہ آیندہ اُس کے جانے کا کہاں امکان ہے؟ کب؟ اور کہاں؟ پریت اب بہت کم نظر آتی تھی۔ سوچا، اُس کے پاس جاؤں اور کہوں کہ اب تو تمھیں نظرِ ثانی کا موقع مل گیا ہو گا؟ پھر آؤ، مل کے میا کی روح کو آسودہ کریں مگر پریت سے ربط قائم کرنے اور اُسے اس مرحلے تک لانے کے لیے وقت کے اسراف کا امکان تھا اور وقت کی پونجی روز بہ روز کم ہو رہی تھی۔ یہ خبر بھی کنور جگ دیپ سے پوشیدہ نہیں رہی ہو گی کہ تینوں سراغ رساں مجھ سے سوالات کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ اُس طرف لاکھی پور کے بدمعاشوں کی واپسی سے اُس کا غصہ اور حوصلہ اور فزوں ہو گیا ہو گا مگر خلافِ توقع وہ اُس کے اظہار میں بخل کر رہا تھا۔ کئی دن گزر گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی بھر تڑپنا پڑے گا۔



رات کو جب میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ملاقاتی کمرے میں داخل ہوا تو دنیش جاگ رہا تھا۔ میں نے اپنا دریدہ جسم اُس کے قریب ہی ایک صوفے پر ڈھیر کر دیا۔ ”موہن!“ چند لمحوں بعد دنیش کی نرم آواز اُبھری۔ ”ایک شخص تین چار بار فون کر چکا ہے، پتہ نہیں کون ہے۔ میں نے نام پوچھا تو اُس نے فون بند کر دیا۔“

”اچھا!“ میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ ”کون ہو سکتا ہے؟“

”کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس کا لہجہ مقامی تھا، آواز بھاری اور سخت تھی۔“

میں نے منہ لٹکا دیا۔ اس ریاست میں مجھے جانتا ہی کون تھا، کوئی دھمکی باز ہو گا۔ اس قسم کے فون پہلے بھی کئی بار آ چکے تھے۔ میں نے دنیش کے سامنے تجسس سے احتراز کیا۔ ایک پھانس سی چبھ گئی تھی۔ ”کیوں ساجن! حال بہت خراب معلوم ہوتا ہے۔“ دنیش میرے پاس کھسک آیا اور اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔ ”فکر نہ کرو، نریش بس آنا ہی ہو گا۔ کچھ وقت اور سنبھل کے گزار دو۔“ میں نے ہنکاری بھری۔ اُس نے کہا۔ ”میں نے ستارہ کو نہیں بتایا ہے، سُنے گی تو کیا حال ہو گا۔“

”بہت خوش ہو گی۔“ میں نے باچھیں پھیلا کے کہا۔

”ہاں بے حد۔“ وہ خیال آفریں لہجے میں بولا اور میری ناک مروڑنے اور مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ ”میں نے اُسے بڑی مشکل سے سُلایا ہے، تم بھی سو جاؤ، ایک رات اور گزر جائے گی۔“

میں نے سونے کا ارادہ کیا۔ پہلے اُس نے مجھے میرے کمرے تک پہنچا کے شب بخیر کہا پھر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، دوسری گھنٹی پر میں پہنچ گیا۔

”کون؟“ ایک بے لچک اور کھردری آواز گونجی۔

”موہن داس۔“ میں نے تناؤ سے کہا۔

”موہن داس!“ اُس نے تکرار کی۔

”ہاں میں! کون بول رہا ہے؟“

”تمھیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ اچھی طرح کان کھول کے سُن لو تمھاری عورت اور بچہ ہمارے قبضے میں ہے۔ اگر تم انھیں دوبارہ زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو کل دوپہر بارہ بجے تک یہ شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔ شام کو بسوا گھاٹ کے لاری اڈے پر کسی جگہ تمھاری عورت اور بچہ تمھیں مل جائیں گے ورنہ سمجھ لو، اُن کی لاشوں کے ٹکڑے بھون کے دروازے پر پڑے ہوں گے۔ سُن لیا؟“

میرے جسم میں ایک تڑاخا ہوا۔ ”کون بک رہا ہے؟“ میں نے دہاڑ کے کہا۔ فون بے آواز ہو گیا تھا۔ میری رگوں میں خون جم گیا۔ کمرے کی دیواریں ہلنے لگیں اور آنکھوں کے سامنے بے شمار پتنگے ناچنے لگے۔ میں اُچھل کے دروازے سے جا ٹکرایا اور راہ داری پھلانگتا ہوا کھلے میدان میں بھاگنے لگا۔ کوارٹر کی کُنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے دھڑکتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے کھولا۔ اندر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ایک ایک کونا کُریدا۔ چارپائی کے نیچے دیکھا، آوازیں دیں لیکن وہاں کوئی ذی نفس نہیں تھا۔ ہر کونے میں ڈالی اور گڈے کی خوشبو موجود تھی اور ہر سمت اُن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میں تھم ہار کے وہیں بیٹھ گیا۔ چند لمحے سناٹے میں گزر گئے مگر سینے میں پھر گرج ہونے لگی اور میں کوارٹر سے باہر آ کے پھر بھاگنے لگا۔ راہ داری کے دربانوں

نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں اُنھیں دھکیلتا ہوا گرتا پڑتا ملاقاتی کمرے میں پہنچ گیا۔ دنیش کے دروازے پر دستک دینے کے لئے میرے ہاتھ اُٹھے اور اُٹھے رہ گئے۔ میں صوفے پر گر کے ہانپنے لگا۔ یکایک میری اندھی آنکھوں کو فون نظر آ گیا۔ میں نے اُسے اچک لیا اور میری انگلیاں ڈائل پر تڑپنے لگیں لیکن میں نے ریسیور پھر کریڈل پر دھر دیا۔ میری سانسیں اُکھڑی ہوئی تھیں پہلے میں نے انھیں استوار کرنے کا جبر کیا اور اپنے آپ کو سرزنش کی کہ اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہو گا پھر میں نے فون دوبارہ اُٹھا لیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی کسی عورت کی غنودہ آواز آئی۔ میں نے فون بند کر کے فوراً دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار آواز مردانہ تھی۔ میں نے اضطراب سے پوچھا "کون؟"

"جگ دیپ" دوسری طرف سے متجسس آواز اُبھری۔ میں نے ایک آن توقف کیا "کنور جگ دیپ؟"

"ہاں۔ کون ہے؟" اُس نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

"کنور جگ دیپ مجھے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے تم فوراً پہچان جاؤ گے۔ ناموں سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں" میں نے اپنے لہجے کی گرمی دُور کرنے کے لیے گہری سانس لی "میں اس ریاست سے نہیں جاؤں گا۔ کنور! عورت اور بچہ واپس کر دو اور سمجھ لو کہ اگر اُنھیں ایک خراش بھی آئی تو بڑی حویلی اپنی جگہ نظر نہیں آئے گی، کنور! ابھی تمھاری کئی بہنیں زندہ ہیں تمھیں اُن کی زندگی اور عزت کا خیال ہونا چاہیے۔ اسے محض دھمکی مت سمجھنا، تمھیں پچھلے تجربے یاد ہوں گے"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ غضب ناک آواز میں بولا "کیسا بچہ! کیسی عورت؟ تم نے غلط جگہ فون کیا ہے"

"میں جانتا ہوں کہ میں نے کون سی جگہ فون کیا ہے کنور جگ دیپ! تم نے ہمیشہ میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے اور ٹھوکر کھائی ہے۔ میں ابھی تک موجود ہوں، تمھیں ہوش آ جانا چاہیے۔ تم نے جو یہ رکیک حرکت کی ہے، اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں پہلے ہی تمھارا خون پینے کے لیے بے چین ہوں۔ اس وقت ایک بج رہا ہے۔ میں تمھیں دو گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ دو گھنٹے کے اندر اندر اگر وہ دونوں یہاں واپس نہ آئے تو یہ مت سمجھنا کہ میں کل دوپہر اس شہر سے رخصت ہو جاؤں گا، تم اس عورت اور بچے کی لاش صدر دروازے پر پھنکوا دینا اور اس کے بعد اپنی لاشیں گننا" میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔



مجھ سے ایک گھنٹہ بھی انتظار نہیں ہو سکا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ کنور جگ دیپ کے لیے تو دو صدیاں بھی کم ہیں۔ نہ جانے میں نے اُسے یہ مہلت کیوں دی ہے لیکن اس موقع پر میں اُس سے اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اُس کی بہن اینما بھون میں موجود تھی۔ ممکن ہے، کنور کو پچھلے واقعات یاد آ جائیں۔ ملاقاتی کمرہ جل رہا تھا اور میرے رگ و پے میں گرم خون کھول رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل تمام دو گھنٹے گزارے۔ اس عرصے میں میں نے رسّی کی پوٹلی باہر نکال لی تھی پستول تین تھے۔ ایک بے آواز بھی تھا۔ محدود تعداد میں کارتوس بھی گتے کے پیکٹ میں موجود تھے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ڈالی اور گڈا کنور کے نرغے میں تھے اور کنور سے کچھ بعید نہیں تھا۔ دن کا انتظار فضول تھا۔ کنور جگ دیپ کی نظر میں آدمی کی بے وقعتی کا مجھے خوب اندازہ تھا۔ وہ ڈالی اور گڈے کو مار ڈالے گا اور پھر میں چاہے بڑی حویلی کو آگ لگا دوں مگر گڈا اور ڈالی، دونوں واپس نہیں آئیں گے۔ میرا راجا گڈا ننگے فرش پر بلک رہا ہو گا اور اُس کی ماں کا لباس اُس کی آنکھوں کے سامنے تار تار کر دیا گیا ہو گا۔ لاٹھی لوہے کے بدمعاش اُس کا جسم نوچ کھسوٹ رہے ہوں گے۔ اُس کی چیخیں میرے کانوں میں ٹوٹ رہی تھیں۔

باغ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کوارٹر میں ایک نظر جھانک کے دیکھ لیا اور اپنے آزمودہ درخت سے رسّی کا ایک سرا باندھ کے دوسرا سرا فصیل کے باہر پھینک دیا۔ فضا میں ہر سو بیزار اندھیرا تنا ہوا تھا۔ میں آندھی کی طرح بڑی حویلی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ دُور سے مجھے صدر دروازے کے باہر دو پہرے دار نظر آئے۔ میں آہستہ آہستہ فصیل سے چپکتا ہوا اُن کے نزدیک پہنچ گیا۔ دونوں نشانے پر تھے اور میرے ہاتھ میں بے آواز پستول موجود تھا لیکن اُسی لمحے کسی نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ میں نے پلٹ کے گولی داغ دی مگر وہاں ایک ہیولے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں "آؤ چلو، بس اب چلو" کسی کی مترنّم آواز گونجی۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ کیچو کی آواز تھی۔ میں نے اُسے دبوچنا چاہا لیکن ہیولا مجھ سے دُور ہوتا گیا۔ میں اُس کے تعاقب میں بھاگتا رہا۔ پھر جب ہر طرف روشنی پھیلی تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ میں کسی اجنبی جگہ نکل آیا تھا۔ دُور دُور تک کسی آبادی کا اور کسی آدم زاد کا نشان نہیں تھا۔ ہر طرف اُونچے اُونچے پہاڑ تھے، اُن پر گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔



امیر بیلے

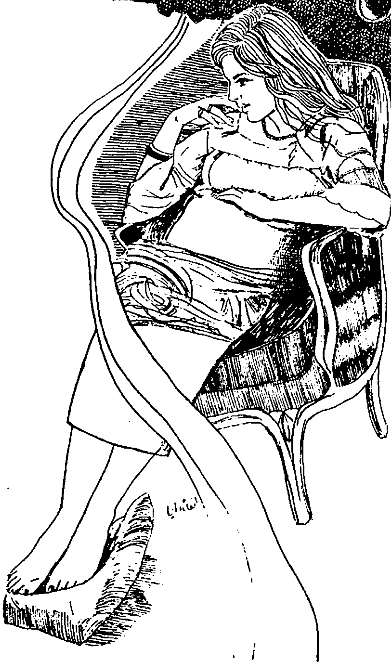
سب رنگ
کا سب سے
مقبول سلسلہ

میر جمشید عالم کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات
فرض کیجیے اس نوجوان کی جگہ آپ ہوتے۔
باقی آئندہ شمارے میں؟

خاص کہانی کے ان صفحات کی تمام روایتوں کے ساتھ
خوش ذوق قارئین کے لیے
اس ماہ کی خاص کہانی







ایک خوبصورت اور مکمل تحریر

مائیک مِلر ★ اظہر کلیم

اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ تمام تک نِک کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ رقصاں تھی، اب اُس میں پھیکا پن پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے دبا دبا خوف ظاہر ہو رہا تھا اور چہرے پہ آہستہ آہستہ سختی پیدا ہو رہی تھی۔ اُس نے پیغامات کا وہ سلسلہ دوبارہ پڑھا جو اُسے ائرلائن کی ٹیلی ٹائپ مشین کے ذریعے موصول ہوا تھا۔

اُس کی بیوی لِنڈا نے یہ محسوس کر لیا کہ نِک خوش دلی سے سیٹی بجاتے بجاتے یکایک خاموش ہو گیا ہے۔ لِنڈا آہستگی سے چلتی ہوئی اُس کے پیچھے پہنچی۔ وہ شوہر کے کندھے پر جھک کے پیغامات غور سے پڑھنے لگی۔ پیغامات پڑھ کے اُس کی پیشانی پر بھی تفکر کی سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ وہ گزشتہ دو ہفتوں سے اپنی کوکھ میں ایک بوجھ اُٹھائے ہوئے تھی۔ اُس بوجھ کی وجہ سے تو اُس کے چہرے پر تفکر کی سلوٹیں کبھی نمودار نہیں ہوئی تھیں مگر اس

وقت وہ بھی اپنے شوہر کی طرح پریشان نظر آنے لگی۔ "نک۔۔۔" اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ "کیا۔۔۔ کیا ہم کچھ نہیں کر سکتے ؟"

"معلوم نہیں۔" نک نے مایوسی سے سر ہلایا۔ اُس نے کوٹ اُتارا اور پیغامات گھورتا ہوا ٹیلی ٹائپ مشین کے سامنے بیٹھ گیا۔ "لیکن کم سے کم ہمیں یہاں اپنی موجودگی سے انھیں مطلع ضرور کر دینا چاہیے۔"

دونوں میاں بیوی آبادی سے پندرہ میل دُور ایک ویران ہوائی اڈّے کی عمارت میں بیٹھے تھے۔ یہ ہوائی اڈّا ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ رَن وے تیار ہو چکا تھا اور ہلکے پھلکے طیاروں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ نک اس ہوائی اڈّے کی تعمیرات کا نگراں تھا۔ اڈّے کی تکمیل کے بعد وہ فضائی کمپنی کی جانب سے مینیجر بننے والا تھا۔ اُس نے اِس اڈّے کی تعمیر کے لیے نہایت جاں فشانی سے کام کیا تھا۔ کمپنی اس بات کی معترف تھی۔ یہ ہوائی مستقر آبادی سے دُور پہاڑوں کے درمیان طیاروں کی سہولت کے پیشِ نظر بنایا گیا تھا تاکہ اگر موسم خراب ہو اور وہ کسی دوسری جگہ نہ جا سکیں تو یہاں اُتر جائیں۔ حکومت اِس علاقے میں کئی ترقیاتی منصوبے شروع کرنا چاہتی تھی اِس لیے ہوائی مستقر کی ضرورت خاص طور سے محسوس کی گئی تھی۔ ابھی زیرِ تعمیر ہوائی مستقر کے انتظامات بہت ناکافی تھے۔ برف باری کے موسم کی وجہ سے سرکاری عملہ شام ہی واپس چلا جاتا تھا اس لیے نک اور اُس کی بیوی وہاں بالکل تنہا تھے۔ بے حد نازک معاملہ تھا گو سردی شباب پر تھی اور برف باری کے بعد کی یخ بستہ ہوا اُنھیں ٹھٹھرائے دے رہی تھی پھر بھی اُن دونوں کے چہرے پریشانی اور خوف کے باعث پسینے سے بھیگ رہے تھے۔

"بل شوائٹزر کے ہوائی مستقر سے نک مخاطب ہے۔" اُس نے ٹائپ کیا۔ "میں ایک منٹ پہلے یہاں پہنچا ہوں۔ کیا میری یہ تحریر صاف اور پڑھی جانے کے قابل ہے ؟ میں اب تک موصول ہونے والے وہ پیغامات پڑھ چکا ہوں جو انٹی اور جالمج کے ہوائی اڈّوں سے ٹائپ کیے گئے ہیں۔"

دوسری جانب سے فوراً جواب ملا۔ "تمھاری ٹائپ کی ہوئی تحریر بالکل صاف موصول ہو رہی ہے۔ وہاں کا موسم کیسا ہے ؟ کیا تم ہماری کچھ مدد کر سکتے ہو ؟"

"موسم فی الحال تو ٹھیک ہے۔" اُس نے جواباً ٹائپ کیا۔ "لیکن بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ خدشہ ہے کہ کچھ دیر بعد فضا خراب ہو جائے گی۔ ہوا زیادہ تیز نہیں ہے لیکن اس کیفیت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ہم فرنٹ سسٹم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"کیا تمھاری ٹیلی ٹائپ مشین ٹھیک کام کر رہی ہے ؟" دوسری طرف سے دریافت کیا گیا۔ "کیا تم مکمل صورتِ حال سے آگاہ ہو ؟"

"ہاں میں آخری معائنے کے لیے ائرپورٹ آیا ہوں اور مجھے تمام پیغامات مل گئے ہیں۔ میں صورتِ حال سے پوری طرح واقف ہوں۔" نک نے [illegible] ٹائپ کیا۔

صورتِ حال بہت خراب تھی۔ موسم دن بھر خراب رہا تھا۔ اندرونی پروازوں میں سے چھ پروازیں منسوخ کی جا چکی تھیں۔ لیکن پرواز ۲۷ معمول کے مطابق روانہ ہو چکی تھی۔ پرواز ۲۷ کی پرواز کہیں رُکے بغیر اشٹیبل کے ہوائی اڈّے تک جاری رہتی تھی جس وقت جہاز روانہ ہوا تھا اُس وقت موسم خراب نہیں تھا مگر پھر موسم میں اچانک تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ بارش اور برف باری تیز ہو گئی تھی۔ طوفانی موسم کی وجہ سے اشٹیبل کے ہوائی اڈّے پر کوئی جہاز اُترنا ممکن نہیں تھا۔ پرواز ۲۷ کا پائلٹ موسم کی اس تبدیلی سے لاعلم تھا۔ غالباً اُسے اُمید تھی کہ موسم ویسا ہی خوش گوار ہو گا جیسا اُس کی روانگی کے وقت تھا۔ جہاز اس وقت شمال کے ہوائی مستقر کی طرف بڑھ رہا تھا اور نصف گھنٹے بعد انٹی ائرلینڈ پہنچنے والا تھا مگر وہاں اب اُس کا اُترنا ممکن نہیں تھا۔ اُس بدنصیب جہاز کے پاس نعم البدل کے طور پر کوئی دوسرا ائرپورٹ بھی نہیں تھا۔

"ٹیلی ٹائپ مشین کے قریب ہی رہو۔" نک کو اشٹیبل کے ہوائی اڈّے سے پیغام موصول ہوا۔ "ہم جلد ہی تمھیں ہدایات دیں گے انتظار کرو۔"

نک کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ اُس نے ایک طویل سانس لی اور کئی منٹ بعد پہلی بار اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ "کچھ پتہ بھی ہے ؟" اُس نے فکرمندی سے کہا۔ "ہم یہاں پھنس کے رہ گئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس مصیبت میں تم بے وجہ میرے ساتھ گھسٹ رہی ہو۔ بچّے کی پیدائش کے آخری دن ہیں۔ ان دنوں میں تمھیں آرام کی شدید ضرورت ہے۔ مجھے اپنی بے پروائی پر افسوس ہو رہا ہے۔ میں یہ آخری معائنہ تنہا بھی کر سکتا تھا اور اِسے نظرانداز بھی کیا جا سکتا تھا لیکن چند ضروری کاغذات یہاں رہ گئے تھے اس لیے آنا بہت ضروری تھا۔"

لنڈا خوش دلی سے مُسکرانے لگی۔ اُس کے چہرے سے سختی اور پریشانی سے تفکر کی علامات بڑی حد تک ختم ہو گئی تھیں۔ "نک ڈارلنگ ! احمقانہ باتیں نہ کرو۔" اُس نے محبت سے کہا۔ "یہ بات ذہن میں رکھو کہ یہاں آنے کے لیے خود میں نے اصرار کیا تھا۔" وہ دروازے کی طرف گھوم گئی۔ "کیا مسافروں کے سروس کاؤنٹر پر کافی بنانے کا سامان موجود ہے ؟"

"ہاں۔" نک نے کہا۔ وہ کرسی پر مزید پیچھے جھک گیا۔ اُس کی نگاہ لنڈا پر جمی ہوئی تھی۔ لنڈا مواصلات کے کمرے سے سروس کاؤنٹر کی طرف جانے لگی تاکہ اس ٹھٹھرے ہوئے موسم میں اپنے شوہر کے لیے کافی کا بندوبست کر سکے۔ نک ٹومنٹی سیون جہاز کے مسا[illegible] سے پوری طرح مطمئن تھا۔

نک کی زندگی خوش گوار [illegible] گزر رہی تھی۔ وہ ایک خوش قسمت آدمی تھا کیونکہ اُسے اپنی بیوی کی طرف سے بے پناہ محبت حاصل تھی اور اُس کا مستقبل نہایت تابناک تھا۔ وہ اس فضائی کمپنی میں گزشتہ سات سال سے ملازم تھا۔ اس ملازمت میں اُس نے شدید محنت کی تھی اور اب اُس کی محنت رنگ لانے والی تھی۔ وہ عنقریب ایک بہت بڑے عملے کا

افسر بننے والا تھا۔

ہوائی مستقر مکمل ہوتے ہی شہر سے یہاں تک ایک سڑک بھی تعمیر ہونے والی تھی۔ یہاں کا رن وے ابھی نہیں کھولا گیا تھا البتہ تجرباتی طور پر چھوٹے طیاروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہوائی مستقر سے شہر تک نوّے منٹ کا ایک کچا راستہ تھا لیکن اُس میں جا بجا گڑھے پڑ گئے تھے اس لیے نوّے منٹ کے بجائے عموماً دو ڈھائی گھنٹے کا تکلیف دہ سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ مشکل نئی سڑک بن جانے سے پہلے ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ تقریباً ایک مہینے بعد نِک کا عملہ کام شروع کرنے والا تھا۔ نِک اُسی خوش گوار وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔

اُس کی زندگی خوشیوں سے لبریز تھی۔ اُس کی بیوی لِنڈا نے اُس پر محبت کے مہکتے ہوئے پھول نچھاور کر کے اُسے خود پر ناز کرنا سکھا دیا تھا اور اب آخر ہزار ارمانوں کے بعد لِنڈا کی گود بھی ہری ہونے والی تھی۔ لِنڈا ایک صحت مند عورت تھی۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق ایک ہفتے قبل اُن کے ہاں ایک جیتا جاگتا ہنستا کھیلتا کھلونا آنے والا تھا لیکن زچگی میں ایک ہفتے کی تاخیر ہو گئی تھی۔ یہ امر پریشانی کا باعث تھا لیکن لِنڈا اس معاملے میں ایک غیر معمولی عورت ثابت ہو رہی تھی۔ اُس نے زبردست ضبط و برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ بعض حالات میں ایسا ہو جاتا ہے اور یہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر کی یقین دہانی اور لِنڈا کی صحت دیکھتے ہوئے نِک مطمئن تھا کہ کوئی ناخوش گوار حادثہ پیش نہیں آئے گا اور اُس کی خوشیاں برقرار رہیں گی حالانکہ اس سے قبل تین بار اسقاط ہو چکا تھا۔ ہر اسقاط کے موقع پر لِنڈا کی صحت بہت گِر گئی تھی لیکن اس بار وہ دونوں بچّے کی پیدائش کے سلسلے میں پُر اعتماد اور مطمئن تھے۔

نِک نے کنکھیوں سے نیم وا دروازے کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔ اُس کی سماعت لِنڈا کی گنگناہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور کافی کی بُو سے سردی کا احساس ختم ہو رہا تھا۔ نِک کے دل میں بے اختیار یہ خیال پیدا ہوا کہ کاش لِنڈا نے اُس کے ساتھ آنے کی ضد نہ کی ہوتی۔ لِنڈا نے اُس کے ساتھ آنے کی ضد کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ گھر میں تنہا بیٹھ کر اُس کا انتظار کرتے کرتے بیزار ہو جاتی ہے۔ نِک کو اس امر کا احساس تھا کہ تنہا عورت گھر کی چار دیواری میں واقعی گھٹن کا شکار ہو جاتی ہے۔ نِک کو صرف چند کاغذات لینے کے لیے یہاں آنا تھا۔ وہ لِنڈا کو یہ سوچ کر ساتھ لیتا آیا تھا کہ کچھ دیر باہر گھومنے سے اُس کی طبیعت بہل جائے گی۔ برف باری ختم ہو چکی تھی اور ہوا بھی سست تھی اس لیے وہ لِنڈا کی خواہش رَد نہیں کر سکا تھا۔ وہ زیرِ لب مسکرانے لگا۔ لِنڈا کی رفاقت میں ڈیڑھ گھنٹے کا اُکتا دینے والا سفر کتنی آسانی سے پلک جھپکتے میں طے ہو گیا تھا۔

ٹیلی ٹائپ مشین کام کرنے لگی۔ اسٹیل سے جیک کا پیغام آیا۔ ”کیا تمھارے ہوائی میدان کی بتیاں ابھی تک روشن ہیں؟“ جیک آپریشن وائس پریذیڈنٹ تھا۔

”ہاں۔“ نِک نے جواباً ٹائپ کیا۔ ”لیکن پاور کا مسئلہ پریشان کر رہا ہے۔ شہر سے بجلی کی فراہمی اگلے ہفتے سے پہلے شروع نہیں ہو سکتی۔“ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دراز سے ایک فائل نکالی اور فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بلڈنگ کے ٹھیکے دار کی رپورٹ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اُس نے مشین کے ذریعے جیک کو بتایا۔ ”اس وقت ہوائی اڈّے پر صرف ایک چھوٹا گیسولین جنریٹر کام کر رہا ہے۔ یہ جنریٹر دفتر میں روشنی کے لیے کافی ہے۔ باہر تجرباتی رن وے پر ڈیزل سے چلنے والا جنریٹر ہے۔ وہ آج سے دو روز قبل تجرباتی طور پر مسلسل تین بار رن وے پر رات کے وقت استعمال کیا گیا تھا۔ آیندہ تین ہفتے تک کوئی مشق نہیں ہونی تھی اس لیے ڈیزل منگوانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس وقت جتنا ایندھن ہے اُس سے جنریٹر صرف دس منٹ سے پندرہ منٹ تک کار آمد ثابت ہو گا۔ رن وے پر اندھیرا ہے۔ میں دہراتا ہوں۔ ڈیزل صرف دس منٹ سے پندرہ منٹ تک کام کرے گا اس کے بعد جنریٹر ناکارہ ہو جائے گا۔“

”ریڈیو کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“ ٹائپ کے ذریعے سوال کیا گیا۔ ”کیا مواصلاتی سلسلہ قائم ہو چکا ہے؟“

”جی نہیں۔“ نِک نے جواب دیا۔ ”اس وقت صرف ایک ٹیلی ٹائپ مشین ہے۔ یہاں تو شہر سے رابطہ قائم کرنے کے لیے فون بھی نہیں ہے۔“

”تمھاری اطلاعات کی روشنی میں تمھیں کچھ ہدایات دی جاتی ہیں، غور سے پڑھتے رہو۔“ ہدایات ٹائپ ہونے لگیں۔

★

ہدایات سادہ اور کافی تھیں۔ اُن کے مطابق نِک کو ہوائی مستقر پر ڈھائی گھنٹے مزید رکنا تھا۔ اِس مدت میں جہاز اپنی منزل پر پہنچ سکتا تھا۔ وہ وہاں اُترنے میں کامیاب ہو جاتا تو خیر ورنہ وہ بِگ شوالڈرز کے اس عارضی اور زیرِ تعمیر اڈّے کے سوا کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ جہاز میں جتنا ایندھن تھا اُس سے وہ بِگ شوالڈرز ہی تک پرواز کر سکتا تھا۔ چونکہ نِک ریڈیو کے ذریعے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا اس لیے اُسے محض جہاز کی روشنی سے اُس کا پیغام سمجھ کر نیچے اُترنے میں مدد دینی تھی۔ جہاز جیسے ہی اڈّے کے اُوپر پہنچتا، نِک کو رن وے کی بتیاں روشن کرنی تھیں۔ یہ ایک پہاڑی ہوائی اڈّا تھا اس لیے جہاز پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑوں کے اُوپر ہی پرواز کر سکتا تھا۔ پائلٹ کو دس سے پندرہ منٹ میں رن وے کی بتیاں دیکھ کر نیچے اُترنا تھا۔ یہ اگرچہ ایک مشکل منصوبہ تھا لیکن اس پر عمل کیا جا سکتا تھا اور اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ”کیا تم سب کچھ سمجھ گئے ہو؟“ نِک سے دریافت کیا گیا۔

نِک نے جواباً ٹائپ کیا۔ ”میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں لیکن اس وقت میری بیوی میرے ساتھ ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ اُسے شہر کس طرح واپس بھیجوں۔ وہ حاملہ ہے، کار نہیں چلا سکتی۔ اس وقت پندرہ میل

کے فاصلے تک ہم دونوں کے سوا کوئی ذی رُوح نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو واقعی ایک مشکل مسئلہ ہے۔" نک نے جوابی تحریر پڑھی پھر معاً اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "کیا تم دونوں اس سردی میں وہاں ہنی مون منا رہے ہو؟"

"جی نہیں بلکہ ہنی مون کے نتائج کا انتظار کر رہے ہیں۔" اُس نے تلخی سے جواباً ٹائپ کیا۔ "آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت ہو گی کہ ہمارا بچہ پہلے ہی ایک ہفتے کی تاخیر کر چکا ہے۔ اِس وقت مجھے اپنے ایک کام سے یہاں آنا تھا۔ میری بیوی گھر میں تنہا رہنے پر آمادہ نہیں تھی اس لیے میں مجبوراً اُسے بھی ساتھ لے آیا تھا۔ یہاں رُکنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ البتہ اب صورتِ حال پریشان کُن ہو گئی ہے۔ مجھے مجبوراً رُکنا پڑے گا۔"

مشین ایک منٹ تک خاموش رہی۔ اِس کے بعد ٹک ٹک کی مانوس آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ نک کاغذی ربن پہ چھپا ہوا پیغام پڑھ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے تم جہاز کی آمد سے پہلے پہلے اپنی بیوی کو شہر واپس پہنچا سکتے ہو۔ اِس حالت میں اُسے وہاں رکھنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ شہر صرف پندرہ میل دُور ہے۔ جاؤ، اُسے پہنچا آؤ لیکن جہاز آنے سے پہلے واپس آ جانا۔"

نک اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کافی کی ٹرے اُٹھائے ہوئے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اِس حالت میں کافی تیار کرنا واقعی محنت کا کام تھا لیکن ایسے کام صرف وہی بیویاں کر سکتی ہیں جنھیں اپنے شوہروں سے بے پناہ محبّت ہوتی ہے۔ نک جانتا تھا کہ لنڈا اُسے دل کی گہرائی سے چاہتی ہے اور اُس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ نک نے ایک دل کش مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا۔ "ہنی! میرا خیال ہے میں تمھیں گھر واپس پہنچا آؤں۔ جہاز ڈھائی گھنٹے سے پہلے یہاں نہیں پہنچے گا۔ اگر راستے میں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو میرا خیال ہے میں بروقت یہاں واپس آ جاؤں گا۔ اگر ہم نے یہ موقع گنوا دیا تو پھر شاید ہمیں یہاں سے جلدی جانا نصیب نہ ہو۔ اور کیا معلوم اس عرصے میں۔۔۔" اُس نے اضطراب میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

لنڈا خاموش رہی۔ نک سے پہلی ملاقات کے وقت وہ ایک فضائی کمپنی میں فضائی میزبان کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جہاز میں مسافروں کی خاطر تواضع کس طرح کی جاتی ہے اور کسی مصیبت میں گھرے ہوئے جہاز کے مسافروں کی حالت کیا ہوتی ہے اور ان حالات میں ایک فضائی میزبان کو مسافروں کا خوف و ہراس روکنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ہزاروں فٹ اُوپر کسی جگہ پچپن مسافر اور فضائی کمپنی کے پانچ ملازمین سخت جان لیوا خطرے سے دوچار تھے۔ دو فضائی میزبانیں بھی تھیں ممکن ہے اُن میں سے کوئی لنڈا کی شناسا بھی ہو۔ وہ مسافروں پر مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کرتے ہوئے انھیں خوف و ہراس سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں گی۔ جہاز کا عملہ اور مسافر سخت خطرے سے دوچار تھے۔ لنڈا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرائی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ زچگی کی علامات میں سے ابھی تک ایک بھی علامت ظاہر نہیں ہوئی ہے لہٰذا رُک جانے میں بہ ظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اُس نے نک سے کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ ہمیں واپسی کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے ڈارلنگ کہ اگر ہم یہاں سے چلے تو تم صحیح وقت پر واپس نہیں آ سکو گے۔ فرض کرو تم یہاں آنے میں کامیاب نہ ہوئے اور جہاز آ پہنچا تو کیا ہو گا؟ سڑک خراب ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ جانے کے لیے اور ڈیڑھ گھنٹہ واپسی کے لیے چاہیے۔ تم تین گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آ سکتے۔ پھر جہاز آدھے گھنٹے تک کیا کرے گا؟ ممکن ہے جہاز میں اتنا پٹرول نہ ہو یا ممکن ہے پائلٹ مایوس ہو کر کسی اور طرف نکل جائے۔ نہیں نک! میں اپنی زندگی کے لیے یا محض ایک بچّے کی پیدائش کی خاطر پوری باسٹھ انسانی جانیں قربان نہیں کر سکتی۔ ذرا سوچو ڈارلنگ کہ اُن لوگوں پہ کیا گزر رہی ہو گی۔" وہ مسکرانے لگی۔ اُس کی مسکراہٹ سے زندگی اور عزم کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ بہت اعتماد سے مسکرا رہی تھی۔ "فکر نہ کرو۔ اگر بچّے نے پیدا ہونے کے لیے بہت زیادہ ضد کی تو میں اسے سمجھا دوں گی کہ ابھی وہ کچھ دیر اور انتظار کرے۔ جو بچّہ ایک ہفتے کی تاخیر کر سکتا ہے وہ چند گھنٹوں کے لیے جلد بازی نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے ڈارلنگ!"

نک خاموشی سے اپنی جرأت مند بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد اُس کی اُنگلی از خود مشین پر حرکت کرنے لگی۔ "بہتر ہو گا کہ ہم واپسی کی کوشش نہ کریں۔" اُس نے ٹیلی ٹائپ مشین پہ پیغام بھیجا۔ "اگر آس پاس کوئی گھر ہوتا تو میں اپنی بیوی کو وہاں چھوڑ آتا۔ انسانیت کے نام پر کوئی بھی ہماری مدد کر سکتا تھا لیکن مصیبت یہ ہے کہ ائرپورٹ کے بعد پہلا گھر پندرہ میل دُور وہاں ہے جہاں سے شہر کی حد شروع ہوتی ہے۔ پندرہ میل کا لمبا سفر اختیار کر کے ہم پورے باسٹھ مسافروں کی زندگیوں سے نہیں کھیل سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" جلدی سے جواب ٹائپ کیا گیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم نے وہی فیصلہ کیا جو ان حالات میں تمھیں کرنا چاہیے تھا۔ تم واقعی ایک فرض شناس آدمی ہو۔"

نک نے کاغذی ربن کی تحریر پہ نظریں گاڑ دیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُس نے صحیح فیصلہ کیا ہے تو اُس کے دل پہ ایک بوجھ کیوں ہے؟ دل میں گرہیں پڑتی ہوئی کیوں محسوس ہو رہی ہیں؟

انتظار شروع ہو گیا۔ ابتدائی پانچ منٹ نک کو پانچ گھنٹے محسوس ہوئے۔ وقت اگر اسی رفتار سے گزرا تو میرا دم گھٹ جائے گا اُس نے سوچا۔ جب پندرہ منٹ گزر گئے تو اُس نے ایسا محسوس کیا جیسے پورا دن گزر گیا ہو۔ اس دوران میں

اُن دونوں کے درمیان بہت کم بات چیت ہوئی۔ وہ زیادہ تر خاموش رہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ عجیب احساسات میں ڈوبے ہوئے کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔ ٹیلی ٹائپ دوبارہ کام کرنے لگا: "نِک! کیا تم اس وقت بھی وہاں موجود ہو؟"

"ہاں اس وقت بھی یہیں ہوں۔" نِک نے جواب دیا۔

"اس اثنا میں تم غالباً اپنی بیوی کے متعلق سوچتے رہے ہو؟ تمھارے پاس فون نہیں ہے لیکن میرے پاس ہے۔ میں کال کر کے تمھارے مسئلے سے کسی کو مطلع کر سکتا ہوں۔ کیا تمھارے ذہن میں کوئی ایسا آدمی ہے جو شہر سے تمھاری بیوی کو لینے پہنچ سکتا ہو؟ کسی پڑوسی یا کسی دوست یا کسی عزیز کا نمبر یاد ہو تو بتاؤ۔"

نِک نے مشین سے کاغذ کا ربن توڑا اور لِنڈا کی طرف بڑھا دیا۔ لِنڈا کی نگاہ ایک لمحے تک پیغام پہ جمی رہی پھر اُس نے نِک سے کہا کہ "یہ ایک تکلیف دہ کام ہے لیکن اس طرح ہمیں تحفظ ضرور حاصل ہو سکتا ہے۔ اپنا ہمسایہ اوبیرن ایک شریف اور مخلص آدمی ہے۔ وہ کال سن کر یقیناً ہماری مدد کے لیے یہاں پہنچ سکتا ہے۔"

لِنڈا کے ذہن میں دوسرے پڑوسیوں کا خیال بھی آیا لیکن اُن کے بارے میں اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس موسم میں گھر سے نکلنا پسند کریں گے۔ لِنڈا کی خواہش کے مطابق نِک نے ٹیلی ٹائپ پر یہ پیغام بھیجا کہ اُس کے پڑوسی اوبیرن کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا جائے۔ پیغام دینے کے بعد وہ کرسی سے اٹھا اور چند لمحوں تک خاموش مشین گھورتا رہا پھر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ باہر گہری تاریکی تھی اور توقع کے خلاف ہوا برائے نام چل رہی تھی۔ رن وے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ اُس کا وہم تو نہیں ہے؟ یا یہ حقیقت ہے؟ اُس نے کنکھیوں سے لِنڈا کی طرف دیکھا۔ وہ کسی دوسری طرف متوجہ تھی۔ دفعتہً نِک نے محسوس کیا کہ اُس کی بیوی نے درد کی ایک ساختہ ٹیس برداشت کرنے کے لیے آنکھیں جھپکائی ہیں۔ نِک نے ایک گہری سانس لی۔



اِٹیل کے ہوائی اڈے پر جیک ٹیلی ٹائپ مشین کے سامنے سے اُٹھا۔ اُس نے ایک طویل انگڑائی لے کر تنے ہوئے اعصاب پُرسکون بنانے کی کوشش کی پھر اپنے عملے کے لوگوں سے چند باتیں کیں۔ وہ لوگ اُس کے گرد کھڑے تھے۔ سب کے چہروں پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُس نے مشین سے کاغذی ربن کھینچا اور قینچی سے کاٹ کر نِک کا پیغام اُن کی طرف بڑھا دیا۔ چند لمحوں بعد کسی نے فون کا ریسیور اُٹھایا اور آپریٹر سے طویل فاصلے کی لائن مانگی۔ اسی لمحے ٹیلی ٹائپ مشین کی ٹِک ٹِک دوبارہ شروع ہو گئی۔ جیک جلدی سے بیٹھ گیا۔ "پرواز ۲۷ کا جہاز اینٹی ہوائی مستقر کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔" اینٹی آئی لینڈ سے پیغام آیا۔

"کیا اُس کے اُترنے کی کوئی صورت ہے؟" کسی دوسرے اسٹیشن نے مداخلت کی۔ غالباً یہ تشویش ناک سوال ایکرویج اسٹیشن سے کیا گیا تھا۔

"ہمیں تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔" اینٹی ہوائی مستقر سے جواب دیا گیا۔

جیک کی نگاہ کاغذ کے فیتے پہ جمی ہوئی تھی۔ وہ ٹائپ ہونے والا ہر پیغام بہت غور سے پڑھ رہا تھا۔

"کول شوائنز کے ہوائی مستقر سے نِک مخاطب ہے۔" مشین نے ٹائپ کیا۔ "مسٹر اوبیرن کو فون کرنے کے بجائے یہ بہتر ہو گا کہ ایمبولینس کے لیے اسپتال کال کرو۔ میری بیوی کچھ ہلچل محسوس کرنے لگی ہے۔" جیک فوراً کمرے کے دوسرے حصے کی طرف متوجہ ہو کر چیخا "اسپتال فون کرو۔ جلدی کرو۔ کہیں نِک اپنی بیوی کی حالت دیکھ کر حواس باختہ نہ ہو جائے اور اُسے لے جانے کے لیے ہوائی اڈا چھوڑنے کا ارادہ نہ کر لے۔ جلدی کرو بہت جلدی۔" وہ بُری طرح چیخ رہا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "اوہ اگر نِک اپنی بیوی کو لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا تو اُن باسٹھ انسانوں کا کیا ہو گا جو اب صرف اور صرف نِک کے رحم و کرم پہ ہیں۔" اچانک اُسے احساس ہوا کہ اُس نے یہ خیالات ظاہر کر کے اچھا نہیں کیا ہے کیونکہ نِک ہوائی مستقر کا ایک وقتی وارفتہ ہے کسی کیاری ویاری کا منتظم نہیں ہے کہ اُس سے بے پروائی کی توقع کی جائے۔ ایک طرف لاکھوں ڈالر کا جہاز اور باسٹھ انسانی جانیں تھیں اور دوسری طرف ایک بچے کی پیدائش کا عمل تھا۔ جیک ایک طویل سانس لے کے رہ گیا۔ مشین تیزی سے چلنے لگی۔ ٹِک ٹِک ٹِک۔ جیک کو ٹائپ کی آوازیں ہتھوڑے کی چوٹیں محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کاغذی فیتے پہ جھک گیا۔ اینٹی ہوائی مستقر سے یہ ہوش اُڑا دینے والی اطلاع دی گئی کہ جہاز کی پہلی کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ برف باری اتنی شدید ہے کہ وہ یہاں اُتر ہی نہیں سکتا اور پائلٹ غالباً اِس صورتِ حال سے مایوس ہو چکا ہے یہ بھی بتایا گیا۔ "اب جہاز کا رُخ کول شوائنز کے عارضی مستقر کی طرف ہے کیونکہ پائلٹ نے ہم سے رابطہ قائم کیا تھا لیکن افسوس ہم اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکے۔ پائلٹ کا اندازہ ہے کہ جہاز دو گھنٹے بعد کول شوائنز کے اڈے پر پرواز کر رہا ہو گا۔ اِٹیل اسٹیشن! جلدی کچھ کرو۔ بہت جلدی۔"

جیک کی سانس پھول گئی۔ اب جہاز اور اُس کے مسافر یقیناً صرف نِک کے رحم و کرم پر تھے۔ جیک نے اُس آدمی کی طرف دیکھا جس نے فون پہ کول شوائنز کے اسپتال سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی جیک نے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ وہ آدمی بہت مایوس دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے گہری فکرمندی ظاہر ہو رہی تھی۔ جیک نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ اُس کا چہرہ ہی حقیقت کا آئینہ دار تھا۔ جیک مشین پر ٹائپ کرنے لگا۔ وہ نِک کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس خبر سے اُس کی کیا حالت ہو گی۔

"ایکرویج!" اُس نے جلدی جلدی ٹائپ کیا۔ "اپنے اسٹیشن سے کول شوائنز کے کسی اسپتال کو فون کرنے کی کوشش کرو۔ ہم نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آپریٹر کا کہنا ہے کہ طوفان شروع ہوتے ہی طویل فاصلے کے باعث

بل شوائٹز سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ ٹیلی گرام کا سلسلہ بھی ممکن نہیں رہا۔"

جیک کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے جیب ٹٹول کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا پھر ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبائی مگر دوسرے ہی لمحے اُسے فرش پر پھینک کے مسل دیا۔ لمحے گھنٹوں کی طرح طویل ہوگئے تھے۔ وقت اٹک گیا تھا، گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اُس کی نگاہ مشین پر جم گئی۔ اینکریج سے پیغام آرہا تھا: "اسٹیل! حالات ساتھ نہیں دے رہے ہیں، بل شوائٹز سے رابطہ قائم کرنے میں ہمیں بھی کامیابی نہیں ہوسکی۔ افسوس" ٹائپسٹ نے تفصیلات یہ بتائیں کہ الاسکا کے بیشتر شہر طوفان کے باعث ایک دوسرے سے کٹ چکے ہیں۔ غالباً تین یا چار شہروں کے درمیان صرف ٹیلی ٹائپ مشین پر رابطہ قائم ہوسکتا ہے۔ اس بات پر جیک کے علاوہ اینکریج کے آپریٹر کو بھی حیرت تھی کہ ائرلائن کی مشینیں کیسے کام کر رہی ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ رابطے کا یہ ذریعہ بھی کسی وقت دھوکا دے سکتا ہے۔

"بل شوائٹز!" جیک نے نِک سے رابطہ قائم کرنے کے لیے ٹائپ کیا۔ "کیا تم اس وقت بھی ہوائی مستقر پر موجود ہو؟"

"آپ یہ سوال ایک بار پہلے بھی کر چکے ہیں۔" نِک کی طرف سے جواب ملا۔ "آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

جیک چاہتا تھا کہ نِک سے اُس کی بیوی کے متعلق گفتگو کرنے لگے کیونکہ اس طرح نِک کے خوف میں بڑی حد تک کمی ہوسکتی تھی۔ اُس نے سوال ٹائپ کیا۔ "تمھاری بیوی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ہر دس منٹ بعد کچھ ہلچل محسوس کر رہی ہے۔" جواب آیا۔

"یہ کوئی پریشان کن حالت نہیں ہے۔" کسی دوسرے اسٹیشن کے آپریٹر نے مداخلت کی۔ "میری بیوی بچے کی پیدائش سے چھ گھنٹے پہلے ہی اس حالت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ بچہ پورے چھ گھنٹے بعد پیدا ہوا تھا۔"

نِک کی طرف سے اس دلاسے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا۔ جیک ایک بار پھر کھڑا ہوگیا۔ اُس کی مٹھیاں سختی سے بھنچی ہوئی تھیں اور فکر و تردد سے اُس کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا تھا۔ خوف نے اُس کا چہرہ بگاڑ دیا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور کوئی دوسری صورت سوچنے کی کوشش کرنے لگا مگر خاصی مغز پاشی کے باوجود کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔ اُس کے ذہن میں بار بار بس ایک ہی تصویر اُبھر رہی تھی۔ ایک جہاز کی تصویر جو بادلوں کے اُوپر فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ اس کے بعد اُس کے ذہن میں دوسری تصویر اُبھری۔ ایک مرد اور ایک عورت کی تصویر جن کے پاس ہوائی اڈا چھوڑنے کی معقول ترین وجہ موجود تھی۔ وہ اس جواز سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے اور اُس بدنصیب جہاز کے پاس اُس ہوائی اڈے کے سوا پورے روئے زمین پر کوئی محفوظ مقام نہیں تھا۔ اُس نے سوچا، تباہی غالباً جہاز کا مقدر بن چکی ہے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا موسم کو کوسنے لگا۔ وہ ان دونوں نازک معاملات پر غور کرتے کرتے تھک چکا تھا۔

ماحول یخ بستہ تھا پھر بھی نِک کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ عام حالات میں اس موقع پر اُسے اپنا خون رگوں میں منجمد محسوس ہوتا لیکن اس وقت وہ لِنڈا کی تکلیف کے سوا ہر احساس سے بے نیاز ہوچکا تھا۔ اب صورتِ حال اُس کے لیے شک آمیز نہیں رہی تھی۔ اُس کی بیوی نے جو کیفیت محسوس کی تھی وہ ایک تنبیہ، ایک دھمکی کے برابر تھی بلکہ محض تنبیہ محض دھمکی نہیں تھی عملی طور پر کچھ ہونے والا تھا یعنی اسقاط کا خطرہ تھا۔ نِک اس صورتِ حال سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔ اسقاط کے ہر موقع پر اُسے لِنڈا کی زندگی خطرے میں نظر آئی تھی۔ ہر بار اُس کی صحت بری طرح گر جاتی تھی اور وہ بالکل موت کے دہانے پر پہنچ جاتی تھی۔ شب و روز کی تدبیروں اور دواؤں کے بعد اس مرتبہ اُن کی مُراد بر آئی تھی مگر آج پھر لِنڈا کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی اور نِک کو حالات نے فرض کے بندھن میں جکڑ کے بے بس کر رکھا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا کہ لِنڈا اس بار کہیں واقعی اُس سے بہت دُور نہ ہوجائے۔ یہ خیال اُسے بار بار آرہا تھا، وہ سر سے پاؤں تک کانپ کانپ جاتا تھا۔

اُس نے دُھندلی دُھندلی نظروں سے لِنڈا کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ڈیسک پر بیٹھی ہوئی اُسی کی طرف متوجہ تھی اور اُسے اطمینان دلانے کے لیے اپنے درد پر قابو پاتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ نِک نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کے ایک سگریٹ سلگائی اُسی وقت اُس کی نگاہ ایک دوسری سگریٹ پر پڑی۔ دوسری سگریٹ ایش ٹرے میں سُلگ رہی تھی۔ وہ اُسے بھول ہی گیا تھا۔

"بہت سگریٹ پیے جا رہے ہیں۔" لِنڈا نے لہجہ مزاحیہ بنانے کی کوشش کی پھر قدرے متانت سے کہا۔ "فکر نہ کرو ڈارلنگ! تمھارے بچے نے نو ماہ اور ایک ہفتے تک ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب اگر چند گھنٹوں کی مزید تاخیر ہوگئی تو وہ بالکل بُرا نہیں مانے گا۔" نِک نے منہ دوسری طرف کرلیا اور دیوار گھڑی دیکھی۔ لِنڈا نے آخری درد نو منٹ پہلے محسوس کیا تھا۔ یکایک نِک کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ چونک کے مشین کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"بل شوائٹز کا سرکٹ نصف گھنٹے کے لیے ختم ہو رہا ہے۔" نِک نے پیغام ٹائپ کیا۔ "میں رن وے کا ہر میلر بلب منقطع کرنے جا رہا ہوں ممکن ہے اس طرح جنریٹر کی بیٹری پاور کچھ وقت کے لیے بڑھ جائے۔ پھر جب میں رن وے کی بتیاں جہاز کے لیے روشن کروں گا تو پندرہ منٹ کے بجائے بیس منٹ تک روشنی ممکن ہوجائے گی۔"

لِنڈا اُس کے پیچھے آکے کھڑی ہوگئی۔ اُس نے پیغام پڑھ کے اطمینان سے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے ڈارلنگ! تمھیں یہ خیال بہت اچھا اور بروقت آیا۔ میں بھی اس کام میں تمھاری مدد کروں گی۔" اُس نے کہا۔ "جب تم ہر میلر بلب منقطع کروگے تو میں ٹارچ سے تمھیں روشنی دکھاتی رہوں گی۔" نِک نے احتجاج کیا مگر لِنڈا نے کہا۔ "میں تمھاری مدد کرنا چاہتی ہوں

ڈارلنگ! انتظار نے مجھے نیم مُردہ کردیا ہے۔ اس حالت میں محض بیٹھے رہنا بھی تو تکلیف دہ ہے۔ جو کچھ ہونا ہے اُسے کوئی نہیں ٹال سکتا لہٰذا یہ خیال ذہن سے نکال دو اور صرف یہ پیشِ نظر رکھو کہ ہمیں باسٹھ آدمیوں کی جانیں بچانی ہیں۔" نِک نے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں خاموشی سے کوٹ پہننے لگے۔

باہر اندھیرا تھا۔ سردی شدید تھی۔ سانس لینے سے حلق اور دل پر بھی خنکی کا اثر ہو رہا تھا۔ نِک ہر تیسرے بلب کے پاس جا جا کر اُس کا سلسلہ ختم کرنے لگا۔ لِنڈا اُسے مسلسل روشنی دکھا رہی تھی۔ اس دوران میں انھوں نے ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ خاموشی سے کام کرتے رہے۔ نِک ابھی آخری بلب سے پہلے والے بلب کے قریب پہنچا تھا کہ اپنے عقب میں اُسے ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ بلب اُس کے ہاتھ سے فرش پر گر کے چکنا چور ہوگیا۔

لِنڈا رن وے پر گر گئی تھی۔ اُس کی ٹانگیں دُہری ہو کر بدن کے نیچے دب گئی تھیں۔ وہ انسانی اعضا کا ایک ڈھیر معلوم ہونے لگی۔ روشن ٹارچ اُس سے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ نِک دیوانگی سے چیخ پڑا اور لپک کے اُس کے قریب پہنچا۔ وہ گھٹنوں کے بل لِنڈا کے قریب گر سا گیا۔ لِنڈا کا چہرہ پسینے میں تر بتر ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اٹک اٹک کر گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اِس کے باوجود اُس نے دقّت سے کہا: "نِک! نہیں ڈارلنگ! ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ ہمیں باسٹھ انسان بچانے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے نِک! وعدہ کرو......"

نِک نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اُٹھا لیا۔ اُس کے ہاتھوں پہ دو جانوں کا بوجھ تھا۔ ایک جان جنم لینے والی تھی، دوسری زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھی۔ حالات نے اُسے عجیب امتحان میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ لِنڈا کو اُٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ ہوائی مستقر کی عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ بچہ پیدا ہونے میں غالباً بہت تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔



جیک بے تابی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اُس کی نگاہ بار بار مشین کی طرف اُٹھ رہی تھی۔ مشین نصف گھنٹے سے خاموش تھی۔ اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے سے اضطراب جھلکنے لگا۔ نصف گھنٹہ اور دس منٹ ہو گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نِک اپنی بیوی کو لے کر ہوائی مستقر سے چلا تو نہیں گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بچے کی پیدائش کا مرحلہ سر پر آ گیا ہو اور نِک اپنی بیوی کو سنبھالنے میں مصروف ہو۔ آخر بل شوائلز میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔ پھر اچانک مشین کام کرنے لگی۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب پہنچا۔ نِک پیغام بھیج رہا تھا: "میں ائرپورٹ سے جا رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی بیوی کو اسپتال پہنچائے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" اُس نے اس حادثے کا تفصیل سے تذکرہ کیا کہ لِنڈا کس طرح رن وے پر گر گئی تھی اور گرنے سے بچے کی پیدائش کا مرحلہ کس حد تک قریب آ گیا ہے۔ یہ وضاحت کرتے وقت اُس نے شرم و حیا قطعاً نظر انداز کر کے مکمل صورتِ حال بیان کر دی۔

"تم نہیں جا سکتے۔" جیک نے ٹائپ کیا اور پوری قوت سے مشین کی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ "تم نہیں جا سکتے نِک! یہ باسٹھ جانوں کا سوال ہے۔ اگر تم چلے گئے تو ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اُن کا خون تمھاری گردن پہ ہوگا۔"

"خون؟ اگر میں یہاں ٹھیرا رہا، خون تب بھی میری گردن پہ ہوگا۔ خون خون ہے جناب! چاہے وہ ایک کا ہو یا باسٹھ کا۔"

جیک کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پیچھے سے کسی نے کہا: "اگر نِک کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ اُسے الزام نہیں دیا جا سکتا۔"

جیک کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ وہ تڑپ کر اُس آدمی کی طرف گھوما جو نِک کی حمایت میں بول رہا تھا۔ "مجھے بتاؤ۔" وہ چیخا۔ "تم میں سے کون ہے جو نِک کو اچھی طرح جانتا ہے۔" اُس نے اپنے آدمیوں سے سوال کیا۔ "بتاؤ۔ اُسے دُنیا میں سب سے زیادہ کیا چیز عزیز ہے؟ کیا اُسے دولت کا لالچ دیا جا سکتا ہے؟ بتاؤ، جلدی بتاؤ۔ وہ دنیا میں سب سے زیادہ کیا چیز پسند کرتا ہے؟ اُسے کس چیز کی خواہش ہے؟"

"ایک بچے کی۔" کسی نے کہا۔ "لِنڈا کے سوا اُسے دُنیا کی کوئی چیز عزیز نہیں ہے جناب! وہ محبت کے معاملے میں دیوانہ ہے۔"

جیک نے اپنے بال نوچ لیے پھر جھپٹ کر طیارے کے مسافروں کی فہرست اُٹھائی۔ اُس نے فہرست پر جلدی جلدی نگاہ دوڑانے کے بعد ٹائپ کیا: "نِک! اس جہاز میں تین معصوم بچے بھی سوار ہیں۔ کیا تم انھیں بھی قتل کر دینا چاہتے ہو؟"

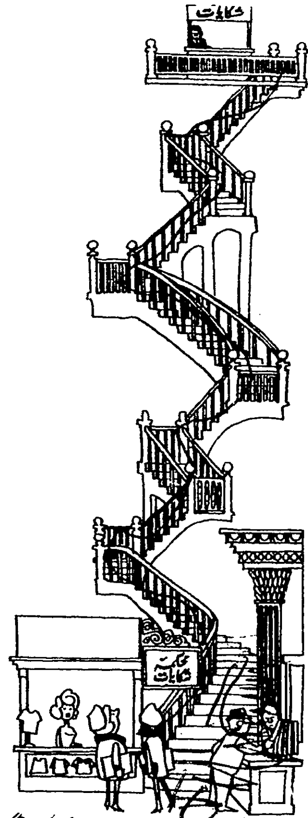
دوسری جانب سے خاموشی رہی۔ جیک کا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ کہیں نِک چلا تو نہیں گیا؟ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اُس نے سوچا پھر دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔

"ٹھیک ہے مسٹر جیک! ہم ٹھیریں گے۔" مشین نے نِک کا پیغام ٹائپ کیا۔ جیک کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھٹ گئیں۔

"شکریہ نِک! بہت بہت شکریہ۔ تم ایک عظیم انسان ہو نِک!" اُس نے ٹائپ کیا۔

"میرا شکریہ ادا نہ کیجیے۔ دراصل میری بیوی لِنڈا یہاں سے جانے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اس صورت میں اگر آپ میرا شکریہ ادا کریں گے تو مجھے یہ احساس ہوگا کہ میں اپنا ارادہ بدل بھی سکتا ہوں۔"

نِک اپنی بیوی کے پاس واپس پہنچا۔ اُس نے اُسے انتظار گاہ کے نرم



ج پر لٹا دیا تھا۔ لِنڈا کی حالت انتہائی قابلِ رحم تھی۔ اُس کی ٹانگیں تکلیف ٖ زیادتی سے شل ہو گئی تھیں لیکن ٹانگوں کی تکلیف اصل تکلیف کے مقابلے ں نہ ہونے کے برابر تھی۔ لِنڈا ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے دیوانہ وار بدوجہد کر رہی تھی۔

نِک نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے ڈا کو بہت سکون ملا۔ اُس کے زرد چہرے پہ رونق نظر آنے لگی اور ہونٹوں پر ہسا سوگوار مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "فکر نہ کرو ڈارلنگ! اب میں بالکل ٹھیک ہوں ں نے تم سے کہا تھا نا کہ تمہارا بچہ بہت صابر ہے۔ سمجھ لو وہ موقع کی نزاکت ہچان چکا ہے۔ جاؤ تم دل جمعی سے اپنا کام کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

بیوی کی جرأت مندانہ باتوں سے اُس کا دل بھر آیا لیکن ان باتوں نے سے حوصلہ بھی دیا۔ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اُٹھ کے مشین کے پاس پہنچا۔ کوئی بیغام نہیں تھا۔ وہ تیزی سے کارگو کے کمرے میں گیا۔ اُس کے برابر والے کمرے بں جنریٹر تھے۔ اُس نے جنریٹر فوری استعمال کے قابل بنانے کے لیے ابتدائی تیاری شروع کر دی اور ایک لمحے کے لیے سے چلا کر اطمینان کر لیا کہ وہ وقت پر دھوکا نہیں دے گا۔ اس کے بعد نِک دوبارہ مواصلات کے کمرے میں آ گیا۔ مشین کام کر رہی تھی۔ جیک یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ وہاں موجود ہے یا نہیں۔ اُس نے جواباً ٹائپ کیا کہ وہ جہاز کی آمد تک ہر صورت میں وہیں رہنے کا تہیہ کر چکا ہے لہٰذا جیک کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ جہاز آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ اُس کے کانوں سے لِنڈا کی کراہیں ٹکرائیں۔ وہ بے چین ہو کے رُک گیا۔ لیکن پھر جبر کر کے کمرے سے نکل گیا۔ اُس نے ٹارچ روشن کر کے رن وے پر رکھ دی۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش ایسی چند بیٹریاں اور ہوتیں تو مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا تھا۔ اُس کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ کاش جہاز خیریت سے اُتر آئے۔

دفعتاً جہاز کی گرج سنائی دی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے اُوپر دیکھا۔ پائلٹ نے روشنیاں جلائی تھیں۔ ہوا ایک تیز ہو رہی تھی۔ وہ جنریٹر روم کی طرف بھاگا۔ اُس نے جنریٹر چلا دیا۔ رن وے روشنی سے نہا گیا۔ نِک مواصلات کے کمرے میں واپس آیا۔ اُس نے جیک کو اطلاع دی کہ جہاز مستقر کے اُوپر پرواز کر رہا ہے۔ جہاز نے ایک طویل چکر لگایا۔ پھر پہاڑ کی چوٹی سے قریب تر نظر آیا۔ برابر کے کمرے میں لِنڈا کی کراہیں بھی تیز ہو گئی تھیں۔ نِک نے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیا۔ جہاز اُترنے کی حالت میں آ چکا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ رن وے کی طرف غوطہ زن ہوا، لِنڈا کی ایک طویل چیخ سنائی دی پھر شاید خاموشی چھا گئی تھی یا جہاز کی گرج نے لِنڈا کی آوازیں دبا دی تھیں۔ نِک کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ مشین کے کی بورڈ پر سر ٹکا کے بیٹھ گیا اور اُسے گردوپیش کی کوئی خبر نہ رہی۔

ایک نرم ہاتھ اُس کے بالوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے بالوں میں کسی کی اُنگلیاں محسوس کر کے آنکھیں کھولیں۔ اُسے ایک خوب صورت فضائی میزبان دکھائی دی۔ اُس کے ہونٹوں پہ دل فریب مسکراہٹ جھوم رہی تھی۔ میں اُس نے کہا۔ نِک ہوش میں آ گیا اور اُسے کئی آدمیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ "مبارک ہو مسٹر نِک! آپ ایک خوب صورت بچے کے باپ بن گئے ہیں مگر عورت کہہ رہی تھی۔ "جب ہم اندر پہنچے تو آپ کی بیگم پیدائش کے عمل سے گزر رہی تھیں۔ میری ساتھی مس مین فضائی کمپنی میں آنے سے پہلے نرسنگ کا کورس......"

نِک کی نگاہ تین مسافر بچوں پر جمی ہوئی تھی۔ بچے حیرت سے اُس کی مشین دیکھ رہے تھے۔ مشین دھڑا دھڑ ٹائپ کر رہی تھی لیکن نِک کے پاس پیغامات پڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اُس نے بڑھ کر تینوں بچوں کو لپٹا لیا اور اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے، خوشی کے آنسو۔ اُس کے کانوں میں ایک نوزائیدہ بچے کا رونا بھی موسیقی گھول رہا تھا۔